عنقائے معانی (جلد اول)

شرح اردو دیوانِ غالبؔ

شارح : شیر علی سرخوش

مطبوعہ انقلاب سٹیم پریس، بیرون موری دروازہ، لاہور

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

مجھے راہ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مندرجہ ذیل چند شعر مرزا غالب کی ابتدائی مشق کے نمونے ہیں۔ ؎

بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیٔ خوباں
خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا

ولہ

رکھا غفلت نے دور افتادہ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

ولہ

پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش
خیالِ شوخیٔ خوباں کو راحت آفریں پایا

لیکن اسدؔ کے تخلص سے مرزا نے جتنی غزلیں ابتدا کہی ہیں۔ وہ سب اسی قبیل کی ہیں۔ بلکہ بعض تو ان اوپر والے نمونوں سے بھی گئی گزری ہیں۔ جو دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ میں شامل ہیں۔

اگر غالب کے کلام کو باعتبار فصاحت و بلاغت تقسیم کیا جائے۔ تو اسکے تین حصے بآسانی کئے جا سکتے ہیں۔

اول۔ اول وہ اشعار کہ جن کی بنا شعرائے فارس کی نازک خیالیوں اور دقیقہ سنجیوں پر رکھی گئی ہے۔ اور ایسی غزلیں عموماً اسدؔ کے تخلص سے متمیز کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ؎

اے اسدؔ جفا سائل نے غمِ جنوں مائل
تجھ کو جس قدر ڈھونڈا الفت آزما پایا

ان غزلوں کے اکثر شعر اُس وقت قلمزن کر دئے گئے تھے۔ جب کہ موجودہ رائج الوقت دیوانِ غالب مرتب ہوا تھا۔

دوئم۔ وہ اشعار کہ جو باوجود دقیق اور مشکل ہونے کے فارسی شعرا کی نازک خیالیوں کا حق اردو ریختہ میں پورا پورا ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ؎

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی
برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

ولہ

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا
فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دل پسند آیا

ولہ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

سوئم۔ وہ آسان۔ صاف اور سلیس غزلیں کہ جن کے اشعار گویا سہل ممتنع واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً ؎

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ولہ

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

علمی معرکے۔ ایک مرتبہ مرزا نے برہانِ قاطع پر کچھ اعتراضات کئے تھے۔ جنکو

قاطع برہان کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ اس پر ایک زبردست بحث بعض محققین فارسی اور مرزا کے درمیان چھڑ گئی تھی۔ اگرچہ مرزا کے اعتراضات قریباً تمام صحیح تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے۔ کہ جن پر کما حقہ غور نہ ہو سکا۔ اور ان کو واپس لینا پڑا۔ تاہم اسوقت مرزا کے کمال فن کی ہر جگہ تعریف کی گئی تھی۔ اور وہ خود بھی اپنی فارسی دانی پر فخر و ناز کیا کرتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اُنکے وہ کارنامے جو اردو نظم و نثر میں ہیں۔ وہی زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ اور انکے فارسی اشعار و قصائد بہت کم پڑھے جاتے ہیں۔

اخلاق و عادات وغیرہ

مرزا کے خاندانی ہونے میں کچھ شک و شبہ نہیں ہے۔ لہذا وہ حسن اخلاق میں شرفائے دہلی کا ایک پورا نمونہ تھے وہ دوستوں سے کشادہ پیشانی ملا کرتے تھے۔ اور بچوں تک سے بھی ہنسی دل لگی کرنے میں نہیں چوکتے تھے مگر انکی طبیعت اکثر آزاد۔ اور مذہبی قیود کے بالکل منافی واقع ہوئی تھی۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو موحد کیش اور صوفی مشرب بتایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تمام خاص خاص حالات اور واقعات پر اپنی تصنیفات ہی میں بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ اُردوئے معلے۔ عود ہندی۔ اور بعض فارسی نثروں میں انکی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی ایسی باتیں بکثرت موجود ہیں۔ کہ جنکو ترتیب دیکر ایک صاحب قلم نے نکات غالب کے نام سے انکی ایک مختصر سی سوانح عمری مرتب کر دی ہے۔ تاہم یادگار غالب میں شرح و بسط کے ساتھ مرزا کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔

عام اخلاق

مرزا غالب بہت فراخ حوصلہ۔ خوددار اور حق پسند طبیعت رکھتے تھے۔ انکی فراخ حوصلگی اس واقعہ سے ظاہر ہے۔ کہ جب غدر کے بعد انکی آمدنی بالکل محدود ہو گئی۔ تو اس حالت میں بھی اپنے دوستوں۔ عزیزوں اور نوکروں وغیرہ سے اچھا سلوک کرتے رہے۔ وہ خوددار تھے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے انکو عربک کالج دہلی کا پروفیسر بنانا چاہا۔ تو آپنے چالیس پچاس روپیہ جیسی حقیر رقم پر ملازم ہونا

قبول نہ کیا۔ حالانکہ صہبائی نے اسی تنخواہ پر ملازمت سرکار قبول کر لی۔ (دیکھو طبقات شعرائے ہند مولفہ مولوی کریم الدین مرحوم) مرزا ہمیشہ بالکی یا ہوادار میں بیٹھکر بازار آیا جایا کرتے تھے۔ اور امرا و شرفائے دہلی سے ہمیشہ مساوات کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ وہ اسقدر حق پسند تھے کہ ایک شخص اُنکے کلام کو بہت اچھی طرح سمجھا کرتا تھا۔ وہ جب ان سے ملتا تھا تو نہایت اشتیاق کے ساتھ اس سے بغلگیر ہوتے۔ اور اس کی خاطر و تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہونے دیتے تھے۔ ویسے بھی انکے کلام پر کوئی شخص معترض ہوتا۔ تو الانسان مرکب من الخطاء والنسیان۔ اگر معترض حق بجانب ہوتا۔ تو اسکی بات فوراً قبول کر لیا کرتے تھے۔ زمانہ موجودہ میں غالب کی شاعری۔ انکی سوانحعمری اور انکے عام حالات پر اسقدر لکھا جا چکا ہے۔ کہ اب ان باتوں کا زیادہ اعادہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ سطور ذیل میں ہم انکی تمام تصنیفات کا کچھ حال قلمبند کرتے ہیں۔

۱ - کلیات غالب فارسی۔ یہ مطبع نولکشور سے طبع ہو کر عموماً ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اس میں غالب کی فارسی غزلیں۔ قصیدے۔ مثنویاں۔ قطعے اور رباعیات وغیرہ درج ہیں۔ کچھ فارسی نثر بھی اس میں شامل ہے۔

۲ - اُردو دیوان غالب۔ اس کا ایک مکمل نسخہ نسخہ حمیدیہ دیوان غالب کے نام سے معہ مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بجنوری مرحوم بہ وساطت مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم۔ اے ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال طبع ہو چکا ہے۔ اس میں وہ کلام بھی موجود ہے۔ جو کہ رائج الوقت دیوان غالب کی ترتیب کے وقت مسترد کر دیا گیا تھا۔

۳ - عود ہندی۔ اس میں شعر و شاعری کے متعلق بعض دوستوں نے مرزا صاحب سے جو استفسار کیا ہے۔ وہ معہ جوابات درج ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی متعدد معلومات درج ہیں۔ یہ کتاب ایک مجموعہ خطوط ہے۔

۴ - اُردوئے معلے۔ ۱۲۸۵ھ میں طبع ہوئی تھی۔ یہ اردو نثر کی بہترین کتابوں

میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک مجموعہ خطوط ہے۔ غالب کی اکثر سوانح زندگی اس میں موجود ہیں۔

۵۔ قاطع برہان۔ تیغ تیز۔ نامہ غالب۔ درفش کاویانی۔ لطائف غیبی۔ ساطع برہان وغیرہ یہ سب کتابیں لغت برہان قاطع کی بحث کے متعلق اردو اور فارسی زبانوں میں لکھی گئی تھیں۔ مثلاً لطایف غیبی اُردو زبان میں ہے۔

۶۔ پنج فرہنگ۔ فارسی انشا پردازی کے متعلق ایک اچھی کتاب ہے۔ اسی طرح دستنبو ایک ایسی تصنیف ہے۔ کہ جس میں صرف فارسی زبان کے فقرات لکھے ہیں جن میں غدر کا حال ہے۔ سبد چین۔ دو تین قطعے۔ چند قصیدے اور کچھ خطوط فارسی کے اس میں درج ہیں۔

۷۔ تاریخ مہر نیم روز۔ اس میں امیر تیمور سے لیکر ہمایوں تک کے مغل بادشاہوں کے حالات مرتب کئے گئے ہیں۔

۸۔ قادر نامہ غالب۔ یہ کتاب امیر خسرو کی خالق باری کے طور پر طلبائے مکتب کیلئے لکھی ہے۔ اس میں چند اردو غزلیں بھی درج ہیں۔

۹۔ ایک رسالہ اُردو فارسی گرامر کا بھی مرزا نے اپنے مہربان دوست پنڈت پیارے لال صاحب کی فرمائش پر طبع کرایا تھا۔ جو کچھ دنوں پرائمری سکولوں میں پڑھایا بھی گیا تھا۔ مگر زیادہ شہرت اور رواج نہ پا سکا۔

وفات مرزا نے ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ انکی نرینہ اولاد کئی بیٹے پیدا ہوئے تھے جو کہ یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ مرزا کی قبر دلی میں تاحال موجود ہے انکی وفات پر کئی شعراء نے مرثئے لکھے۔ لیکن مولانا حالی کا اُردو مرثیہ غالب بہت موثر تسلیم کیا گیا ہے۔ مرزا کی تاریخ وفات اس مصرعے سے پائی جاتی ہے ؎

آہ غالب بمرد

کلامِ غالب اور اسکی مختلف شرحیں

جس طرح کوئی علم وفن ابتداہی سے جبکہ وہ ایجاد و مدون کیا گیا ہو مکمل نہیں ہوتا۔ بلکہ بتدریج درجہ تکمیل حاصل کرتا ہے۔ ادب اردو میں یہی حال دیوان غالب اور اس کی شرح کا ہے۔ کہ مرزا نے اوّل اوّل بیدل کی تقلید میں برسوں مشق کی اور اسقدر مشکل شعر لکھے۔ کہ اردو زبان ان بعید نازک اور غریب ترین خیالات اور تمثیلات وغیرہ کی متحمل نہ ہوسکی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اسی ابتدائی غزلوں کو جو کہ بہ تخلص اسد تصنیف کی تھیں۔ مابعد اختصار کرنا پڑا۔ اور پھر کچھ اور زیادہ مشق کی بدولت ایسی طرز اختیار کی۔ کہ جس میں علم عروض و قواعد فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے تو کچھ نقص نہیں پایا جاتا تھا۔ تاہم غالب کا یہ کلام بھی جو ابتدائی کلام سے بدرجہا بہتر اور ظہوری و جلال اسیر و بیدل وغیرہ کی روش کے بالکل مطابق تھا۔ اساتذہ اردو کے کلام سے حد درجہ مختلف تھا۔ لہذا اس پر کچھ اکتفا کرکے اس کی وہ تیسری طرز جو اخیری تھی اختیار کی یہی مرزا کا بہترین کلام ہے جو کہ کامل پچیس تیس برس کی مسلسل محنت کا ثمرہ ہے

پس جس طرح اس کا کلام بتدریج مکمل ہوا اسی طرح اس کلام کی شرح بھی کئی شارحین کی متواتر کوششوں کے بعد اب کچھ تکمیل کی صورت حاصل کرتی جاتی ہے۔ لہذا ہم اس خاص ادبی ارتقا کی کچھ تھوڑی سی تفصیل یہاں درج کرتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ مرزا غالب کے کلام میں اردو زبان کے تمام شعرا کے کلام سے کچھ زیادہ مشکلات موجود ہیں۔ لہذا مرزا کی زندگی ہی میں اس کے دوستوں نے بعض بعض اشعار کے معنی وقتاً فوقتاً دریافت کئے تھے جنہیں سے کچھ خطالیس عودِ ہندی اور اردوئے معلی میں موجود ہیں۔ مگر وہ اسقدر ناکافی ہیں۔ کہ ان سے مستفید ہوکر کوئی شارح اردو دیوان غالب کی ایک مکمل شرح ہرگز مرتب نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم جس طرز پر مرزا نے اپنے معدودے چند اشعار کی شرح لکھی تھی۔ وہ اوروں کے لئے اچھا خاصہ نمونہ بن گئی چنانچہ بعد کے شارحین (خصوصاً مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی) نے مرزا کے بیسیوں اشعار اسی طریق پر حل کئے۔ لیکن حالی نے بہت زیادہ مشکل اشعار کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ حالانکہ جن اشعار کی شرحیں آپ نے قلمبند فرمائی تھیں وہ ایک غیر واضح طریق پر بعض دوسرے شارحین کی کتب شرح میں بھی موجود ہیں لہذا ہم اردو دیوان غالب کی چند ایسی مروجہ شرحوں کا کچھ مجمل سا حال سطور ذیل میں درج کرتے ہیں:-

ا۔ شرح مجدؔ السنہ میرٹھی۔ یہ شرح حضرت شوکت مجدد السنہ مشرقیہ نے ترتیب دی تھی۔ مگر یہ صرف ۱۴۲ صفحے ۱۸ × ۲۲ تقطیع کے ہیں۔ جن میں تمام اردو اشعار غالب کی تشریح نہیں کی گئی۔ بلکہ ایک کثیر حصہ کلام غالب کا نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ عنوان اس کتاب کا حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی مرحوم " تجویز کیا ہے۔ اس شرح کی یہ خصوصیات ہیں (الف) ہر شعر میں جو مشکل الفاظ نظر آتے ہیں ان کے تمام معنی لغتوں سے نقل کر کے درج کر دئے گئے ہیں۔ اگرچہ ان سب درجنوں معانی میں سے صرف ایک آدھ کی حل شعر میں ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن مجدد صاحب کی عالمانہ

قابلیت کا اظہار اور کس طرح ہوسکتا تھا۔ اسی طرح ابتدائے کتاب میں ایک ایک شعر کے سات سات معنی درج شرح کردئے ہیں جن میں سے اکثر حسن مجدد صاحب کی مجددانہ نازک خیالی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ ورنہ شرح دیوان غالب سے ان کو کچھ سروکار نہیں ہے۔ لہذا جب دیکھا کہ رسالہ شرح کا حجم زرا بڑھنے لگا تو مجدد صاحب نے ہر شعر کے سات سات معنی لکھنے کے بجائے آخری حصہ شرح میں ایک شعر کے صرف ایک معنی بھی پوری طرح بیان نہیں کئے۔ (ب) مجدد صاحب موصوف کی یہ شرح کس قسم کی ہے۔ اس کے متعلق جناب حسرت موہانی صاحب اپنی شرح دیوان غالب کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ راقم حروف اپنی قصورِ فہم کے باعث مجدد صاحب کے دقیق مطالب کے سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے سے قاصر رہا:-

ہم حسرت صاحب کے قول کی تطبیق کرتے ہیں۔ لیکن مجدد صاحب کی یہ شرح اکثر میرے پیش نظر رہی ہے۔ یہ اسقدر مہمل بھی نہیں ہے جیسا کہ اسے بنا یا گیا ہے۔ ہاں بعض اشعار اس میں بھی غلط طور پر شرح کئے گئے ہیں۔ اور یہ نقص صرف اسی شرح سے مخصوص نہیں ہے بلکہ کلام غالب ہی کا اقتضا ہے کہ اس کے بعض بعض اشعار کئی کئی شرحوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور پھر جو معنی کسی شارح سے واضح طور پر بیان ہو گئے ہیں اسوقت وہی معنی بالکل صحیح و درست دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحب کی مندرجہ ذیل تشریحات اشعار غالب جو اسوقت صحیح معلوم ہوئی تھیں۔ اب بالکل غلط معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً غالب ؂

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی ٭ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

حضرت مجدد صاحب نے اس شعر کے یہ معنی بنائے ہیں۔ میں سرتاپا

عشق میں قید ہوں ۔ اور ہستی یا زندگی کی الفت نے بھی مجبور کر رکھا ہے ۔ برق کو میں نے اپنا معبود بنا رکھا ہے ۔ اور اس سے التجا کرتا ہوں ۔ کہ وہ مجھے جلا دے اور فنا کر دے   مگر اس عبادت سے چونکہ کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ پس افسوس کرتا ہوں کہ کیوں زندہ ہوں ۔

دراصل مجدد صاحب اس شعر کو سمجھ ہی نہ سکے ۔ کیونکہ شاعر یہ کہتا ہے کہ میں سراپا عشق میں غرق ہوں ۔ اور اس کو ترک نہیں کر سکتا ۔ بلکہ یہ میری جان لیکے ہی پیچھا چھوڑیگا ۔ ادھر جان بھی مجھے پیاری ہے ۔ یعنی الفت ہستی ناگزیر ہے گویا میری یہ حالت ہے کہ جیسے کوئی کسان برق کی تو عبادت کیا کرے اور جب وہ برق کھیت پر گر کر حاصل یعنی فصل کو جلا دے تو افسوس کرے ۔ مراد یہ کہ جب کوئی شخص عاشق ہوا ۔ تو پھر زندگی کی محبت سے کیا واسطہ ۔

آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف ✦ ٹوٹے پڑے ہیں حلقہ دام ہوائے گل

حل مجدد صاحب ۔ بطور طنز کہتا ہے کہ نسیم کا آزاد ہونا (آزادی سے چلنا) مبارک ہو ۔ جس کی بدولت دام ہوائے گل کے حلقے ہر طرف ٹوٹے پڑے ہیں یعنی اس کثرت سے پھول ہیں ۔ کہ کسی کو پھولوں کی محبت اور خواہش ہی نہیں رہی ۔

یہ شرح غلط ہے ۔ اگر ہوائے گل کے معنی (بقول مجدد صاحب) پھولوں کی خواہش لئے جائیں ۔ تو دوسرے مصرعے کا مفہوم یہ ہے ۔ کہ پھولوں کی خواہش کے جال کی زنجیریاں سب ٹوٹ گئی ہیں اس سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں ہوتا ۔ کہ کثرت گل سے پھول بیقدر ہو گئے ۔ بلکہ بقول مجدد صاحب شعر کا مطلب یہ ہونا

چاہیے ۔ کہ نسیم کا آزادی سے چلنا اس لئے مبارک ہو یعنی آپ کو چلنا اس لئے دلپسند ہو یا مبارک رہے کہ پھولوں کی خواہش کا جو پھندا تھا وہی گویا ٹوٹ گیا ۔ تو اس سے نسیم کو آزادی حاصل ہو گئی ۔ لیکن یہ تشریح صحیح نہیں ہے ۔ اسیطرح مجدد صاحب کے اور بھی بیسیوں اشعار درست نہیں ہیں مگر ان کی خیال آفرین شرح نے بعد کے شارحین کو ضرور بہت مدد دی ۔ اور اسطرح اپنے وقت میں یہ شرح کچھ بیکار ثابت نہیں ہوئی ۔

۱۲ ۔ وثوق صراحت ۔ اس شرح کو حضرت والہ حیدرآبادی نے مرتب کیا تھا ۔ اسکی نسبت حسرت موہانی صاحب قبلہ ارشاد فرماتے ہیں ۔ کہ دیوان غالب کی مکمل شرح نہیں ہے ۔ محض چند نوٹوں اور اشاروں کا مجموعہ ہے لہذا اس پر کہیں کچھ اور زیادہ تنقید کرنے کی حاجت نہیں ۔ یہ شرح پہلی مرتبہ غالباً کتب خانہ ریاست رامپور میں میری نظر سے گزری تھی ۔

۱۳ ۔ شرح دیوان غالب از مولوی سید علی صاحب طباطبائی نظم لکھنوی ۔ یہ شرح بہت بہتر ہے ۔ مگر زیادہ تر ان شعرا کے مذاق کی ہے ۔ کہ جو فن شاعری میں کمال پیدا کیا چاہتے ہیں ۔ لہذا ۔ اسکا کثیر حصہ ان حشو و زوائد کو پڑھے کہ جن کی طلبائے مدارس و کالج کو چنداں احتیاج نہیں ہوتی ۔ مزید براں حضرت نظم صاحب نے جا بجا غالب کے کلام پر اعتراضات کر کے اس کے سقم دکھلائے ہیں ۔ اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ۔ کہ غالب کا ابتدائی کلام بہ تخلص اسد عموماً اغلاط سے پر تھا ۔ حضرت نظم صاحب کی تحریروں سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے ۔ مگر ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ غالب کی تکمیل شاعری بتدریج ہوئی تھی ۔ اور ایسے نقائص کا ہونا بغرض مشق نہایت ضروری تھا ۔ خیر ۔ نظم صاحب کی شرح اور شارحین کی عام دلچسپی اور انکے استفادہ کے لئے ۔

بہت اچھی تالیف ہے۔ لیکن اس میں بھی چند اشعار کی شرح یا تو غلط کی گئی ہے یا توضاحت نہیں ہوئی۔ مثلاً غالب ؎

ڈھانکا کفن نے داغ عیوب برہنگی ٭ میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

جناب نظم صاحب اس کی یوں شرح فرماتے ہیں۔ کہ مرجانے ہی سے عیب برہنگی مٹا نہیں تو میں ہر لباس میں ننگ ہستی وجود تھا۔ یہ شرح صرف مصنف ہی کی الفاظ کو دوہرانی ہے ورنہ شرح کرنے میں حتی الامکان بعض دوسرے الفاظ و جملات سے کام لینا چاہیے خصوصاً طلبائے مدرسہ و کالج تو ایسی شرحوں سے مطلقاً مستفید نہیں ہوسکتے۔ غالب ؎

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات ٭ دے اور دل انکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

معنی طباطبائی صاحب۔ میں سوال وصل کھل کے نہیں کہہ سکتا۔ اور وہ سادہ دلی سے بے صاف صاف کہے ہوئے مطلب سمجھ نہیں سکتے۔

اس شعر میں مری بات سے مراد ہر قسم کی بات ہے۔ حالانکہ نظم صاحب اس کو وصل کے سوال سے مختص فرماتے ہیں۔ اگرچہ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب شاعر نے کوئی ایسی تخصیص نہیں کی۔ تو یہ معنی اور سب معنی پر جو اس شعر سے مستنبط ہو سکتے ہیں۔ ہرگز حاوی نہیں ہیں۔ لہذا کلیم درست نہیں ہیں (اسکو صحیح معنی کتاب ہذا میں ملاحظہ فرمائیں)

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم ٭ ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

مفہوم حضرت نظم صاحب۔ شمع کا ذکر محض تمثیل ہے۔ غرض اپنے حال سے ہے۔

مولف:۔ یہ شرح نہیں ہے۔ کیونکہ غالب کا کوئی شعر بھی محض ایسے

اشاروں سے عام فہم نہیں ہوسکتا۔

۱۴۔ شرح دیوان غالب مرتبہ جناب مولوی عبد الباری صاحب آسی سکرٹری انجمن فاحان ادب لکھنؤ۔ موجودہ تمام شرحوں میں یہ شرح بہت جامع وصاف وسلیس عبارت میں ہے اور بلحاظ معانی اشعار حتی الامکان صحیح ہے تاہم حسب دستور اس میں بھی بعض اشعار کی شرح یا تو غلط کی گئی ہے یا مبہم ہے مثلاً غالب ؎

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا۔
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

شرح آسی صاحب۔ آتش زیر پا بہ معنی بے قرار یعنی چونکہ میں اسیری کی حالت میں بھی بے قرار ہوں۔ اس واسطے میرا حلقہ زنجیر مثل موئے آتش دیدہ بن گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ آگ بال کو جب جلا دیتی ہے تو وہ پیچ وتاب کھا جاتا ہے اور یہ نہایت عمدہ تمثیل ہے۔ وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ شرح بہت مبہم ہے اصلی معنی جناب آسی صاحب کیطرح کسی شارح کے بھی ذہن نشین نہیں ہوئے ہاں جناب نظم طباطبائی صاحب نے اس کے کچھ درست معنی لکھدئے ہیں مگر وہ اسقدر غیر واضح ہیں کہ اچھی طرح دل نشین نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین صاحب آزاد نے بھی اس شعر کے متعلق تذکرہ آب حیات میں یوں لکھا ہے کہ آتش زیر پا کے معنی بیقرار ہونا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ مگر اس شعر میں غالب نے اس جملے کا لفظی مفہوم یعنی دو پاؤں کے نیچے آگ ہے" مراد رکھا ہے۔ اور اس شعر کے جو حقیقی معنی ہیں وہ کتاب ہذا کے صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۵۔ شرح دیوان غالب۔ مرتبہ جناب حسرت موہانی صاحب۔ یہ شرح پہلے بہت ہی مختصر سی شائع ہوئی تھی۔ پھر کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ طبع کی گئی۔ مگر یہ نیا ایڈیشن بھی اکثر اشعار کے ایسے مختصر سے مختصر معنی پیش کرتا ہے کہ طلبا ان اشعار کی تشریح بخوبی سمجھ نہیں سکتے۔ علاوہ ازیں صدہا اشعار بالکل آسان سمجھکر بغیر شرح ہی سہنے دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ ان میں اکثر اشعار تشریح طلب ہیں۔ اور جن اشعار کی شرح کی گئی ہے۔ ان معانی میں بھی کہیں کہیں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مگر وہ خال خال ہیں۔ لہذا حسرت صاحب کی شرح جسقدر مختصر ہے ویسے ہی سب شرحوں میں بہت کم قیمت کی بھی ہے۔ اس میں بھی چند اشعار کی شرح یا تو مبہم ہے یا غلط ہے مثلاً۔ غالب ؎

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ ٭ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

جناب حسرت موہانی صاحب (شرح) آفتاب سے لیکر ذرے تک ہر شے مانند دل ہے۔ اور دل بصورت آئینہ ہے۔ پس گویا ہر طوطی کو یعنی ہر شیدائے آئینہ دل کو ہر سمت سے آئینہ مقابل نظر آتا ہے۔

عام شرحوں میں یہی معنی رائج ہیں۔ مگر دراصل دل و دل ایک فارسی محاورہ ہے جس کے معنی بیقرار ہونے کے ہیں۔ غالباً یہی معنی اس جگہہ مقصود ہیں۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
غالب ؎ تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

مفہوم حسرت صاحب۔ مجھکو موت کی راہ نہ دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ خواہ مخواہ آئیگی۔ علاوہ اس کے موت کی خواہش کرنے میں یہ بات بھی پیدا

ہوئی کہ میں چاہتا ہوں کہ تم نہ آؤ۔ اور اگر ایسے خیال کا شبہ بھی میری نسبت ہو تو میں پھر کبھی تمکو بلانے کے قابل نہ رہوں گا۔ یعنی ایسا خیال رکھکر پھر کس منہ سے تم کو بلاؤنگا۔

دراصل یہاں غالب نے یہ مقابلہ کرنا چاہا ہے۔ کہ اگر موت کی راہ نہ دیکھوں یعنی اس کی مطلق پرواہ نہ کروں تو پھر بھی وہ ضرور آجاتی ہے اگر اسی اصول پر تمہاری راہ بھی نہ دیکھوں یعنی انتظار نکروں تو تم نہیں آتے اور بن بلائے نہیں بنتی اس شعر میں موت کا تقابل دوست کی آمد سے اس لئے کیا ہے کہ موت کا آنا جسطرح مرنے والے کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے اسیطرح دوست کا آنا بھی عاشق کو اس کے برعکس بڑے سے بڑے فائدہ یعنی وصال کی امید دلا سکتا ہے لہذا یہ تقابل کرنا پڑا۔

مراۃ الغالب۔ شرح دیوان غالب۔ از جناب سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم۔ اس شرح میں غالب کے قریباً ہر ایک شعر پر شاعر کی داد دی گئی ہے۔ حالانکہ اب غالب کا اعتراف اس حد تک کیا جا چکا ہے کہ حضرت آزاد و داغ کے زمانے میں ذوق کی جو شہرت تھی اور اس نے غالب کو گویا ماند کر رکھا تھا۔ وہ مضمون ہی اب بالکل محو ہو چکا ہے۔

اسی طرح بیخود صاحب کی تشریح اشعار بے تعلق جملات و فقرات سے مملو ہے۔ اور کہیں کہیں شرح بھی غلط کی ہے۔ تاہم مضامین غالب کو عام فہم کرنے میں بیجد کوشش کی ہے۔ مثلاً غالب

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا

اس شعر میں معشوق سے خطاب ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنی آرائش کی فکر میں ہے۔ حالانکہ قدرت نے ایک گھاس کے تنکے تک کو بھی یہاں آراستہ و پیراستہ کرکے بھیجا ہے اور ایسا ہی وہ محبوب بھی قدرتاً آراستہ و پیراستہ ہے۔ مگر حضرت بیخود صاحب شرح فرماتے ہیں۔ کہ اہل دنیا رازِ حقیقت سے خبردار نہیں۔ ہر شخص کی طبیعت میں فخر و ناز کا ایک مادہ ہے۔ جو سب کے دلوں میں یہ وہم پیدا کر دیتا ہے کہ ہم نے یہ کام اچھا کیا۔ اور ہماری تدبیر سے یہ کام بن پڑا۔ حالانکہ جو کچھ ہے سب اس کی طرف سے ہے بغیر حکم الٰہی کے یہاں کچھ نہیں ہوتا۔

(یہ معنی بالکل بے تعلق ہیں)

مطالب الغالب۔ اس شرح کو مولانا سہا صاحب نے مرتب کیا تھا۔ جو کہ اسوقت شائع ہوئی تھی جبکہ شروح غالب بکثرت طبع ہو چکی تھیں۔ باوجود اس کے سہا صاحب نے قصائد و قطعات و متفرقات کی شرح مکمل طور پر نہیں کی۔ حالانکہ آپ نے جو ایک دیباچہ اس کتاب کے ساتھ درج کیا ہے اس کا بیشتر حصہ شرحِ غالب سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ تاہم اس شرح میں اشعار غالب کے جو مشکل الفاظ ہر جگہ نظر آتے ہیں ان کے معنی بوضاحت بیان کر دیئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ شرح طلبائے پنجاب میں زیادہ تر مقبول ہو چکی ہے۔ غلطیاں تو اس میں بھی موجود ہیں۔ اور بعض بعض اشعار بالکل آسان

سمجھکر ان کی شرح نظرانداز کر دی گئی ہے۔ حالانکہ غالب کا کوئی آسان سے آسان شعر ایسا نہیں جو طلبائے مدارس و کالج کے لیے شرح کا محتاج نہ ہو مثلاً۔ ؎

اے ترا جلوہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سربسر انداز

شرح سہا صاحب۔ انگیز اٹھا ہوا۔ یہاں غالباً انداز کی رعایت سے لائے ہیں۔ کہ انداز و انگیز انداختن و انگیختن سے ماخوذ ہیں۔ جو متضاد معنی رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تیرا غمزہ التفات اٹھا دیتا ہے۔ یا تیرا غمزہ بے ساختہ ہے اور تیرا ظلم بھی ادا کے ساتھ ہے۔

اعتراض۔ یہ ایک غیر مکمل شرح ہے۔ کہ جو عام طلباء کی سمجھ میں ہرگز نہیں آسکتی۔ اور کسیقدر غلط بھی ہے۔ اس کے متعلق اسی کتاب میں کی شرح ملاحظہ فرمائیں۔ ا س

غالب
تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس
بکوریٔ دل و چشم رقیب ساغر کھینچ

شرح سہا:۔ چشم نرگس کو شعرا کور بھی لکھتے ہیں۔ نرگس و ساغر میں تشبیہ ہے۔ اور شراب کسی کی یاد میں پیتے ہیں۔

یہ شرح۔ شرح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے عوام کو اس شعر کا مطلب ہرگز ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔

یادگارِ غالب:۔ مرتبہ جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم۔ سب جانتے ہیں کہ غالب کے اکثر آسان اردو اشعار کی کتاب مذکور میں مولانا موصوف نے بھی شرح کی ہے۔ جو محض تمثیلات کے طور پر

ورنہ خواجہ صاحب کو اس سے ایک مکمل شرح اردو دیوان غالب لکھنا مقصود نہیں تھی۔ تاہم بعض بعض اشعارِ غالب کی بہمہ وجوہ یہ ایک بہترین شرح ہے۔ چنانچہ اس میں طرزِ شرحِ غالب کا اندازہ بہ کمال موجود پایا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب کی سخن فہمی اور آپ کے کمال فن کی جسقدر تعریف کیجائے کم ہے۔

ابھی شرح غالب سے بھی مجھے کہیں کہیں اختلاف ہے۔ غالبًا یہ میرا ہی قصور فہم ہوگا۔ بہرحال میں اپنی ناچیز وحقیر سمجھ کے مطابق کچھ عرض کرتا ہوں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا غالبؔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

شرح مولٰنا موصوف۔ نشاط کے معنی امنگ کے ہیں۔ نشاط کار یعنی کام کرنے کی امنگ۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے۔ کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے۔ کہ جسقدر فرصت قلیل ہوتی ہے۔ اسیقدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کیا جاتا ہے۔ (یادگار غالب) یہ شرح ممکن ہے کہ درست ہو۔ مگر مجھکو اس سے اختلاف ہے۔ کیونکہ میں دوسرے مصرعِ شعر میں "جو مرنا" کا لفظ آیا ہے اس کا مطلب ہوس میں مرنا یا لالچ کرنا مقصود رکھتا ہوں۔ جس سے اس سارے شعر کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ کہ اہل دنیا جو کام کرتے ہیں اسی لالچ کی بدولت اگر یہ مرنا نہ ہوتا۔ تو جینے میں بھی کچھ مزہ نہ آتا۔

غالبؔ
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

یہ ایک معرکتہ الآرا شعر ہے۔ کہ جس کی شرحِ خود آزاد دہلوی تک بھی کماحقہٗ نہیں کر سکے۔ چنانچہ مولانا آزاد نے اس کے معنی خواجہ صاحب سے

بذریعہ خط وکتابت طلب کئے تھے (ملاحظہ ہوں مکتوبات آزاد مرتبہ آزاد بکڈپو صفحہ ۲۴۸) جس کے جواب میں خواجہ صاحب نے لکھا ہے۔ کہ سر ہونے کے معنی جہانتک میں نے سمجھے ہیں کھلنے کے ہیں واللعلم عند اللہ۔ شاید کہ شاعر کی یہ مراد ہے کہ وصل کی تیاری کے وقت معشوقہ کی زلفیں سرگوندھنے کے لئے کھلتی ہیں دیکھئے وہ وقت کب آتا ہے۔ ظاہرا اس وقت تک عمر ختم ہوجائیگی (وصل) سرزلف شدن یعنی زلف کا سر ہونا۔ ایک فارسی زبان کا محاورہ ہے جس کا مفہوم معشوق کا عاشق کے ساتھ حد درجے کا استغنا برتنا ہے۔ لہذا شعر کے یہ معنی ہوئے کہ عاشق کی آہ کو ایک عرصہ دراز درکار ہے کہ وہ معشوق پر اثر اور معشوق کی عادتِ سرزلف شدن یعنی بیجا استغنا برتنے کی ہے۔ تو اسوقت تک کہ معشوق استغنا ترک کرے اور وصال حاصل ہو کون جیتا رہ سکتا ہے۔ (سرزلف شدن کے یہ معنی غالب کی پنج آہنگ میں موجود ہیں)

شرح غالب از حضرت نظامی صاحب بدایونی مدظلہٗ۔ یہ شرح ہرگز شرح کے نکتہ نظر سے نہیں لکھی گئی تھی۔ بلکہ محض اردو دیوان غالب کو بعض بعض نوٹوں کے ساتھ بحسن وخوبی طبع کرنا منظور تھا۔ جو فرض بہت اچھی طرح ادا کیا گیا ہے لہذا یہ زیادہ نوٹس کے قابل نہیں ہے۔

شرح دیوان غالب موسوم بہ ہدیہ سعید۔ اس کو جناب قاضی سعید الدین احمد صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی۔ لیکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے شائع کیا ہے۔ یہ بہت اچھی شرح ہے جس میں طلبائے مدارس وکالج کے لئے اسقدر مواد ادب جمع کیا گیا ہے کہ وہ اس سے بدرجہ احسن مستفید ہو سکتے ہیں۔

قاضی صاحب نے بمشورہ جناب مولوی دعا لقا محمد اسلم صاحب جیراجپوری مدظلہ یہ بہت بڑا کام سرانجام کر دیا ہے۔ خاکم بدہن میں انکی شرح پر کچھ تنقید کرنا تو بے ادبی میں داخل سمجھتا ہوں۔ مگر غالب کا کلام ہی کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اس میں کہیں کہیں اختلاف معانی ضرور رونما ہو جاتا ہے۔ فہو ہذا۔

غالب
دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذت درد
کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا

شرح جناب قاضی صاحب: میرا دل حسرت زدہ (حسرتوں کا مارا ہوا) درد کی لذتوں کا ایک دسترخوان تھا جس پر انواع و اقسام کے درد چنے ہوئے تھے۔ میرے دوستوں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان لذات درد سے اپنا حصہ لیا۔ یہ شرح شعر قریباً ہر ایک اور شرح دیوان غالب میں موجود پائی جاتی ہے کہ جس کو یہاں بھی دہرا دیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ "یاروں کا" ایک اردو کا محاورہ ہے جس کے معنی اپنا ہے۔ جیسا کہ کہا کرتے ہیں بس اب یاروں کا کام بنا ہی چاہتا ہے۔" لہٰذا اس شعر کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ جو زیادہ قرین قیاس ہیں کہ میرا دل حسرتوں کا ایک دسترخوان ہے یعنی حد درجہ کا غمگین۔ لہٰذا میرا کام بن گیا۔ وغیرہ وغیرہ (ملاحظہ ہو شرح ہذا صفحہ ۱۱)

غالب
نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریف راز محبت مگر در و دیوار

مفہوم جناب قاضی صاحب: اے غالب راز محبت کو تو دنیا میں سوائے در و دیوار کے کسی سے مت کہہ۔ کیونکہ در و دیوار کو چھوڑ کر کوئی بھی راز

محبت کو نہیں چھپا سکتا۔ اور چونکہ در و دیوار سے راز کہنا فضول ہے۔ اسلئے نتیجہ یہ نکلا کہ راز محبت کا کسی پر بھی اظہار نہ کرنا چاہیئے۔

ممکن ہے کہ قاضی صاحب کو فارسی کی وہ مشہور مثل یہ شرح شعر لکھتے وقت یاد نہ رہی ہو۔ کہ کہتے ہیں دیوار ہم گوش دارد۔ لہٰذا مصنف لکھتا ہے کہ غالب جبکہ حریف راز محبت زمانے بھر میں اور کوئی نہیں ہے۔ مگر در و دیوار تو اب تو کسی سے راز محبت نہ کہہ۔

یہاں حریف کا مطلب مخالف ہے یعنی راز کو قصداً فاش کر دینے والی دیوار ہم گوش دارد یعنی یہ بھی راز کو سننے کے بعد چھپاتی نہیں ہے۔ بلکہ کسی نہ کسی پر ضرور ظاہر کر دیتی ہے۔ لہٰذا اب واضح ہوا۔ کہ مصنف کا اصلی مفہوم شعر کیا ہے؟ یعنی کوئی حریف راز نہیں گر دیوار۔

ایک التجا

اس طول طویل مضمون سے ہماری غرض اور شارحین غالب کی سبکی کرنا نہیں ہے۔ بلکہ محض یہ ثابت کرنا مدنظر ہے۔ کہ شارحین میں کس قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو شاید ہماری اس ناچیز کوشش سے آئندہ رفع ہو جائیگا۔ یا کم از کم عوام ہی دیوان غالب کو اس شرح کی بدولت کچھ سمجھ سکیں گے تو وہ خود ہی اندازہ کر لیا کریں گے کہ غالب کے ہر شعر کے صحیح اور درست معنی کیا ہو سکتے ہیں۔ اور انکو شارحین غالب نے کس کس طرح پیش کیا ہے۔ ورنہ سہ

مطلب سعدی دیگر است

نہ معلوم یہ روش کبتک چلتی رہیگی اور ہم کبتک اختلاف اٹھایا کرتے رہینگے!!!

فہرست اغلاط

اس کتاب کو مطالعہ کرنے سے قبل۔ وہ تمام غلطیاں جو درج ذیل ہیں بغرض بالضرور صحیح کرلو

صفحہ	نمبر شعر	غلط	صحیح	صفحہ	نمبر شعر	غلط	صحیح
۱	—	عنقائے دمعانی	عنقائے معانی	۵۳	۱۵۰	ہمنائی	ہمنائی
۸	۲۰	کوابسی	کو ایسی لگی	۱۵۵	۴۵۸	بدامی	مدامی
۹	۳۱	عالم آباد	عالم آباد	۱۶۶	۴۸۰	گرمی قیس	گرمی بزم
"	۲۲	انتہا	تنہا	۱۹۵	۵۶۳	گرفتاری	گرفتار
"	۲۶	پہ افشاں	پُرافشاں	۲۰۵	۵۶۴	رومیں	رَدمیں
۱۰	۲۸	لب دنداں	لبِ دنداں	"	"	رجس	رخش
۱۱	۲۷	انہیں سے	انھیں سے	"	"	پاے	پا ہے
۱۹	۵۲	دی	تماشہ دی	۲۱۵	۶۲۰	یہ سب نمبر غلط لگائے گئے ہیں۔ ان اشعار کو اگلی شرح سے مقابلہ کرکے معنی درست کرلو	
"	۵۳	علوے	جلوے		تا		
۳۱	۵۴	چہرہ	چہرہ کا		۶۲۳		
۲۸	۶۷	مژدہ ہاے	مژدہ ہائے	۲۲۱	۶۲۸	سالت	مسافرت
۳۰	۷۰	ترص	قرص	۲۲۳	۶۸۲	ہمین حق	ہمارا حق
۳۵	۹۱	آہنگ تھا	آہنگ ہے	۲۴۶	۶۹۶	پہ انشان	پُرافشاں
"	۹۶	یکھے	دیکھتے	۲۵۱	۷۰۹	چھپائے آتے	چھپائے
۳۷	۹۲	خوشگو	خوشگوار	۲۵۵	۷۱۷	افشاد مرکنایہ	افشا دکنایہ
۵۱	۱۳۸	غرض کی	غرض کلی	۲۶۷	۷۵۵	ستم میں	سیم تن
			[illegible]	۱۵۲	۴۳۶	تبرکی لوک	تیر کی بھال

عنقائے معانی

یعنے

صحیح ترین و بہترین شرح اردو دیوان غالب

غزلیات

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا	۱	کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ	۲	صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے	۳	سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے	۴	مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

۵ بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۱) کاغذی پیرہن در پیرہن۔ یہ ایک فارسی محاورہ ہے جس کے معنی کسی کے ہاتھ سے فریاد کرنا ہے! اور یہ محاورہ اس طرح پیدا ہوا۔ کہ قدیم ایران میں کسی پر ظلم ہوتا تھا۔ تو وہ عدالت میں حسب انصاف کھینچے جاتا تھا۔ تو سفید کاغذ کا ایک بڑا سا چوغہ (جس پر سرخ سرخ لہو کے چھینٹے دیئے جاتے تھے) پہنکر جایا کرتا تھا۔ تاکہ دور ہی سے معلوم ہو۔ کہ وہ فریادی ہے [illegible]

تصاویر ہاتھ سے عموماً سفید کاغذ پر کشید کی جاتی تھیں۔ اور ان تصاویر میں بھی اور رنگوں کی نسبت لال شوخ رنگ بہت زیادہ استعمال کیا جاتا تھا۔ (چنانچہ ہندوستان کے عجائب گھروں کی قدیم تصاویر میں زیادہ تر لال رنگ ہی مستعمل نظر آتا ہے) غالباً انہی وہ باتوں سے غالب کو یہ شعر تصنیف کرنے کا خیال پیدا ہوا ہوگا۔ تاہم کاغذی پیرہن کا جملہ اس سے پہلے بھی شعرا میں نظم کیا جاتا تھا جیسے

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد زادۂ خاطر من تا بدہی داد مرا

یعنی زادۂ خاطر من یا مرا شعر کاغذی لباس پہن کر (بصورت دادخواہ) اس بارگاہ (دربار بادشاہ کی عدالت) میں انصاف کیلئے آیا ہے۔ تاکہ تو (یعنی اے مخاطب بادشاہ) میری داد دے۔ اب یہ فارسی شعر تو بالکل سہل ہے۔ مگر غالب کے شعر کے اصلی معنی صرف اسقدر سمجھ میں آتے ہیں کہ وہ ایک شوخ لال رنگ کی تصویر دیکھکر اس سے مخاطب کرتا ہے۔ جبکہ ہر پیکر (نقش) تصویر کا پیرہن (لباس یا چوغہ) کاغذی ہے۔ (اور کاغذی پیرہن پہننا ایک فارسی محاورے کے مطابق کسی کے فریادی ہونے کی علامت ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ہر نقش (یعنی ہر نقش تصویر یا ہر پیکر تصویر) اپنے کس مصور کے ہاتھ سے فریادی ہے" مرزا غالب نے یہ شعر اسوقت کہا تھا۔ جبکہ وہ مبتدی شاعر تھا۔ اور کلام پر پوری قدرت اسے حاصل نہیں تھی۔ مگر چونکہ یہ شعر مطلع دیوان تھا۔ جو حمد و نعت میں یا کسی طرح تصوف و اخلاق سے متعلق ہونا چاہیئے۔ اس نے کھینچ گھسیٹ کر اس کے معنی یہ بنا لئے۔ کہ تصویر جب کاغذ پر بنائی جاتی ہے۔ تو معاً پیراہن کاغذ اوڑھ کر گویا فریادی ہوجاتی ہے۔ اور چونکہ دنیا کی ہر چیز ایک نقش نما ہے۔ تو یہی حال ہر شے کا ہے۔ کہ وہ فریادی ہے۔ کہ مجھے پیدا کرکے کیوں عذاب و رنج میں ڈال دیا گیا ہے۔ لہذا جب تک وہ زندہ ہے۔ اپنی ہستی کے ہاتھ سے نالاں ہے۔ وغیرہ وغیرہ (ملاحظہ ہو۔ ایک خط از جانب غالب بنام عبدالرزاق شاکر۔ بحوالہ عود ہندی۔

(۲) کاو کاو۔ مصدر کاویدن کرید نا سے ہے۔ اور ایران میں ایک قسم کے تیشے کا نام بھی ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو یہاں استعمال کیا گیا ہے۔ اور شعر میں فرہاد جو تیشہ رکھا کرتا تھا۔ اس کی جگہ "شیر" کا بھی یہاں اشارہ کیا گیا ہے۔

مطلب شعر اے مخاطب مجھ سے تنہائی (فراق) کی سخت جانیوں کی کرید کاوش اور کاوش کا حال نہ پوچھ شام کا صبح کرنا رات کا کاٹنا گویا فرہاد کی طرح دودھ کی نہر بہانا ہے۔ (فرہاد سے شرط لگی تھی۔ کہ وہ جبھی شیر بہائیگا۔ تو اسے شیریں کا وصال حاصل ہوگا)

(۳) تلوار کے سینے سے اس کی دھار یعنی اس کا دم باہر نکلا نظر آتا ہے۔ اسلئے کہ اس میں ایک بے اختیار جذبہ (عاشق کے قتل کرنے کا موجود ہے۔ جو دیکھنے کے قابل ہے۔ (تلوار کی دھار جو تیز اور پتلی ہوا کرتی ہے ذرا ابھری ہوتی ہے اسی کی طرف شاعر اشارہ کرتا ہے)

(۴) آگہی:۔ اے آگہی یعنی واقفیت تو جسقدر کہ تجھ سے ممکن ہوسکے کا جال بچھا اور ہمارے اشعار سن۔ مگر ان کے معنی و مفہوم معدوم ہونگے۔ کیونکہ ہمارے اشعار کا مدعا یا مفہوم عنقا ہے (عنقا سے مراد ایک ایسا جانور ہے جو سنتے تو ہیں۔ مگر دیکھا کبھی نہیں کیونکہ وہ عالم عدم میں رہتا ہے) عالم تقریر یعنے عالم شعر گوئی یا شاعری۔

(۵) بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا (چونکہ اے غالب میں عالم قید میں بھی (بوجہ ظلم صیاد کے) آتش زیر پا ہوں۔ یعنی ایک تو قید دوسرے میرے پاؤں کے نیچے آگ بھی رکھی گئی ہے۔ اس کے سینک سے میری زنجیر پا کا حلقہ (یا لوہے کا کڑا) موئے آتش دیدہ بن گیا ہے۔ یعنی جس بال کو سینک پہنچے۔ وہ چڑ مڑ سا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میرے پاؤں کے نیچے کی آگ کے سینک سے میری زنجیر کا حلقہ جو گول صورت کا ہے۔ دراصل وہ چڑ مڑ ہو کے ایسا بن گیا ہے۔

۶ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا
۷ آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست — ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
۸ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
۹ لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا
۱۰ ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

۱۱	تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا	

(۶) سوائے مجنوں کے اور کوئی شخص نجد کے میدان میں بروئے کار نہ آیا یعنی کام کرنیکو میدان میں نہ نکلا۔ (یہاں عشاق کی طرح صحرا نوردی کو) مگر شاید کہ میدان نجد (صحرا) حاسد کی آنکھ کیطرح تنگ تھا۔ (حاسد کی آنکھ کو ہمیشہ تنگ کہا کرتے ہیں۔ کہ یہ دوسرے کسی کو نہیں دیکھ سکتی) گویا نہیں یا مجنوں کے سوا اور کوئی بڑا صحرا نورد جنونی نہیں ہوا۔ تو یہ اس لئے کہ بیابان نجد میں صرف ایک ہی مجنوں صحرا نوردی کر سکتا تھا۔ وہ ذرا اور بڑا ہوتا۔ تو کسی دوسرے مجنوں کو بھی میدان ہاتھ آتا۔ مطلب یہ کہ اور عشاق بھی مجنوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ مگر ویسے اسباب ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتے جیسے کہ قیس کو ؂

(۷) آشفتگی (پریشانی۔ یہاں مراد پریشانی خاطر ہے نے سویدا دل پر جو کالا داغ ہوا کرتا ہے) اس کو درست (ٹھیک بنا دیا یعنی ہموار کرکے قریباً مٹا دیا یہ ظاہر ہوا (ثابت ہوا) کہ داغ یعنی دل کے سویدے کا سرمایہ (مواد) صرف دھؤاں ہی دھؤاں تھا چنانچہ دل کی سطح جب پر سویدا ہوتا ہے۔ وہ بوجہ پریشانی خاطر جب کچھ پھیلی تو اس سے نقش سویدا جو سیاہ رنگ کا ہوتا ہے کچھ درست سا ہو گیا یعنی مٹ گیا۔ لہذا داغ سویدا محض دھؤاں ہی جمع تھا۔ یہاں دود سے مراد آہ کا دھواں ہے مطلب یہ کہ دل کی پریشانی سے عاشق نے آہیں کھینچیں۔ تو ایسے زور سے کہ دل کے سویدا تک کا مواد اڑ گیا ؂

(۸) معاملہ:۔ عاشق و معشوق کے درمیان جو کچھ گذرے وہ معاملہ کہلاتا ہے مثلاً اظہار آرزوئے وصال۔ شکوہ و شکایات وغیرہ ؂ مجھے خواب میں تیرے ساتھ بذریعہ خیال "معاملہ کرنا پڑا"۔ (جو بہت پر لطف تھا) مگر جب آنکھ کھل گئی۔ تو زیاں نہ سود یعنی کچھ بھی نہیں تھا۔ معاملہ کے معنی چونکہ لین دین کے بھی ہیں۔ اس مناسبت سے زیاں و سود کے الفاظ یہاں مستعمل ہوئے ہیں ؂

(۹) مکتب:۔ ابتدائی مرحلہ ؂ غم دل:۔ یہاں مراد عشق ہے ؂ عشق کے ابتدائی مرحلے

میں ابھی میں بطور مبتدی سبق لے رہا ہوں لیکن وہ سبق یہی ہے۔ کہ (دل) رفت (دل ہاتھ سے گیا) یا دل (بود) دل ابھی ابھی میرے پاس تھا۔ اور دو نہ رہا۔ پہلے مکتب کے لڑکے عموماً فارسی پڑھا کرتے تھے۔ جیسے زید رفت۔ زید آمدہ بود۔ وغیرہ وغیرہ یعنی رفت و بود بہت مستعمل ہوتا تھا۔ رفت بن گیا۔ اور بود معنی تھا۔ یہ دہرانا بھی گویا سبق ہے ؂

(۱۰) میرے داغ عیوب برہنگی (میرے ننگ یا فحاشی کے عیبوں کے داغ) کو کفن یا میری موت ہی نے ڈھانپ دیا۔ یا مر کر ہی میری عیب پوشی ہوئی۔ ورنہ میں ہر لباس میں (یعنے ہر قماش میں مثلاً بادشاہ تھا۔ فقیر تھا۔ رند تھا یا پارسا) اپنے اس وجود کے لئے ننگ یا باعثِ شرمندگی تھا۔ مطلب یہ کہ انسان خواہ کسی حیثیت کا ہو۔ عیوب سے اکثر خالی نہیں ہوتا۔ لہذا موت ہی اسکی پردہ پوشی کرتی ہے ؂

(۱۱) کوہکن (فرہاد) بغیر تیشے کے مر نہ سکا۔ وہ خمارِ رسوم و قیود (رسوم کے نشے) میں پڑکر سرگشتہ (گمراہ) ہو چکا تھا۔ شعرا کا قاعدہ ہے۔ کہ کبھی مجنوں یا فرہاد وغیرہ عشاق کی نسبت ایسے خیالات کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ کہ جن سے اُن کی سبکی ہو۔ چنانچہ یہاں لکھا ہے۔ کہ فرہاد تیشے کو مار کر مرا۔ اور وہ جب تک زندہ رہا اس تیشے کو پاس رکھنے کی گویا ایک رسم ادا کر رہا تھا۔ تو وہ عاشق صادق نہیں تھا کیونکہ عشاق کسی رسم و قیود کے پابند نہیں ہوا کرتے ؟

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا	۱۲	دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا	۱۳	درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم	۱۴	آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری	۱۵	حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل	۱۶	خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم لیکن اسقدر یعنی	۱۷	ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا (۱۱) آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

(۱۲) تم مجھ سے کہتے ہو کہ تیرا دل اگر کہیں زمین پر پڑا مل گیا۔ تو کھوئی ہوئی چیز جیسے پاکے لوٹائی نہیں جاتی ہم اسے نہیں دینگے۔ یہ محض لگاوٹ کی باتیں ہیں کیونکہ میرا دل میرے پاس سے ہی کہاں کہ آپ اس کو گم کریگے۔ ہاں اس تقریر سے مجھے معلوم ہو گیا کہ تمہارا مدعا میرا دل جو تمہارے پاس ہے اسے واپس کرنیکا نہیں ہے ۰

(۱۳) چونکہ عشق سے انسان کو دنیا کا رنج و غم بھول جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی بدولت ہماری طبیعت کو اپنے جینے میں بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ مگر چونکہ عشق میں عاشق کو صدہا تکالیف بھی پیش آیا کرتی ہیں۔ اس لئے یہ ایک قسم کا روگ یا درد بھی ہے۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس درد یعنی غم عشق کا چارہ کیونکر کرنا چاہیئے۔ کہ یہ دکھ پھر کبھی نہ ہو۔ تو اس کی دوا کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر عشق ترک کر دیا جائے۔ جو اس کا بہترین علاج ہے۔ تو پھر زندگی بدمزا ہو جائے گی۔ پس ایسی صورت میں یہی مناسب ہے۔ کہ عشق ضرور قائم رکھا جائے ...

لہٰذا عشق یہ ایک خاص قسم کا درد تو ہوگا۔ مگر بے دوا گویا

اس درد کی دوا پائی - درد بے دوا پایا

نوٹ:۔ زندگی اگر کسی قسم کے شوق یا تعلق خاطر کے بغیر بسر کی جائے۔ تو یہ بہت بے لطف ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے کہا۔ کہ

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

گر وہ عشق تو ایک روگ ثابت ہوا۔ اس کا علاج کچھ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ بے دوا ہی رہے۔ تو اچھا ۰

(۱۴) اقبال کا ایک مصرع ہے "آہ جو دل سے نکلتی ہے اثر کرتی ہے"۔ غالب کہتا ہے۔ کہ چونکہ ہمارا دل دوستدار دشمن ہے۔ یعنی اس معشوق سے جو ہمارا درد خواہ نہیں ہے۔ جا ملا ہے۔ اس لئے اب اس کا کچھ اعتبار نہیں رہا ہے (یعنی اعتماد دل معلوم) اور اسی باعث ہماری آہ میں بھی اثر نہیں۔ کہ کسی کو متوجہ

کرے۔ نہ نالہ یا فریاد ایسی زور سے نکلتی ہے۔ کہ کسی تک پہنچے یا آسمان تک جائے۔ اور ہماری شنوائی ہو ۰

(۱۵) حسن سے مراد ساز و سامان خوبصورتی یا بناؤ سنگار ۰ تغافل حسن۔ بناؤ سنگار نہ کرنا ۰ جراٗت کے معنی یہاں جراٗت دلانا یعنی معشوق کے بناؤ سنگار کیطرف اکسانا۔ تحریص و ترغیب دینا۔ جراٗت آزما۔ اکسانیوالے۔ ترغیب و تحریص دلانیوالا۔ یا مائل کرنیوالا الفعل۔ مطلب شعر۔ حسن کو تغافل میں یعنی معشوق نے جب بناؤ سنگار کیطرف سے غفلت کی۔ تو اس کی سادگی نے (عشاق کو جو باوجود اس سادگی کے اس کے بہرحال دلدادہ رہا کرتے ہیں) پرُکاری کیسا لطف آیا (چنانچہ کہتے ہیں معشوق بے گہنے ہی بھلا لگتا ہے) اسی طرح معشوق کی بیخودی یعنی بوجہ تغافل حسن وہ اگر اپنے بناؤ سنگار سے غافل رہا۔ یا الغرض کیوجہ سے ہنوز اپنے کمال حسن سے بیخود یا بیخبر ہے۔ تو اس صورت میں بھی عشاق کے لئے گویا اس کی بیخودی ہشیاری کا کام کر رہی ہے۔ کہ عشاق اس کی طرف مائل رہتے ہیں ۰

(۱۶) غنچہ پھر لگا کھلنے یعنی پھر بہار کا موسم آگیا ہے۔ (جبکہ عشاق دلباختہ ہو جاتے ہیں۔ آج ہم نے اپنا دل کبھی تو (غنچہ کی طرح جو بوجہ سرخ رنگت کے خون آلود نظر آتا ہے) خون کیا ہوا پایا۔ اور کبھی (بوجہ غنچہ کے بعد کو پھول بنجانے کے یعنی غنچہ و نو بصورت دل ہوتا ہے۔ پھر کھل کر ایسا نہیں رہتا) ہم نے اپنا دل گم کیا ہوا پایا۔ مطلب یہ کہ دل اور غنچے کی صورت ایک جیسی ہوا کرتی ہے۔ پہلے غنچے کا رنگ بہت سرخ ہوتا ہے! اور وہ کھلا نہیں ہوتا تو گویا وہ دل ہے۔ کہ خون سے آلودہ ہوا ہے ۰ پھر غنچہ کھل جاتا ہے۔ تو وہ پھول بنجاتا ہے۔ غنچہ نہیں رہتا۔ اس طرح دل پر پہلا دور اثر عشق (جبکہ وہ تیر نظر سے قتل ہوتا ہے) ختم ہوتا ہے۔ تو پھر وہ ہاتھ ہی سے جاتا رہتا ہے۔ گویا پھر دل کو گم کیا ہوا پایا یعنی گمشدہ سمجھا جاتا ہے۔

(۱۷) ہمیں اپنے دل کا حال کچھ معلوم نہیں لیکن اسقدر ضرور معلوم ہے۔ کہ وہ گم ہو چکا ہے اور اسی لئے اس کو ہم نے بارہا ڈھونڈا تو تمہارے ہی پاس سے نکلا۔ کیونکہ تمہیں نے اس کو بارہا کہیں نہ کہیں سے پاکے رکھ لیا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم تمہارے ہی بار بار عاشق ہوتے ہیں۔ نہ معلوم کیا وجہ ہے۔ کہ ہمارا دل ایسا کرتا ہے۔

(۱۸) زخم پر نمک چھڑکنے سے درد پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ مخالفِ طبع کام کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ واعظ کی نصیحت کی بلند آواز نے میرے زخمی دل پر (جو بوجہ عشق زخم خوردہ تھا) گویا نمک چھڑک دیا۔ بھلا ناصح سے پوچھئے کہ آپ کو اس میں کیا مزا آیا۔ (یعنے ہم تو عاشق ٹھہرے ہمیں وعظ و نصیحت سے کیا کام ناحق ناصح نے ہمیں ستایا ہے)

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا	۱۹	آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں	۲۰	آگ اس گھر کو ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا	۲۱	میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں	۲۲	کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار	۲۳	اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
۲۴	میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا	

(۱۹) میرا دل سوزِ نہاں سے (یعنی عشق میں اندر ہی اندر گھل گھل کر) بے محابا (بلا پس و پیش یا بے تامل) جل کے خاک ہو گیا۔ گویا ایک آتشِ خاموش تھی۔ کہ جس سے شعلے نہ اٹھتے ہوں۔ یا جیسے راکھ میں انگارے کہ خود ہی جل کے تمام ہو جاتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں خوب مشابہت پائی جاتی ہے۔

(۲۰) میرے دل میں اب وصل کا شوق بلکہ دوست کی یاد تک بھی باقی نہیں

رہی۔ کیونکہ اس گھر یعنے دل کو ایسی آگ (یعنی آتشِ عشق) لگی ہے۔ کہ اس میں ذوقِ وصل و یادِ دوست وغیرہ یعنی کیفیتیں تھیں۔ وہ سب اس طرح جاتی رہی ہیں جیسے کہ کسی گھر کو سخت آگ لگے۔ تو وہ بھسم ہو کر رہجاتا ہے۔ مراد یہ کہ انتہائے عشق میں دیوانہ ہو کر انسان بالکل مخبوط الحواس سا ہو جایا کرتا ہے۔

(۲۱) اے غافل میں ملکِ عدم سے بھی پرے چلا گیا ہوں۔ ورنہ جب میں ملکِ عدم میں تھا۔ کہ جہاں عنقا رہا کرتا ہے۔ تو وہاں میری گرم آہ سے بارہا عنقا کا پر جل گیا۔ صوفیا کے نزدیک عدم سے پرے کا مکان بقا یا ہویت کہلاتا ہے۔ بیدل

ہمچو عنقا بے نیاز عرض ایجادیم ما　　یعنی آں سوئے عدم یک عالم آبادیم ما

عنقا کی طرح ہم اس عالم ایجاد کے عرض (صفحہ و سطح) سے بے نیاز ہیں یعنے ملکِ عدم سے آں سوئے (پرے) ایک اور عالم ہم آباد کر چکے ہیں۔ وہ کیا عالم بقا یا ہویت کا عالم جہاں عنقا بھی نہیں پہنچ سکتا۔

(۲۲) جوہرِ اندیشہ یا اپنے خواصِ فہم و فکر کی گرمی کا کیا حال عرض کریں۔ کچھ خیال وحشت (انتہا جا کر اس دنیا سے دور رہنے) کا آیا تھا۔ کہ جس جنگل میں ہم جانا چاہتے تھے۔ وہی جل گیا۔ وحشت یہاں مراد تنہا باشی یا دنیا سے دور جا کر رہنا۔

(۲۳) دل نہیں۔ یعنے میرا اب وہ دل ہی نہیں رہا۔ ورنہ تجھ کو اپنے اس دل کے داغوں کی بہار دکھاتا۔ کیا کروں اس چراغاں یعنے داغہائے دل کا وہ کارفرما اب جل گیا۔ کارفرما سے مراد دل۔

(۲۴) اب میں ہوں اور افسردگی یا اہلِ دنیا سے بیزاری اور الگ تھلگ رہنے کی آرزو۔ کیونکہ اہلِ دنیا (جو عموماً ظاہرداری برتتے ہیں اور خلوص مطلق نہیں رکھتے۔ ان) کے اس طرزِ تپاک (محبت کرنے کے طریق) سے میں جل گیا ہوں (یعنے سخت بیزار ہوں)۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا ۲۵ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب ۲۶ تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

بوئے گل نالۂ دل دُودِ چراغِ محفل	۲۷	جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا
دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد	۲۸	کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند	۲۹	سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

۳۰ دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

(۲۵) شوق یا عشق ہر حال میں سر و سامان کا رقیب ثابت ہوا۔ چنانچہ قیس (مجنوں) تصویر کے پردے (یعنے نقشِ تصویر پر کاغذ کا پردہ ہوتا ہے۔ اس) میں سے بھی ننگا نکلا۔ حاصلِ شعر یہ کہ قیس کی تصویر چونکہ عموماً برہنہ بنائی جاتی ہے۔ تو گویا عشق ظاہری آرائش اور ساز و سامان کا دشمن ہے کہ اسے یہ نہیں چاہیئے۔

(۲۶) داد نہ دینا۔ حوصلہ افزائی نہ کرنا یا کسی چیز کی ہمت بندھا کے اس کو ترقی نہ دلانا۔ تنگیٔ دل۔ دل تنگی۔ دل کا کسی بات کے نہ ہونے سے صدمہ اٹھانا۔ تیر کا افشاں ہونا۔ تیر کے پر ہوتے ہیں۔ جو اگر کسی کو لگے۔ تو وہ اس میں گڑ جاتے ہیں۔ لہذا تیر کا افشاں ہونا۔ اس کے پر کسی چیز میں نہ گڑنا۔ بلکہ پر باہر جھاڑ دیئے جانا۔ مطلب شعر۔ میری دل تنگی یا دل کے غم کی دل کے زخم نے داد نہ دی۔ یعنے اس کو ترقی نہ دلائی۔ یعنے یہ زخم بڑھ جاتا۔ تو میرے دل کا رنج بڑھ جاتا۔ علاوہ ازیں تیر بھی میرے سینۂ بسمل سے نکلا۔ تو وہ پر جھاڑ کے نکلا۔ حالانکہ اس کے پر دل میں رہتے۔ تو دل میں خلش ہوتی۔ اور زخم خوب بڑھتا۔ اور عشاق جسقدر زیادہ دکھ میں ہوں۔ خوش ہوا کرتے ہیں۔

دوسرے معنی:۔ فریاد کے طور پر کہتا ہے۔ یارب زخم نے تنگیٔ دل یعنی دل کی وسعت کی داد نہ دی۔ یعنی اس کی وسعت کو نہ بڑھایا۔ جس کی بدولت کوئی تیر اگر اس میں لگتا۔ تو اس کے اندر ہی رہ جاتا۔ اور پھر تیر بھی جب دل میں لگا۔ تو ذرا چھو کے باہر ہی پر جھاڑتے ہوئے نکل گیا۔ یعنی اٹکا نہیں کہ خلش کرتا رہتا۔

(۲۷) پھول کی خوشبو۔ دل کی فریاد یا آہ و زاری اور محفل کے چراغ کا دھواں (انہیں سے) جو بھی تیری محفل سے نکلا۔ وہ پریشانی کی حالت میں نکلا۔ گویا وہ نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ تیری محفل ایسی دلکش جگہ ہے۔ مگر جب نکلا۔ تو پریشان ہوکر۔ اس میں نکتہ یہ ہے۔ کہ خوشبو۔ فریاد کا شور۔ اور چراغ کا دھواں یہ چیزیں ایسی حالت میں ہی کسی مقام سے دور جا سکتی ہیں۔ کہ خوب پھیل جائیں۔ اور پھیلنا پریشانی سے مشابہ ہوتا ہے۔

(۲۸) میرا حسرت زدہ دل چونکہ لذتِ درد یعنی درد کا مزہ چکھانے والا دسترخوان تھا۔ اس سے یاروں یعنی ہمارا یا اپنا کام بقدرِ لب و دنداں نکلا۔ یعنی حسرت کے عالم میں انسان کبھی اپنے لب کو دانتوں تلے لیکر کاٹتا ہے اور کبھی دانت پیستا ہے۔ مگر جسقدر وفورِ حسرت ہو۔ اسی قدر زیادہ ایسا کیا جاتا ہے۔ حاصلِ شعر یہ کہ دل میں سخت حسرت بھری تھی۔ ہم نے اپنے ہونٹ کو خوب زور سے کاٹا۔ اسی طرح دانتوں کو پیسا۔ اور ایسی حالت میں انسان یہی کیا کرتا ہے۔ خوبی شعر میں یہ ہے۔ کہ دل کو مائدۂ حسرت سے تشبیہ دی ہے اور انسان کھاتے وقت یا غم و رنج کے وقت لب و دنداں ہی سے کام لیا کرتا ہے۔ "یاروں کا کام" یہ پرانا محاورہ ہے۔ مثلاً کہا کرتے ہیں۔ بس یاروں کا کام بن گیا۔ یعنی ہمارا۔

(۲۹) ہمتِ دشوار پسند۔ یعنی وہ ہمت اور حوصلہ جو مجھ میں ہے۔ اور اس کی بدولت میں دشوار سے دشوار کام بھی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔ وہ اب میری نو آموزِ فنا ہے۔ (یعنی پہلے تو وہ صرف دشواری کی طرف مجھے لیجاتی تھی۔ جس میں فنا نہیں ہونا پڑتا تھا۔ مگر اب اس سے بھی بڑھ کر تعلیم فنا دینے لگی) لہذا اگر یہ کام (تعلیم فنا) بھی مثل سابقہ عام دشوار

پسندی کے کچھ آساں نکلا۔ تو پھر میرے ایسے دشوار پسند ہونے کی وجہ سے کوئی دشواری ہی باقی نہیں رہیگی۔ اور میرے لئے گویا سوت مشکل ہو جائیگی مطلب یہ کہ جسقدر مشکلات ہوں۔ اور وہ حل نہ ہوں۔ وُہ مجھے پسند ہیں ؀

(۳۰) آہ غالب گریہ یعنی پہلے رونے میں جو میں نے کچھ ضبط کیا تھا۔ اور کوئی قطرہ (آنسوؤں کا) میرے دِل میں نکلنے سے رہ گیا تھا۔ سو اب اُس نے پھر اٹھایا (آفت برپا کی) اور وہ اب کے طوفان بن کے نمودار ہؤا ہے یعنی اس نے مجھے سخت مائل بہ گریاں کیا ہے۔ قاعدہ ہے۔ کہ جب روتے روتے ختم جائیں۔ تو دوبارہ اس سے زیادہ زور کا رونا آتا ہے ؀

۳۱	دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا	عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا۔
۳۲	تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا	اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
۳۳	تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں	مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
۳۴	دِل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب	اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
۳۵	جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی	دِل بھی اگر گیا تو وہی دِل کا درد تھا
۳۶	احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے	زنداں میں بھی خیالِ بیاباں نورد تھا
۳۷	یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے	حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(۳۱) باب۔ لائق۔ نبرد۔ لڑائی۔ باب نبرد۔ لڑائی کے لائق۔ نبرد پیشہ جس کا پیشہ لڑائی ہو۔ خوب لڑنے والا۔ وہ شخص (معشوق کی) ایک دھمکی ہی سے مر گیا۔ جو لڑنے کے قابل نہیں تھا۔ کیونکہ عشق جس کا پیشہ نبرد (لڑائی) ہے۔ وُہ طلبگار مرد (کسی جنگجو آدمی کا طلبگار) تھا۔ مطلب یہ کہ عشق جوانمردوں کا کام ہے ؀

(۳۲) زندگی میں بھی مجھے موت کا ڈر لگا رہتا تھا۔ (حالانکہ جب تک انسان جیتا ہے ڈرے کیوں مرنا تو ایک دن ہے ہی) دوسرا مصرعہ اس کا ثبوت ہے۔ کہ اپنے آپ کو مثل جانور کے فرض کر کے کہتا ہے۔ کہ اڑنے سے پیشتر بھی میرا رنگ زرد تھا۔ یعنی جب صیاد کو میں نے دیکھا۔ تو صرف اسی کے خوف سے زرد رُو ہو کے میں نہیں اڑا تھا۔ بلکہ اُس سے قبل بھی زرد فام تھا۔ کیونکہ اس وقت موت کا ڈر لگا رہتا تھا۔ حاصل شعر یہ کہ انسان کو ہر طرف سے کوئی نہ کوئی خوف یا صدمہ ہی پیش آتا رہتا ہے۔ اور یہ دنیا جائے خدشہ ہے ؀

دوسرے معنی :۔ اس شعر کے اور معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ اڑنے سے پیشتر سے اگر مراد مرنے سے پہلے لیجائے۔ تو پھر شعر کا حاصل مطلب یہ کہ جیتی جان ہی میں مجھے موت کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ مرنے سے قبل بھی میں زرد رو تھا۔ اور چہرے کا رنگ کسی خوف یا ڈر ہی سے زرد ہوا کرتا ہے۔ گویا پیدا ہونے سے مرنے تک میں صدمات ہی سے خوف کھاتا رہا ؀

(۳۳) عربی میں الف ہزار کو کہتے ہیں۔ اسی سے تالیف بمعنی کسی کتاب کے ہزارہا صفحے مرتب کرنا نکلا ہے۔ کہتا ہے۔ کہ میرا مجموعۂ خیال (وفا کے مضمون سے متعلق) ابھی فرد فرد تھا۔ یعنی میں اس امر میں پریشان خیال تھا کیونکہ پوری طرح سے مجھے زمانے میں وفا کا ذاتی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ کہ ہزارہا صفحات اس کے جمع کر سکتا۔ تاہم اس ناقص مواد کے ساتھ میں وفا کے (متعدد) نسخے یعنی تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا۔ گویا میں ایک ایسے کام کو کر رہا تھا۔ جو زمانے کے حالات ہی سے بالکل کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ یعنی زمانے میں وفا کہاں کہ نسخہ ہائے وفا تالیف ہو سکیں۔ مطلب شعر میرا مجموعۂ خیال (یعنے ذاتی خیالات یا تجربات کا ذخیرہ) ابھی (مضمون وفا کے متعلق) فرد فرد (یعنی پریشان اور ناقص) تھا۔ کہ اسی بنا پر وفا کے مضمون کی کتابیں میں مرتب کرنے لگا تھا۔ یعنی زمانے میں جب وفا ہی نہیں۔

تو اس کے متعلق کتابیں تالیف کرنا عبث تھا ۔

(۳۴) چونکہ انسان کے دل اور جگر دور دور واقع ہیں۔ اسی لئے دل تا جگر کہا۔ اور ان کے درمیانی فاصلے کی نسبت کہتا ہے۔ کہ دل سے جگر تک جو اب ایک خون کے دریا کا کنارہ بن گیا ہے۔ (اور چونکہ دریا کے کنارے پر لوگ بطور رہگذر اُسے بنا کے آتے جاتے ہیں) اس رہگذر (رستے) میں (جو اس قدر خونیں ہو گیا ہے۔ میرے دل و جگر کے خوناخون ہونیسے) آگے یعنی اس سے قبل جلوۂ گل (گلاب کے پھول کا جلوہ یا اثر۔ مثلاً تر و تازگی بھی) گرد تھا۔ یعنی کچھ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ گویا مجھے دل و جگر سے بہت لطف اور راحت حاصل ہوتی تھی۔ مگر اب یہ خوناخون ہو رہے ہیں ۔

(۳۵) اندوہ۔ غم۔ رنج۔ دل کا درد۔ اس سے یہاں دل کا جلنا مراد ہے۔ کہتا ہے۔ اگر میرا دل ہاتھ سے گیا جس کا بظاہر یہ مفہوم ہے۔ کہ وہ گوشت کا لوتھڑا جو میرے سینے میں تھا۔ اور جس میں اندوہِ عشق رہتا تھا۔ گویا اب دل کے ساتھ وہ خارج ہو گیا۔ تو پھر بھی عشق کے غم کی خلش (کشمکش) میرے دل میں باقی ہے۔ اور یہ کیا کبھی جا سکتی ہے۔ ہرگز نہیں ۔

(۳۶) وحشت سے مُراد گھبرا کر کسی صحرا یا جنگل میں تنہائی کیلئے چلے جانا۔ میرے احباب (دوست) میری اس وحشت کا کچھ علاج نہ کر سکے۔ چنانچہ مجھے انہوں نے قید کر دیا۔ (کہ ایسے خیالات سے باز آؤں) پھر بھی میرا خیال بیاباں نورد تھا۔ یعنی میں خود تو وحشت کر کے دشت نوردی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر میرا خیال اسی طرح جنگل میں پھر رہا تھا۔ قاعدہ ہے۔ کہ جنونی کو پاگل خانے میں ڈالدیں۔ تو وہاں بھی اس کے خیالات اسی طرح پریشان رہا کرتے ہیں ۔

(۳۷) یہ لاش اسد (یہ غالب کا پہلا تخلص تھا) خستہ جان (شکستہ حال) کی ہے۔ کہ جس پر کفن نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ عجب آزاد مرد تھا جس نے اپنے کفن تک کیلئے بھی کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔ یعنی اسے بخشے۔ نظیر کا مصرعہ ہے۔ "گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو"

۳۸ شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا	تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
۳۹ بفیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے	کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
۴۰ ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل	کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
۴۱ جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ	مبارکباد اسد غمخوارِ جانِ دردمند آیا

(۳۸) سبحہ۔ تسبیح۔ شمار سبحہ۔ تسبیح کے دانوں کا گننا (تسبیح عموماً سو دانوں کی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے دوسرے مصرعے میں صد دل کا اشارہ کیا) بُت مشکل پسند۔ وہ بت (معشوق) جو عشاق کے لئے مشکلیں پسند کیا کرتا ہے۔ بیک کف بردن۔ ایک ہتھیلی میں لانا۔ صد دل۔ سو عاشقوں کے دل۔ مرغوب شوق ہوا۔ اس بت کو جو مشکل پسند ہے۔ تسبیح کے سو دانے گننے کا شوق اس لئے پیدا ہوا ہے۔ کہ وہ عشاق کے سو دل اپنی ایک ہتھیلی میں لیکر ان کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔ یعنے سو عشاق بیک مشت اکٹھے فراہم ہو کر ایک دوسرے کے رقیب ہوں گے۔ تو باہم رقابت کرکے مشکل پیدا ہوگی۔ اور وہ بت مشکل پسند یہی بات پسند کرتا ہے ۔

(۳۹) بیدلی۔ کسی کام کو خوب مستعد ہو کر نہ کرنا۔ اس سے وہ کام کبھی اختتام تک نہیں پہنچتا۔ نومیدیٔ جاوید۔ ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا۔ کہ وہ کام کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ مطلب شعر۔ دوست کو ہمارا عقدہ مشکل یعنی ہماری مشکل کی گرہ کھولنا یا اس کا حل کرنا منظور رہا ہے۔ مگر وہ

اس کام کو اس قدر بیدلی سے کر رہا ہے۔ کہ) بہ فیضِ بیدلی یعنی اس بیدلی کے ذریعے اس کو ہمیشہ کے لئے اس سے ناامید ہو جانا ایک آسان بات ہے۔ (کشائش کو کھونے کے لئے۔ حل کرنے کے لئے) حاصلِ شعر یہ کہ وہ ہماری مشکل کو بوجہ بیدلی کے کبھی حل نہیں کر سکتا ؛

(۴۰) گُل۔ گلاب کا سرخ پھول ؛ ہولئے سیرِ گل۔ گلاب کے سرخ سرخ پھولوں کے دیکھنے کا شوق۔ آئینہ۔ ثبوت ؛ آئینہ بے مہری۔ بیرحمی کا ثبوت ؛ انداز طریقہ۔ کہتا ہے دوست کے گلاب کے لال لال پھولوں کے دیکھنے کا شوق اس کی شقاوتِ دل یا بیرحمی کا ثبوت ہے۔ کہ اس کو (عاشق بسمل کے خون میں لتھڑنے (بخون غلطیدن) کا انداز (طریقۂ نظارہ) بہت پسند آگیا ہے۔ چونکہ گلاب کے لال پھول موسمِ بہار میں ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ ان سے خون ٹپک رہا ہے۔ اسی مناسبت سے یہ شعر کہا گیا ہے ؛

(۴۱) جراحت۔ جرح سے بمعنے زخمی کرنا۔ الماس۔ ہیرا جس کے کھانے سے دل وجگر زخمی ہوتے ہیں ؛ ارمغاں (تحفہ) داغِ جگر۔ جگر پر زخم کا نشان ؛ طنز سے کہتا ہے۔ کہ اے اسد (عاشق) تجھے مبارک ہو۔ کہ تیری دردمند (دکھوں سے بھری) جان کا غمخوار (دوست) آیا ہے (اور دوست جیسے دستور کے مطابق دوست کے پاس تحفے لاتا ہے) وہی تیرے لئے جراحت یعنی زخم۔ الماس (ہیرا جس کو کھا کر تو اپنے دل وجگر کو زخمی کرے) اور داغِ جگر (جگر کے زخم کا نشان) بطورِ تحفہ۔ ارمغان یعنی ہدیہ لایا ہے حاصل مطلب یہ کہ عشاق کو دوستوں سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اور زیادہ تکلیفیں نصیب ہوتی ہیں ؛

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا	۴۲	ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا	۴۳	یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں ۴۴ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی ۴۵ گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی ۴۶ گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے ۴۷ ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
۴۸ مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(۴۲) نقشِ وفا۔ حروفِ وفا کی وہ تحریر جو کاغذ پر ہوتی ہے۔ یا لفظِ وفا۔ زمانے میں وفا کا لفظ موجبِ تسلی وتسکین نہیں ہوا۔ (دہر بمعنی زمانہ) یہ وہ لفظ ہے کہ معنی سے شرم نہیں کھاتا۔ مطلب یہ کہ اگر لوگ دل سے چاہتے کہ کسی سے وفا کریں۔ تو وہ جب کبھی کسی سے وفا کا وعدہ کرتے۔ تو ضرور وفا کیا کرتے۔ مگر درحقیقت وہ اس کے معنے ہی نہیں جانتے اور وفا کا لفظ اس لئے اپنے ان معانی سے شرمندہ نہیں ہوتا۔ گویا اس کو یہ معنی وفا نصیب ہی نہیں ہوئے۔ اس لئے لوگ بھی اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ یا وعدہ تو وفا کا کرتے ہیں۔ اور الٹا جفا کرتے ہیں۔ تو گویا لفظِ وفا اپنے معنی سے شرم نہیں کھاتا۔ ورنہ اپنے معنی بدل دیتا۔

(۴۳) سبزۂ خط (کسی خوشرو جوان کے منہ پر سبزی نما روئیں یا بال۔ کاکل۔ زلف سرکش۔ مغرور۔ زمرد۔ سبز رنگ کا قیمتی پتھر نگینہ جس کی نسبت یہ غلط بات مشہور ہے۔ کہ سانپ اس کو دیکھکر اندھا ہو جاتا ہے۔ حریف۔ مقابلہ کرنے والا۔ زیر کرنے والا۔ دم۔ سانس۔ افعی۔ کالا سانپ۔ دمِ افعی۔ کالے ناگ کا پھنکارا۔ تیرے منہ پر سبزہ سبز روئیں پھوٹی اس سبزہ تیری مغرور زلفیں نہ دبیں۔ مطلب یہ کہ معشوق (یا طفلِ نازنین) جب کچھ بڑی عمر کا ہو جاتا تو اس کے منہ پر روئیاں پھوٹتی ہیں۔ وہ سابقہ حسن نہیں رہتا۔ اس لئے کہتا ہے۔ کہ تو اس عمر کو پہنچا۔ اب تجھے ناز چھوڑ کر خاکسار ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر نہیں ابھی تو زلفیں سنوار رہا ہے۔ اور تیری مغرور زلف نہیں دبتی۔ یا اگر سرکش کے لفظی معنی لیں تو

سرکش سے مراد لمبے بالوں والی زلف۔ لہذا دوسرے مصرعے کے یہ معنی کہ یہ زمرد یا تیرا سبزۂ خط اس افعی (کالی زلفوں کے ناگ) کے پھنکارے کا مقابلہ نہ کر سکا۔ یا سبزۂ خط کے ہوتے تیری زلفیں اکڑ رہی ہیں۔) تو گویا اس زمرد سے وہ کالا ناگ مغلوب نہ ہوا۔

(۴۴) اندوہ وفا۔ معشوق سے وفا کرنے کی تکلیفیں۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ کسی طرح اس وفا کے غم و رنج سے خلاصی پاؤں۔ اور مر جاؤں (یعنی خودکشی کر لوں) مگر وہ ظالم معشوق) میرے اس طرح مر جانے پر بھی راضی نہ ہوا۔ یعنی وہ اپنی جفا شعاری کی خاطر ایسا امر پسند نہیں کرتا۔ گویا وہ چاہتا ہے۔ کہ میں ہمیشہ اندوہ وفا میں مبتلا ہوں۔

(۴۵) گذرگاہ۔ معمولی راستہ۔ سر منزل۔ یہ لفظ اسی طرح کا ایک مرکب ہے جیسے کہتے ہیں سربراہ۔ سرگروہ۔ سرکار یعنی سردار کسی چیز کا۔ اسی طرح منزل کے معنے راستہ۔ اور سر منزل۔ منزلوں کی سردار منزل۔ یعنی واجب التعظیم گذرگاہ یا وہ۔ وہ چھوٹی سی راہ یا پگڈنڈی جو کسی بڑے راستہ پر پہنچاتی ہے۔ اور پھر سب اس سے گذر جاتے ہیں۔ اگر میرا نفس (ذات یا وجود) جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا۔ یعنی تقوے (پرہیزگاری) کی واجب التعظیم منزل کی پگڈنڈی نہیں بنا یعنی میں بڑا مقدس قابل تقلید آدمی نہیں بن سکا۔ تو نہ سہی۔ میرا دل شراب اور ساغر ہی کے خیال کی گذرگاہ سہی مطلب یہ کہ مجھے اگر لوگ نیک، پاک آدمی خیال نہیں کرتے۔ تو نہ سہی میں گنہگار ہی اچھا ہوں۔

(۴۶) وعدہ۔ وعدۂ وفا یا وعدۂ وصال۔ منت کش۔ احسانمند۔ گلبانگ۔ مژدہ خوشخبری۔ میں تیرے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی ہوں۔ کیونکہ میرا کان کبھی تسکین و تسلی کی خوشخبری کا احسانمند نہیں ہوا۔ یعنی تو نے ہمیشہ جھوٹے وعدے کر کر کے مجھے وعدوں سے خوش ہونے کا عادی ہی جب نہیں بنایا۔ تو اب اگر تو وعدہ کرے یا نہ کرے۔ بہرحال میں خوش ہوں۔

(۴۷) محرومی قسمت۔ بدنصیبی۔ ہم اپنی بدنصیبی کی شکایت کس سے کریں۔ ہم نے چاہا تھا کہ

مر جائیں (یعنی دعا مانگی تھی۔ کہ مر جائیں یا کہ خودکشی کی کوشش کی تھی۔) مگر ناکام رہے۔ اور یہ بات بھی ہو نہ سکی۔ افسوس۔

(۴۸) جنبش لب۔ یہاں دم پھونکنے کے لئے ہونٹوں کو ہلانا۔ حریف۔ برابر کی چوٹ برداشت کرنے والا۔ دم۔ سانس۔ پھونک۔ یہاں دم پھونکنا۔ جیسے نمازی لوگ مسجد سے نکل کر کسی بچے پر پھونک دیتے ہیں۔ اسی طرح دم عیسیٰؑ (حضرت عیسیٰؑ مریضوں پر دم پھونک کر انہیں اچھا کر دیا کرتے تھے۔) غالب حضرت عیسےٰ کے ایک ہونٹ ہلانے کے صدمے ہی سے مر گیا۔ وہ بوجہ کمزوری کے حضرت عیسےٰ کے (پورے) دم کرنے کی چوٹ برداشت نہ کر سکا یعنی اس کا حریف نہ ہوا۔ مراد سخت کمزور اور ناقابل علاج تھا۔ حضرت عیسیٰؑ "قم باذن اللہ" کہہ کر پھونک دیتے تھے۔ تو مریض یا مردہ جیتا اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ یہاں انھوں نے ایسا کہنے کو ایک ہونٹ ہی ہلایا تو موت واقع ہو گئی۔

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا ۴۹ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے بیداد کاوشہائے مژگاں کا ۵۰ کہ ہر ایک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو ۵۱ لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا . . دی اگر فرصت زمانے نے ۵۲ مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے ۵۳ کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ۵۴ ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر ۵۵ مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں ۵۶ چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے ۵۷ دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ ۵۸ سبب کیا خواب میں آکر تبسمہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا ۵۹ قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

(۴۹) ستایش گر۔ تعریف کرنے والا۔ مداح۔ باغ رضواں۔ باغ جنت۔ بہشت۔ طاق نسیاں۔ عموماً کہا کرتے ہیں۔ کہ یہ چیز بالائے طاق یعنی اس کو طاق پر رکھکر بھلا دو۔ لہذا طاق نسیاں بھول چوک کا طاق۔ کہ جس پر کوئی چیز رکھی اور بسر گئی۔ یا بھول گئی۔ کیونکہ نسیان بھولنے کو کہتے ہیں۔ زاہد (واعظ) جس باغ جنت کا اس قدر مداح ہے۔ وہ تو ہم بیخود و بادہ ہوش لوگوں کے بھول چوک کے طاق کا ایک گلدستہ ہے۔ گلدستہ عام طور پر طاق کی زینت ہوتا ہے۔ اسی لئے گلدستہ طاق نسیاں قرار دیا ہے۔ چونکہ واعظ نے جنت کے باغ کی تعریف کی تھی۔ غالب نے اس کے بالمقابل ایک گلدستہ پیش کر دیا۔ اور واعظ کی تحقیر کی۔ کہ اس کے سارے باغ کے جواب میں ہمارا ایک گلدستہ ہی زیادہ ہمارے کارآمد ہے۔ یا اس کے باغ جنت کو ہم نے بطور گلدستہ کے طاق نسیاں پر رکھ چھوڑا ہے کہ وہ کبھی یاد ہی نہ آئے۔

(۵۰) بیداد۔ ظلم۔ کاوش ہائے۔ کھودنا۔ مژگاں۔ پلکیں۔ جو کانٹوں کی طرح تیز نظر آتی ہیں۔ اور شعراء ان کی نسبت کہا کرتے ہیں۔ کہ وہ عشاق کے دل یا سینے کو کانٹے کی طرح چبھا کرتی ہیں۔ تسبیح مرجاں۔ مونگے کے دانوں کی تسبیح یا مالا۔ مونگا خون کی طرح لال لال ہوا کرتا ہے۔ اس معشوق کے دیکھنے سے اس کی پلکیں جو ہمارے دل یا سینے کو کھودتی ہیں۔ یا چھید ڈالتی ہیں۔ اس ظلم کا کیا بیان کریں۔ کہ اس وجہ سے ہر ایک قطرہ خون کا جو ہمارے بدن سے گرتا ہے۔ وہ گویا مونگے کی تسبیح کا دانہ ہوتا ہے۔ یعنی مژگاں کی تیز نوک سے ہر ایک قطرۂ خون گویا اس میں سفتہ یا گندھا ایک دانۂ تسبیح کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کا تیر نظر ہمارے سینے کو چھید ڈالتا ہے۔

(۵۱) سطوت۔ رعب داب۔ دانتوں میں تنکا لینا۔ اس سے مراد اپنے آپ کو ایک تنکے کی طرح حقیر و عاجز ظاہر کرنا۔ یعنی خس بدنداں گرفتن فارسی میں کہتے ہیں۔ ریشہ (غیاث اللغات) درخت کی باریک جڑ کو کہتے ہیں۔ نیستاں۔ نے کا جنگل۔ نے بھی بانسری۔ قاتل کا رعب داب بھی میرے نالوں (رونے دھونے اور شور کرنے) کا مانع نہ ہوا۔ یعنی میں اس سے رک نہ سکا۔ بلکہ (اُلٹا) اپنے اظہار عجز کے لئے جو تنکا قاتل

کے سامنے میں نے اپنے دانتوں میں لیا۔ وہ ایک نیستاں کی جڑ بن گیا۔ اس سے صد ہا نے پیدا ہو کر شور مچانے لگے۔ گویا قاتل تو مجھ ہی کو خاموش کرتا تھا۔ کہ میرے نالے کے شور کے ساتھ ایک نیستاں بھی واویلا مچانے لگا۔ (نے کا کام شور کرنا ہے)

(۵۲) سرو چراغاں۔ باغ میں جب چراغاں یا روشنی کرتے ہیں۔ تو اکثر سرو کے بوٹے کی شاخوں پر چراغ رکھدیتے ہیں۔ یا موم بتیاں لگا دیتے ہیں۔ یہ سرو چراغاں ہوتا ہے۔ جس سے باغ میں دو رنگ روشنی جاتی ہے۔ اسی طرح شعراء داغ دل کی نسبت مبالغہ سے کہا کرتے ہیں۔ کہ بوجہ سوزش کے جلتا اور روشنی دیا کرتا ہے۔ مطلب میرا ہر داغ دل سرو چراغاں کا ایک بیج ہے۔ یہ تماشا کسی وقت دکھا دونگا۔ (یعنی سینہ کو چیر کر ثابت کر دکھاؤنگا۔) اگر مجھے زمانے نے کچھ فرصت دی یعنی (ابھی تو دل کا رونا پڑا ہے۔ تماشوں کے لئے فرصت ہی کہاں (تخم۔ بیج یا اصل کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے فلاں شخص ایک تخم حرام ہے۔ گویا بڑا حرامی ہے۔ اسی طرح یہاں دل کے داغ کو تخم سرو چراغاں کہا گیا ہے۔ گویا وہ مجسم سرو چراغاں ہے)

(۵۳) آئینہ خانہ۔ مکان میں ایک ایسا کمرہ جہاں قد آدم آئینے لگا دئے گئے ہوں۔ تاکہ سر سے پاؤں تک صورت دکھائی دے۔ نقشہ کیا۔ یہاں مراد بُرا حال کر دیا۔ جلوہ۔ عکس۔ یہاں مراد آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرہ کا جلوہ یا عکس ڈالنا۔ پرتو۔ عکس۔ پرتو خورشید۔ سورج کا عکس یا اس کی روشنی۔ تیرے جلوے نے (جبکہ تو آئینہ خانے میں اپنا منہ دیکھنے لگا۔ آئینہ خانہ کا ایسا بُرا حال کر دیا جیسے سورج کی روشنی شبنمستاں کا حال خراب) کر دیتی ہے۔ شبنمستاں سے مراد کوئی درخت۔ چمن یا شاخ وغیرہ جس پر شبنم پڑی ہو۔ مراد یہ کہ آفتاب کی روشنی سے شبنم پگھلتی ہے۔ اور تیرے جلوے سے آئینہ کا وہی نقشہ ہو جاتا ہے۔ گویا تیرا جلوہ ضیائے خورشید سے بھی زیادہ پُر اثر ہے۔ اور تو زیادہ حسین ہے۔

(۵۴) تعمیر۔ عمارت بنانا۔ دراصل تعمیر کے معنی عمر دراز کرنا ہے۔ لیکن عام طور پر کسی عمارت کا بنانا۔ یا کچھ تعمیر کرنا۔ یا کسی سے کچھ بننا بنانا۔ لہذا میری تعمیر سے مراد جو کچھ

مجھ سے بنتا بنا تا ہے۔ ضمیر۔ پوشیدہ۔ یا ضمیر میں ہونا۔ صورت خرابی کی۔ بربادی اور تباہی سامان۔ پس ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اس کا مطلب یہ ہے۔ مجھ سے جو کچھ بنتا بنا تا ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی صورت یعنی سامان یا سبب میری تباہی کا بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اکثر شارحین تعمیر سے انسان کا اپنا جسم مراد لیتے ہیں مگر تعمیر کے حقیقی معنی یہ نہیں ہیں۔ بلکہ زیادہ تر وہ ہیں۔ جو اوپر درج کئے گئے ہیں۔ تاہم یہ معنی بھی (میری تعمیر۔ میرا خاکی جسم) یہاں لئے جا سکتے ہیں۔ اب مصنف کا یہ دعویٰ کہ میری تعمیر میں کوئی نہ کوئی سبب میری بربادی کا ضرور ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت دوسرے مصرعے میں بطور استعارہ دیا ہے۔ کہ ؎

ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

یعنی ہیولیٰ یعنی وہ مواد جس سے کوئی چیز پیدا ہو۔ برق خرمن وہ بجلی کہ جو کھلیان (خرمن) پر گرے یعنی جو خرمن ہی سے مخصوص ہے۔ کہ جب خرمن پیدا ہو۔ تو وہ بھی آ موجود ہو۔ خون گرم۔ یا گرم خونی وغیرہ۔ لہو گرم ہونا۔ مراد محنت و مشقت۔ دہقان۔ دیہاتی۔ اب لفظی معنی تو اس مصرعے کے یہ ہیں۔ کہ ہر وہ بجلی (جو خاص کر) خرمن پر گرتی ہے یعنی برق خرمن اس کا ہیولیٰ (حقیقی مواد) دہقان کا گرم خون یعنی وہ محنت ہے۔ (جو کہ وہ کرتا ہے) مگر انہی معنی سے نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ پھر وہ خاص معنی اس مصرعے کے (جو اول مصرعے کے ساتھ منطبق ہو سکیں۔) یوں کئے جا سکتے ہیں۔ کہ دہقان کا گرم خون یا اس کی محنت جو خرمن کو پیدا کرتی ہے۔ اور خرمن سے برق خرمن کا وجود ہوتا ہے۔ (یعنی خرمن نہ ہو تو پھر برق خرمن کہاں) لہذا کسان ہی کا گرم خون برق خرمن کا سبب ہے۔ اور برق خرمن سے کھلیان (یا کسان کی پونجی) برباد ہو جاتی ہے۔ گویا خود اسی وجہ سے اسکی تباہی عمل میں آئی ہے۔ اب ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

(یہاں میری سے مراد انسان ہے۔ کیونکہ جو کچھ دہقان پر گذرا وہ ہر انسان کے لئے نظیر بن سکتا ہے۔) غالب نے ایک اور شعر میں بھی خون گرم اور برق خرمن کا مضمون اسطرح

باندھا ہے جس کے معنے عود ہندی میں دئے گئے ہیں۔ یعنی ؎

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے۔ برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

اس کے متعلق صفحات آئندہ ملاحظہ ہوں تو پھر مذکورہ بالا مفہوم بھی ذہن نشین ہو جائیگا۔

(۵۵) غالباً یہ شعر ایک ایسے واقعے کے اظہار کے لئے تصنیف ہوا ہے۔ کہ عاشق جنوں زدہ ہو کر اپنا گھر چھوڑ کر آوارہ سر ہو گیا ہے۔ اور اس کے دربان کی کوئی شخص خبر گیری نہیں کر سکتا لہذا وہ اب اس گھر کی گھاس کھود کے گذر اوقات کر رہا ہے۔ مطلب شعر۔ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کے کہتا ہے۔ کہ میرے گھر میں (بہ سبب میری آوارگی اور گھر ترک کر دینے کے) ہر طرف گھاس ہی گھاس پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ویرانی خانہ تو جا کر بطور تماشہ دیکھو۔ کہ اب میرا دربان جو گھر کا رکھوالا تھا۔ وہ اپنی روزی کے لئے اسی گھاس کو (جو اس کثرت سے وہاں اُگی ہے) کھودا کرتا ہے۔ مدار بہ معنی روزی کا دارومدار۔ شارحین غالب نے سبزہ سے مراد سبزۂ بیگانہ لی ہے۔

(۵۶) خون گشتہ۔ قتل کیا ہوا یا برباد شدہ۔ چراغ مردہ۔ بجھا ہوا چراغ۔ گور غریباں یہاں مسافر کی قبر مراد ہے۔ کیونکہ غریب بمعنی مسافر ہے۔ شاعر اپنی نسبت کہتا ہے۔ کہ میری خموشی (چپ چاپ بیٹھے رہنے) میں لاکھوں قتل شدہ تمنائیں چھپی ہوئی ہیں۔ (کہ جن کا میں اظہار نہیں کر سکتا۔ گویا میں بے زبان (یعنی جو بولنے کی طاقت نہیں رکھتا) مسافروں کی قبر کے بجھے ہوئے چراغ کی طرح ہوں۔ (کہ جو ہمیشہ بجھا رہتا ہے۔ اور خاموش اس لئے کہ اس قبر کی کوئی خبر گیری نہیں کرتا) لیکن اگر وہ چراغ جلایا جاتا۔ تو وہ بزبان حال ظاہر کر دیتا۔ کہ کس کی قبر ہے۔ اور یہی چراغ گور کی تمنا یا آرزو ہوا کرتی ہے۔

(۵۷) پرتو۔ عکس۔ نقش یہاں دل پر نقش یعنی گہرا اثر مراد ہے۔ خیال یار۔ دوست کا یا خصوصاً اس کے حسن و خط و خال کا نقش دل میں قایم رہنا۔ حجرہ۔ کوٹھڑی یوسف کا زندان۔ حضرت یوسف مصر میں جہاں قید کرلئے گئے تھے وہ قید خانہ۔ اب میرا دل (جو پہلے دوست کے حسن و جمال دیکھنے کے سبب ایسا ناخوش نہیں تھا) یوسف کے

قید خانے کا گویا حجرہ بن گیا ہے۔ کیونکہ اس وقت بھی جبکہ دوست کا حسن و جمال اس میں دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ محض اس کے خیال کے اثر کا ایک پرتو سا اس میں رہ گیا ہے۔ وہ حسن یوسف کا سا مجھ پر موثر ہے یعنی میرے دوست کے حسن کے خیال کی ایک جھلک بھی گویا حسن یوسف کے برابر ہے۔

(۵۸) تبسم۔ مسکرانا۔ جس سے آنکھیں کچھ جھک جاتی۔ رخسار قدرے اُبھرتے اور دانت ذرا نظر آنے لگتے۔ اور ہونٹ بھی کھلے ہوتے ہیں۔ لیکن تبسم پنہاں سے مراد وہ ہنسی کہ جس میں یہ سب علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ گویا ہونٹوں کے اندر ہی اندر ہنسنا تبسم پنہاں ہے۔ کہ جس کو چپکے چپکے ہنسنا کہتے ہیں۔ اب کوئی شخص چوری کرتا یا کوئی بیجا کام کرتا ہوا پکڑا جائے تو وہ بھی اپنی خفت چھپانے کے لئے دبے ہونٹوں مسکرایا کرتا اور تبسم پنہاں سے کام لیا کرتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے۔ کہ تم جو دن کو بھی میرے پاس نہیں آیا کرتے۔ یہ میرے سوتے وقت خواب میں میرے پاس آنا اور دبے ہونٹوں ہنسنا کیا معنے رکھتا ہے۔ اس سوال کا وہ خود ہی جواب دیتا ہے اسلئے کہ تم غیر یار رقیب کی بغل میں کہیں سو رہے ہو۔ اور اپنی خفت چھپانے کو چپکے چپکے ہنس رہے ہو۔

(۵۹) ہو پانی ہو جانا۔ اس جملے کو یہاں کسی اردو محاورے کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ اور نہ غالب کو ذوق یا اور شعرا کی طرح اردو محاورات کے نظم کرنے کا شوق تھا۔ وہ تو یہ دکھانا چاہتا ہے۔ کہ معشوق اپنے عشاق کو جب قتل کرکے خون بہاتا ہے۔ تو سمجھتا ہے۔ کہ اس نے کوئی خون نہیں بہایا۔ فقط پانی بہا دیا ہے۔ جو کہ ایک معمولی بات ہے۔ لہذا کہتا ہے۔ نہ معلوم آج اس طرح کس کس کو قتل کرکے تم نے عشاق کا خون پانی کرکے بہا دیا ہے۔ کہ جب اس پانی کی طرف تو نے دیکھا اس سے بکثرت قطرات تیری مژگاں (پلکوں کے بالوں) میں اٹک کر رہ گئے اور تو سرشک آلود ہو گیا۔ (یعنی جس طرح انسان رویا کرتا ہے۔ تیری مژگاں کے ذریعہ وہ پانی اُمنڈتا تھا۔ اور تو سرشک کو پونچھتا تھا۔ یعنی بار بار روتا تھا۔ یہ

"قیامت" ہے۔ یعنی بڑے ستم کا نظارہ ہے۔ کہ عشاق کا خون اسقدر بہا دیا۔

(۶۰) جادہ۔ پگڈنڈی۔ راہ رستہ۔ جادۂ راہ۔ کسی رستے کی پگڈنڈی جس پر سب لوگ چلا کرتے ہیں۔ اجزائے پریشاں۔ کتاب کے ورق ورق جزجن کو ایک شیرازہ یعنی بندھن کے ساتھ کتاب کی صورت جلد باندھی جاتی ہے۔ حل۔ اے غالب ہماری نظر میں یعنی ہم کو پیش نظر وہی راہ فنا کی ایک پگڈنڈی رہتی ہے۔ کہ جو دنیا کے اجزائے پریشاں کا ایک خاص بندھن ہے۔ یعنی اس دنیا کی تمام بکھری ہوئی چیزیں اور کیفیتیں ایک ایسی پگڈنڈی پر چل رہی اور بطرف فنا جا رہی ہیں۔ مراد یہ کہ ہم کو اپنا عالم عاقبت کبھی بھولتا نہیں ہے۔

حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا ۶۱ نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

۶۲ محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

(۶۱) یک بیاباں ماندگی ایک ایسا ہی مرکب جملہ ہے۔ جیسے کہ یک کوہ الم یا یک انبار غم وغیرہ۔ چونکہ بیابان ایک چوڑا چکلا جنگل ہوتا ہے۔ جو اگر سارا پیدل عبور کیا جاوے تو انسان سخت تھک جاتا ہے۔ اور ماندگی۔ تھکنا۔ تھکاوٹ۔ لہذا ایک بیابان ماندگی سے مراد بہت تھکنا۔ حُباب۔ بلبلہ۔ موجہ۔ پانی کا حرکت کرنا۔ موج کا پیدا ہونا۔ لہر۔ حباب موجۂ رفتار۔ راہ چلنے کی لہر کا بلبلہ۔ نقشِ قدم چلتے وقت زمین پر پاؤں کا نشان پڑنا۔ مطلب شعر۔ میرا شوق (جنگلوں میں مارے مارے پھرنے کا۔ ایک بیابان بھر تھکاوٹ سے بھی کبھی کم نہ ہوگا۔ (یعنی میں اسی طرح آوارہ سر بھرتا رہونگا۔) کیونکہ میں جب چلتا ہوں تو میرے قدم کا نشان میرے چلے جانے کی لہر کا بلبلہ بن جاتا ہے۔ (اور جس طرح بلبلہ ایک لہر کے اوپر خواہ کتنا دور چلا جائے بعض اوقات ٹوٹتا نہیں ہے۔ تو گویا وہ تھکتا نہیں ہے اسی طرح میں بھی نہیں تھکتا۔

ہوں۔ نہ میرا نقشِ قدم کہیں منقطع ہوتا ہے۔ اور میں اسی شوق میں محو رہتا ہوں۔

(۷۲) مجھے پہلے باغ میں جاکر پھولوں کو دیکھنے اور ان کی خوشبو لینے کا شوق تھا مگر اب یہ بے دماغی (بے اتفاقی ہے) کہ (اُلٹا) موجِ بوئے گل یعنی پھولوں کی خوشبو کے چلنے یا ایسی خوشبودار نسیم سے بیزاری ہوتی ہے۔ (ناک میں دم ہونا بیزار ہونا) گویا حالاتِ زندگی اسقدر بدل سے گئے ہیں۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی ۷۳ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی ۷۴ جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

---

(۷۳) سراپا۔ سر سے پاؤں تک مکمل۔ رہنِ عشق۔ کسی کی محبت میں گرو ہونا۔ اس میں محو ہونا۔ ناگزیر۔ جس سے مفر نہ ہو سکے۔ مجبوری کی حالت۔ اُلفتِ ہستی۔ زندگی کی محبت۔ برق۔ بجلی جو حاصل یعنی خرمن کو جلا دیا کرتی ہے۔ حاصل۔ خرمن یا کھیتی کا حاصل مثلاً گندم جوار۔ باجرا وغیرہ اناج۔ میں عشق میں گو مکمل محو ہو چکا یا غرقاب ہو چکا ہوں۔ (اور چاہئے کہ ایک عاشقِ صادق کی طرح اپنی زندگی کی کوئی پرواہ نہ کروں۔ مگر زندگی کی محبت میں بھی مجبور ہوں یعنی اس سے مفر نہیں ہو سکتا۔ اپنی میں برق کی (یہاں مراد عشق جو زندگی کے خرمن پر بجلیاں گراتا رہتا ہے۔ اس کی عبادت یا پرستش کرتا ہوں (۲) اور اپنے حاصل یعنی خرمن کا افسوس بھی کرتا ہوں۔ مطلب یہ کہ اگر عشق کیا جائے تو پھر زندگی کی پرواہ کرنا عبث ہے۔ حالانکہ میں عاشق بھی ہوں اور زندگی کا مکمل شیدا بھی۔

(۷۴) ظرف۔ برتن۔ یہاں مراد حوصلہ۔ خمار۔ اس حالت کو کہتے ہیں۔ کہ انسان نشہ اتر کر دوبارہ شراب مانگتا ہے۔ مراد طلب۔ تشنہ کامی۔ حلق کا تر نہ ہونا۔ پیاس۔ خمیازہ۔ جمائی۔ جیسے کسی چیز کی طلب ہو۔ تو اس کی یاد میں جمائیاں آیا کرتی ہیں

حاصل ہو۔ فارسی میں ایک محاورہ ہے۔ خمیازہ برکسے برداشتن۔ مراد اس کا خواہشمند ہونا یہاں مقصود یا یوں سمجھئے کہ ساحل کا خمیازہ" سے مراد دریا کے ساحل کا کسی چیز کو طلب کرنا۔ یعنی ساحل چونکہ خشک سا ہی ہوتی ہے، وہ دریا کے پانی کو طلب کرتی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ جسقدر دریا ساحل کی طرف چڑھا چلا آتا ہے وہاں کی پیاسی مٹی پانی کو پی جاتی ہے۔ اس لئے مصرعہ ثانی میں تشنہ کامی کہا۔ اور ویسے شرابی کا حلق بھی شراب کے لئے ہمیشہ پیاسا اور خواہشمند رہتا ہے۔ مطلب شعر۔ اے ساقی پیاس یا خواہش کی حالت میں ہر شخص کی طلب اتنی ہوا کرتی ہے۔ جتناکہ اس کا ظرف یا حوصلہ ہو۔ اگر تو شراب کا دریا ہے۔ یعنی بافراط شراب دے سکتا ہے۔ تو میں بھی اس دریا کے ساحل (کنارے) کا خمیازہ یعنی اور پانی طلب کرنے والا شخص ہوں۔ گویا تو جتنی شراب دے۔ میں بھی اتنا ہی خواہشمند رہتا ہوں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا ۷۵ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے ۷۶ یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز ۷۷ میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں ۷۸ طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ۷۹ ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ۸۰ ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

۸۱ تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

---

(۷۵) محرم۔ رازدار۔ بھیدی واقف۔ نوا ہائے۔ نوا گیت۔ نغمہ۔ نوا ہائے نوا کی جمع یعنی نغمے۔ حجاب۔ کسی چیز کا پردہ یا اس کے چھپانے کا باعث۔ ساز۔ طبلہ سارنگی۔ یا ستار وغیرہ باجے۔ ساز کا پردہ وہ کپڑا۔ جس کو کسی طبلے یا سارنگی پر ڈالکر چھپا الگ رکھتے ہیں۔ مطلب شعر۔ تو خود ہی راز کے نغموں کا بھیدی نہیں ہے

ہوں۔ نہ میرا نقشِ قدم کہیں منقطع ہوتا ہے۔ اور میں اسی شوق میں محو رہتا ہوں۔

(۷۲) مجھے پہلے باغ میں جا کر پھولوں کو دیکھنے اور ان کی خوشبو لینے کا شوق تھا مگر اب یہ بے دماغی (بے التفاتی ہے) کہ (اُلٹا) موجِ بوئے گل یعنی پھولوں کی خوشبو کے چلنے یا ایسی خوشبودار نسیم سے بیزاری ہوتی ہے۔ (ناک میں دم ہونا بیزار ہونا) گویا حالات زندگی اسقدر بدل سے گئے ہیں۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی ۷۳ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

۷۴ بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

(۷۳) سراپا۔ سر سے پاؤں تک کلیتہً۔ رہنِ عشق۔ کسی کی محبت میں گرو ہونا۔ اس میں محو ہونا۔ ناگزیر۔ جس سے مفر نہ ہو سکے۔ مجبوری کی حالت۔ اُلفتِ ہستی۔ زندگی کی محبت۔ برق۔ بجلی جو حاصل یعنی خرمن کو جلا دیا کرتی ہے۔ حاصل۔ خرمن یا کھیتی کا حاصل مثلاً گندم جوار۔ باجرا وغیرہ اناج۔ میں عشق میں گو کلیتہً محو ہو چکا یا مستغرق ہو چکا ہوں۔ (اور چاہیئے کہ ایک عاشق صادق کی طرح اپنی زندگی کی کوئی پرواہ نہ کروں۔ مگر زندگی کی محبت میں بھی مجبور ہوں یعنی اس سے مفر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا میں برق کی (یہاں مراد عشق جو زندگی کے خرمن پر بجلیاں گراتا رہتا ہے۔ اس کی تو عبادت یا پرستش کرتا ہوں۔ اور اپنے حاصل یعنی خرمن کا افسوس بھی کرتا ہوں۔ مطلب یہ کہ اگر عشق کیا جائے تو پھر زندگی کی پرواہ کرنا عبث ہے۔ حالانکہ میں عاشق بھی ہوں اور زندگی کا کلیتہً شیدا بھی۔

(۷۴) ظرف۔ برتن۔ یہاں مراد حوصلہ۔ خمار۔ اُس حالت کو کہتے ہیں۔ کہ انسان کا نشہ اتر کر دوبارہ شراب مانگتا ہے۔ مراد طلب۔ تشنہ کامی۔ حلق کا تر نہ ہونا۔ پیاس۔ خمیازہ۔ جمائی۔ جیسے کسی چیز کی طلب ہو۔ تو اس کی یاد میں جمائیاں سمجھنا کہ وہ

حاصل ہو۔ فارسی میں ایک محاورہ ہے۔ خمیازہ برکسے برداشتن۔ مراد اس کا خواہشمند ہونا یہاں "دریاؤں کے ساحل کا خمیازہ" سے مراد دریا کے ساحل کا کسی چیز کو طلب کرنا۔ یعنی ساحل چونکہ خشک مٹی ہوتی ہے۔ وہ دریا کے پانی کو طلب کرتی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ جسقدر دریا ساحل کی طرف چڑھا چلا آتا ہے وہاں کی پیاسی مٹی پانی کو پی جاتی ہے۔ اس لئے مصرعہ اول میں تشنہ کامی کہا۔ اور ویسے شرابی کا حلق بھی شراب کے لئے ہمیشہ پیاسا اور خواہشمند رہتا ہے۔ مطلب شعر۔ اے ساقی پیاس یا خواہش کی حالت میں ہر شخص کی طلب اتنی ہوا کرتی ہے۔ جتنا کہ اس کا ظرف یا حوصلہ ہو۔ اگر تو شراب کا دریا ہے۔ یعنی یا فراخی شراب پلا سکتا ہے۔ تو میں بھی اس دریا کے ساحل (کنارے) کا خمیازہ یعنی اور پانی طلب کرنے والا شخص ہوں۔ گویا تو جتنی شراب دے۔ میں بھی اتنا ہی خواہشمند رہتا ہوں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۷۵ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے ۷۶ یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز ۷۷ میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں ۷۸ طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ۷۹ ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ۸۰ ناخن پہ قرض اس گرۂ نیم باز کا

۸۱ تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

(۷۵) محرم۔ رازدار۔ بھید سے واقف۔ نواہائے۔ نوا گیت۔ نغمہ۔ نواہائے اس کی جمع یعنی نغمے۔ حجاب۔ کسی چیز کا پردہ یا اس کے چھپانے کا باعث۔ ساز۔ طبلہ سارنگی۔ یا ستار وغیرہ باجے۔ ساز کا پردہ وہ کپڑا۔ جس کو کسی طبلے یا سارنگی پر ڈالکر اسے بحفاظت رکھتے ہیں۔ مطلب شعر۔ تو خود ہی راز کے نغموں کا بھیدی نہیں ہے

یعنی قدرت جو جوراز تیرے سامنے بآوازِ بلند تجھے بتا رہی ہے ۔(جیسے کوئی بلند آواز سے نغمہ گاتا ہے) تو ان آوازوں کو سنکر محرم نہیں ہوتا ۔ یعنی ان کا مطلب نہیں سمجھتا ورنہ یہاں دنیا میں کوئی بات حجاب یا پردے میں نہیں ہے ۔ بلکہ جو پردہ ہے وہ بھی کسی باجے کے پردے کی طرح بہت جلد ہی اٹھایا جا سکتا ہے ۔ اور قدرت کے نغمے بآسانی سنے جا سکتے ہیں ۔ حاصل شعر یہ کہ قدرت کی کتاب سب کے سامنے کھلی ہے ۔ اور کوئی بھید اس کا چھپا ہوا نہیں ہے ۔

(۷۶) رنگ سے یہاں مراد معشوق کا بناؤ سنگار ۔ رنگِ شکستہ صبح سے مراد وہ حالت ہے ۔ کہ معشوق رات کو سو کر اٹھے ۔ تو صبح کو اس کا جوبن کچھ اترا سا ہوتا ہے ۔ بال بکھرے ہوئے منہ اور دانت وغیرہ دھوئے لائق اور چہرے پر غازہ ندارد ۔ بہارِ نظارہ ۔ دیکھنے کے لائق بہار ۔ یا تو طنز سے کہتا ہے ۔ کہ معشوقوں کا وہ وقت بھی دیکھنے کے لائق ہوتا ہے ۔(خصوصاً کوئی بازاری طوائف تو صبح کے وقت ایک عجیب بے ڈھنگی عورت دکھائی دیتی ہے ۔) یا شاعر کا مدعا یہ ہے ۔ کہ ایسے وقت بھی جبکہ معشوق بناؤ سنگار سے خالی ہو ۔ وہ عاشق کے لئے بوجہ محبت بہارِ نظارہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ پھر صبح کے وقت معشوق اپنے بناؤ سنگار میں جب مصروف ہو جاتا ہے ۔ تو عاشق کے لئے اس کی زلفیں ۔ چھاتیاں ۔ یا جوبن وغیرہ قدرے عریاں دیکھنا بڑا لطف دیتا ہے ۔ تو گویا وہ بہارِ نظارہ ہوتی ہے ۔ شگفتن ۔ شگوفے پھوٹنا ۔ گلہائے ناز ۔ ناز کے پھول ۔ مثلاً معشوق کا چہرے پر سرخی ملنا ۔ زلفیں سنوارنا یا جوبن نکھارنا وغیرہ جو صبح ہی کو کیا جاتا ہے ۔ مطلبِ شعر ۔ صبح کے وقت معشوق کا اترا ہوا جوبن ایک بہارِ نظارہ ہوتی ہے ۔ یعنی عشاق کے لئے بڑا پُر لطف سماں ہوتا ہے ۔ کہ اس وقت معشوق کے گلہائے ناز (یعنی بناؤ سنگار کے سازو سامان) بطور پھولوں کے شگفتہ ہونے لگتے ہیں ۔ جس کو دیکھکر ایک عاشق بہت لطف اٹھاتا ہے ۔

دوسرے معنی ۔ صبح کے وقت معشوق کا اترا سا جوبن بھی (طنز سے کہتا ہے) دیکھو

تو ایک عجیب بہارِ نظارہ ہوتی ہے ۔ غازہ ندارد ۔ بال بکھرے ہوئے ۔ شکل چڑیلوں کی سی ۔ تاہم یہی صبح کا وقت اس کے گلہائے ناز یعنی سازو سامانِ حسن یا جوبن کے پھولوں کے شگفتہ ہونے کا ہوا کرتا ہے ۔ کہ وہ بنتے سنورتے ہیں بہت خوشنما نظر آتا ہے ۔

(۷۷) غیر ۔ رقیب ۔ تیز تیز نظر ۔ یہاں گھور کے یا خوب غور سے دیکھنا مراد ہے ۔ کیونکہ دوسرے مصرعے میں مژہ ہائے دراز (تنی ہوئی پلکیں) کہا ہے ۔ جو صرف انہی دو حالتوں میں ہو سکتی ہیں ۔ تو اور رقیب کی طرف تیرا (بوجہ محبت کے) خوب بغور سے یا گھور کے دیکھنا) ادھر میں ہوں اور تیری ان لمبی اور تنی ہوئی پلکوں کا دُکھ کہ جن سے رقیب کی طرف تو متوجہ ہے ۔ گویا ایک عالم رشک کی تصویر کھینچی ہے ۔

(۷۸) صرفہ ۔ کفایت مدنظر ہونا ۔ ضبطِ آہ ۔ آہ کا منہ سے نکلنے دینا ۔ یعنی اس کو اندر ہی اندر ضبط کر رکھنا ۔ لقمہ ۔ کسی چیز کا یکبارگی نگل جانا ۔ نفس ۔ سانس ۔ یہاں مراد آہ کیونکہ وہ بھی ایک سانس کی صورت میں سینے سے نکلتی ہے ۔ جانگداز ۔ جان کو پگھلا دینے والا یا اس کو بھسم کر دینے والا ۔ مجھ کو اپنی آہ کے ضبط کرنے میں ایک گونہ صرفہ مدنظر ہے ۔ (تاکہ یہ زیادہ خرچ نہ ہو جائے ۔) ورنہ (میں اگر یہ صرفہ نہ کروں ۔ اور آہ کو جو ہمیشہ گرم ہوتی ہے ۔ بلا صرفہ خارج ہونے دوں تو) میں اپنی اس بھسم کر دینے والی آہ یا سانس کا ایک ہی لقمہ ہوں ۔ (اپنے آہ بھرنے کا ایک انداز دکھایا ہے)

(۷۹) بسکہ ۔ چونکہ ۔ جوشِ بادہ ۔ شراب کا جوش ۔ چونکہ شراب جب پیالے میں ڈال جاتی ہے ۔ تو بعض اوقات جھاگ چھوڑ کر پیالے سے گویا نکلی پڑتی ہے اسی مناسبت سے جوشِ بادہ کہا ۔ شیشے ۔ یہاں وہ پیالے جن میں ایسی شراب ڈالی گئی ہے ۔ اچھل رہے ہے ۔ چونکہ شراب شیشے سے نکلی پڑتی ہے ۔ گویا شیشے ہی اچھل رہے ہیں ۔(مبالغہ کیا ہے) گویا شراب کیا جوش کھا کے اُبلی خود شیشے ہی اُچھل پڑے ہر گوشہ ۔ کونہ کونہ ۔ ہر ایک مقام ۔ بساط یہاں فرش ۔ قالین یا دری وغیرہ جس کو بچھا کر اوپر شراب کے پیالے رکھتے ۔ اور شراب نوش کرتے ہیں ۔ سرِ شیشہ باز کا ۔

شیشہ باز۔ بازیگروں کا ایک فرقہ ہے۔ جو سر پر پانی اور شیشے رکھکر ناچتا ہے یہ بچتے ہیں مگر ٹوٹنے نہیں پاتے۔ مطلب شعر: چونکہ شراب کے جوش سے شراب کے پیالے گویا اُچھل رہے ہیں۔ (اور وہ پیالے ایک فرش پر جا بجا رکھے ہوئے ہیں) فرش کا کونہ کونہ (ان اچھلتے ہوئے شیشوں کے باعث) شیشہ باز۔ بازیگر کا ایک سر بن گیا ہے۔ (کہ جس پر سے شیشے اُچھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ٹوٹتے نہیں ہیں ؛؛ اس شعر میں محض شراب کا جوش اور شراب خوری کا ایک سین دکھایا ہے۔

(۷۰) کاوش۔ کاویدن سے کھودنا۔ کریدنا۔ یہاں دراصل وہ کاوش مراد ہے کہ زخم پر کھرنڈ آجائے۔ تو طبیعت چاہتی ہے۔ کہ اس کو بھی ناخن سے کھجلایا جائے۔ کھجلی ہونا۔ تقاضا کرنا۔ کسی کو مجبور کرنا۔ گرۂ نیم باز۔ گرہ سے مراد یہاں زخم کے منہ پر وہ کھرنڈ جو ایک گرہ سی ہوا کرتی ہے۔ گرۂ نیمباز یعنی زخم پر وہ آدھا کھرنڈ کہ جو کاوش کرنے یا کھجلانے سے آدھا باقی رہ گیا ہو۔ اور آدھا اُڑ گیا ہو۔ مراد عاشق کا زخم کبھی رو بصحت ہونا چاہئے میرا دل زخم کے کھرنڈ کو کھجلانے کا تقاضا کر رہا ہے۔ یعنی مجھے مجبور کر رہا ہے۔ کہ میں ایسا کروں۔ کیونکہ میرے ناخن پر یہ قرض ہے۔ (یعنی واجب نظر آتا ہے) کہ اس آدھے کھرنڈ کو بھی جو زخم دل پر باقی ہے۔ ناخن سے کھجلا کے اتار دیا جائے۔

(۷۱) تاراج ہوا۔ لوٹا گیا۔ دفینہ۔ خزینہ۔ اے اسد میرا سینہ کہ رازوں کے گوہروں کا خزانہ تھا۔ اس کو غم فراق نے لوٹ لیا۔ گوہرہائے راز۔ قیمتی راز۔ جیسے تصوف کے مسائل یا علم و ادب کے نکتے وغیرہ۔ مراد یہ کہ عشق کے غم میں انسان اپنے تمام اوصاف کھو بیٹھتا ہے۔ کاوش۔ کاہش۔ دفینہ۔ جو دفن کیا گیا ہوتا ہے۔ دونوں میں مناسبت پائی جاتی ہے۔

گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید ﴿۵﴾ پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال ﴿۶﴾ خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں ﴿۷﴾ زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا ﴿۸﴾ جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول ﴿۹﴾ آج اُدھر ہی کو رہیگا دیدہ اختر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال ﴿۱۰﴾ نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

(۸۰) اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

(۷۲) شاہنشاہ۔ بادشاہ دہلی (بہادر شاہ ظفر)۔ گنجینۂ گوہر۔ یہاں گوہر سے مراد شعر و شاعری۔ اور گنجینۂ گوہر مراد بادشاہ کے دربار کا دروازہ جہاں شعر و شاعری کا چرچا رہا کرتا تھا۔ محفل۔ بادشاہ کی بزم یعنی محفل دربار میں شعر و شاعری کا دفتر کھلا یعنی چرچا ہونے لگا۔ یارب اس شعر و شاعری کے دربار کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ یعنی شعرا کے استفادہ کے لئے یہ بزم قایم رہے۔

(۷۳) انجم۔ ستارہ۔ انجم رخشندہ۔ چمکتا ہوا ستارہ۔ منظر۔ نظارہ۔ تکلف سے۔ زیب و زینت کے ساتھ۔ بتکدہ۔ مندر۔ جہاں خوبصورت مورتیاں رکھی ہوں محفل۔ پھر رات ہوئی چمکتے ستاروں کا نظارہ دیکھنے میں آیا۔ اس زیب و زینت کے ساتھ کہ گویا کسی (خوبصورت مورتیوں والے) مندر کا دروازہ کھل گیا۔ کہ خوب رونق نظر آئے: تاروں بھری رات فی الحقیقت ایسی ہی نظر آیا کرتی ہے۔

(۷۴) دشنہ۔ خنجر۔ اگرچہ میں دیوانہ ہوں (اور دیوانے آدمی کو کچھ عقل نہیں ہوا کرتی [illegible] زندگی کی وہ بھی وقت ضرورت حفاظت کیا کرتا ہے۔ یا گو میں احمق سہی) پر کیوں دوست [illegible] کھاؤں۔ (کہ وہ میرے قتل کے درپے ہے۔ یعنی اس کی آستین میں [illegible] آخر کیوں فریب کھاؤں

یعنی اس کے پاس جاکر اپنا قتل کراؤں۔ مگر شارحین غالب نے لفظ نشتر سے یہ خیال پیدا کر لیا ہے کہ دوست خاہر اً تو نشتر لئے ہوئے ہے۔ کہ اس سے میری فصد کر کے میری دیوانگی کا علاج کرے مگر اس کے ساتھ وہ آستین میں خنجر بھی چھپائے ہوئے ہے۔ تو یہ گویا فریب ہے۔ میں لاکھ دیوانہ سہی۔ یہ فریب کیوں کھاؤں۔ ممکن ہے یہی معنی ہوں۔ مگر دوست کو کیا غرض پڑی تھی۔ کہ نشتر لے کے اپنے دیوانے عاشق کا علاج کرے۔ ایسا چارہ گار کرتا تو احباب کا کام ہوا کرتا ہے کہ جن کا یہاں کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ اغلباً پہلا مفہوم ہی درست ہے۔ اس شعر میں پنہاں کا لفظ کھلا کے ساتھ بطور تضاد مستعمل ہوا ہے۔ جو کہ شعر میں ایک خوبی ہوتی ہے۔ مگر اس سے مفہوم میں یہاں پیچیدگی واقع ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ یہ پنہاں کا لفظ محض بتقاضائے اظہار فریب دشنہ کے ساتھ لکھنا پڑا۔

(۵،) گو میں اس کی وہ باتیں (جواب مجھ سے وہ بے تکلف کر رہا ہے انکو) نہ سمجھ سکوں (کہ وہ کس نیت سے کر رہا ہے) اور اگرچہ اس کے (دل کے) بھید کو نہ پہنچ سکوں۔ مگر یہ بات کیا کم ہے (یعنی بہت بڑی بات ہے) کہ وہ پری چہرہ (معشوق) اب مجھ سے کھلا ہے۔ یعنی سابقہ خاموشی ترک کر کے اب مجھ سے بے تکلف ملنے جلنے لگا ہے۔ مراد یہ کہ عشاق کو معشوق کی ہر ادا خواہ مضر ہی ہو۔ بھلی معلوم ہوا کرتی ہے۔

(۶،) خیالِ حسن۔ یہاں مراد عشق ہے۔ کیونکہ عشق ہی میں زیادہ تر معشوق کے حُسن (مثلاً اس کی زلفیں۔ رخسار۔ ناز و غمزہ وغیرہ) کا خیال رہا کرتا ہے۔ اور یہی عشق ہے۔ مگر یہ عشق دنیوی یا مجازی ہے۔ حسنِ عمل۔ عمل کی خوبی۔ یہاں مراد نیک کام کرنا۔ جیسے عبادت۔ پابندیِ احکام دین وغیرہ حسنِ عمل کا سا خیال مراد (ایسے اعمال نیک یا اعمال صالح کا (جیسے کہ اوپر لکھے گئے ہیں) خیال رکھنا یا پابندی کرنا اس نیت سے کہ مر کر بہشت نصیب ہو۔ خلد۔ جنت۔ خلد کا در گور کے اندر کھلنا۔ اہل مذہب کہا کرتے ہیں۔ کہ جو شخص نیک کام کرے اس کی قبر میں جنت کی طرف سے ایک کھڑکی کھل جاتی ہے۔ مطلب شعر۔ اس معشوق کے عشق میں مجھے بھی اعمال صالح (عبادات و پابندیِ احکام وغیرہ) کا سا خیال صالح دامنگیر ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی (مجازی معشوق کی) متابعت کروں۔ تو مجھے بہشت ملیگا

چنانچہ وہ مجھے حاصل ہوا۔ اور میری قبر میں بہشت کی کھڑکی کا ایک دروازہ کھل گیا ہے۔

(۷،) منہ نہ کھلنا۔ یعنی محبوب کا برقع اوڑھ کے پردے میں ہو جانا۔ اور اس پردے کا نہ اُٹھانا یا اپنا منہ نہ کھلنے دینا۔ وہ عالم۔ وہ سماں یا خوبیٔ حسن و جمال کہ دیکھا ہی نہیں۔ کہ ایسا کبھی کسی کو نظر ہی نہیں آیا۔ بے مثل و بے نظیر۔ نقاب۔ برقعے میں سر کی طرف جو کپڑا ہوتا ہے، وہ نقاب کہلاتا ہے۔ اور عام معنے برقع۔ کھلا۔ سجا۔ باعث زینت ہوا مطلب شعر۔ معشوق کا منہ تو ابھی کھلا ہی نہیں۔ وہ پردے میں ہے۔ تاہم وہ سماں یا خوبیٔ حسن و جمال ٹپک رہی ہے۔ کہ جو کہیں دیکھی ہی نہیں گئی۔ (گویا بے مثل و بے نظیر ہے) لہذا زلف (جس سے معشوق کے چہرے کی طرف ایک نقاب سا پڑ کر اس کا چہرہ بہت بھلا معلوم ہوا کرتا ہے۔ اس) سے بھی زیادہ اس شوخ یا دوست کے منہ پر نقاب کھلا ہے۔ یعنی سجا ہوا ہے۔ یہ شعر عشق حقیقی کے متعلق ہے۔ کہ خدا جتنا چھپا رہتا ہے۔ اتنا ہی وہ اس کے چاہنے والوں کو زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ یہاں "اس شوخ" کا جملہ بظاہر معشوق مجازی سے خطاب کرتا ہے۔ لیکن دراصل وہ معشوق حقیقی ہے۔ کہ باوجود در پردہ ہونے کے آشکارا ہو رہا ہے۔

(۸،) دوست نے مجھے اپنے دروازہ پر رہنے یا پڑا رہنے کو کہا۔ یعنی اس کا اقرار کیا۔ مگر دیکھو کہ وہ یہ اقرار کر کے کیسے پھر گیا۔ یعنی جلدی پھر گیا۔ کہ جتنے عرصہ میں میں نے اس کے دروازہ پر بستر بچھانے کو کھولا۔ اور وہ بستر کھلا۔ (وہ بستر کھلنے کی قلیل مدت اتنی کم ہوتی ہے کہ شمار میں بھی نہیں آسکتی)

(۹،) شبِ غم فراق کی رات جو عاشق کے لئے بڑی بدنصیبی کا وقت ہوا کرتا ہے۔ بلاؤں کا نزول کہتے ہیں۔ کہ کسی کا ستارۂ قسمت اس کے برخلاف ہو تو اس پر بلاؤں کا نزول ہوا کرتا ہے۔ آج اُدھر ہی کو یہاں مراد ادھر زمین کی طرف نہیں۔ بلکہ آسمان کے اُدھر (جیسے کہ شعر کے معنی ذیل سے واضح ہوگا) دیدۂ اختر۔ ستارہ جب کرن چھوڑ کر جلدی جلدی چمکتا ہے۔ تو آنکھوں کے جھپکنے سے مشابہ نظارہ دیتا ہے۔ لہذا دیدۂ اختر ستارے کی آنکھ۔ مطلب شعر۔ شب فراق ایسی اندھیری یعنی تاریکی اور اندھیرے مچانے والی اور

ستم ڈھانے والی کیوں ہے۔ اس لئے کہ بلاؤں کا نزول ہے۔ اور آج اس شبِ فراق میں ستارے کی چمک کا رخ بھی زمین کی طرف نہیں۔ بلکہ ادھر آسمان ہی کی طرف رہیگا (پس جب عاشق کی طرف اس کا رخ ہی نہ رہا۔ تو ادھر اندھیری رات ہوگئی۔ دوسرے دیدۂ اختر زمین کے رخ نہ ہونے سے عاشق کا ستارہ بھی بدل گیا۔ اور اس پر بلاؤں کا نزول ہونے لگا۔ اور شب فراق اندھیر ہوگئی۔

(۸۰) میں غربت (مسافرت) میں کس طرح خوش رہوں۔ جبکہ حادثات کا یہ عالم ہو کہ میرا نامہ بر وطن سے میرا خط اکثر کھلا ہی لایا کرتا ہے۔ (اور خط کھلا بھیجنے کی رسم یوں ہے کہ جب کسی کے مرنے کی خبر کاغذ میں لکھی جاتی ہے۔ تو اس کو لفافہ میں بند نہیں کیا کرتے تاکہ سب کو آگاہی ہو کہ فلاں شخص مرگیا ہے۔ اور اس کے جنازے یا مرثیہ میں جلدی شریک ہو جانا چاہیئے۔)

(۸۱) اے غالب میں اس (پیغمبر) کی اُمت (قوم) میں سے ہوں کہ جس کے واسطے گنبدِ بے در یعنی آسمان جو گول شکل کا بے در گنبد ہے۔) شبِ معراج کھل گیا تھا۔ تو جب اس کے کام خدا کی مہربانی سے اس طرح پورے ہوتے تھے۔ تو پھر میرا کوئی کام (اس کی طفیل) کیوں بند رہیگا۔

غزل

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا ۸۲ شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام ۸۳ گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال ۸۴ یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو ۸۵ یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پرشور بےخوابی سے تھا دیوار جو ۸۶ واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی ۸۷ جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا ۸۸ یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا ۸۹ دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا ۹۰ تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ تھا ۹۱ خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکسترنشینی کیا کہوں ۹۲ پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ۹۳ ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

آج کیوں پرواہ نہیں اپنے اسیروں کی تجھے ۹۴ کل تلک تیرا ہی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا ۹۵ انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

۹۶ میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

---

(۸۲) سوزِ دل۔ دل کی سوزش۔ برقِ سوزِ دل۔ دل کی سوزش سے چونکہ دل پر داغ پڑ جاتا ہے۔ اور شعرا اس کو شعلہ کی طرح چمکتا ہوا کہا کرتے ہیں۔ اور برق بھی شعلے کی طرح چمکتی ہے۔ لہذا برقِ سوزِ دل کے یہی معنے ہوئے۔ زہرہ آب ہونا۔ مرعوب ہونا۔ شعلۂ جوالہ۔ جوالہ مکھی پہاڑ کا ٹکڑہ کی طرف ہے۔ جو آتش فشاں ہے۔ اور اس میں سے ہر وقت شعلے اُٹھتے رہتے ہیں۔ حلقۂ گرداب۔ گرداب یعنی بھنور کا حلقہ (چکّر) بحالتِ طوفان پانی میں بھنور کے چکّر جابجا دکھائی دیا کرتے ہیں۔ معنی شعر۔ رات کو میری سوزشِ دل کے شعلوں کی بجلی سے (یا اس کے شعلوں سے) ابر بھی مرعوب ہوگیا تھا۔ اور وہی برقِ سوزِ دل اس ابر نے جو طوفان برپا کیا تھا اس کے پانی میں مل گئی تھی پھر وہ شعلۂ جوالہ بنکر اس کے ہر ایک بھنور کے چکر میں بھی موجود تھی۔

(۸۳) واں۔ یعنی دوست کے ہاں۔ کرم کو۔ کرم فرمائی کے لئے یا میرے پاس آنے کے لئے۔ عذرِ بارش۔ یہ عذر کہ بارش ہونے والی ہے۔ یا ہو چکی ہے۔ اب کرم فرمائی نہ کر سکتے۔ عناں گیر۔ لگام کو روکنے والا۔ منع کر دینے کا سبب۔ خرام۔ ان کا ناز سے ... پنبۂ بالش۔ تکئے کی روئی۔ کفِ سیلاب۔ طوفان کی جھاگ جو سخت زور کا پانی چلنے

تو اس پر نمودار ہوتی ہے۔ مطلب۔ دوست کے ہاں بارش کا بہانہ ان کی کرم فرمائی کا مانع تھا یعنی ان کے عنانِ خرام کو روک لیتا تھا۔ اور یہاں رونے سے جو طوفان برپا ہوا۔ اس کی جھاگ ہمارے تکیے کی روئی بن گئی تھی۔ گویا ہم طوفانِ آب میں مبتلا تھے۔

(۸۴) وہاں (دوست کو اپنی آرائش کے موتی پرونے کا خیال تھا۔ اور یہاں ہم ہجوم اشک (آنسوؤں کے غلبے) کی بدولت اس قدر رو رہے تھے کہ ان آنسوؤں میں ہمیں کچھ نظر بھی نہیں آتا تھا۔ یعنی تار نگہ نایاب تھا۔ چونکہ دیکھنے میں احتمال ہوتا ہے۔ کہ نظر ایک تار کی طرح آنکھوں سے نکلتی ہے۔ اسی لئے تار نگہ کہا ہے۔

(۸۵) جلوۂ گل۔ گلاب کے لال لال پھولوں کے جلوے یا پرتو نے وہاں آب جو (نہر کے پانی) کو چراغاں کر دیا تھا۔ یعنی اس قدر پھولوں کی سُرخ رنگت چمک اُٹھی تھی۔ بکثرت فرط گل۔ اور یہاں (ہمارے ہاں) روتی ہوئی آنکھ کی پلکوں سے خونِ ناب (خالص خون جو بہت سُرخ ہوتا ہے۔) جاری تھا۔

(۸۶) سرِ پُرشور (جنوں سے بھرا ہوا سر) یہاں بیتابی کے باعث ڈھونڈ رہا تھا کہ کوئی دیوار (جنگل میں) ہاتھ آئے تو اس سے سر پھوڑ کر جان کا خاتمہ کیا جائے۔ اور وہاں (دوست کے ہاں) یہ حال تھا کہ وہ فرق ناز (یعنی محبوب کا نازنین سر) کمخواب (ایک قیمتی ریشمی کپڑے کے بالین (تکیے) کا محو تھا۔ یعنی اس پہ آرام کر رہا تھا۔

(۸۷) یہاں میرا نفس (وجود) بزم بیخودی (بےخبری کی محفل) کی شمع روشن کر رہا تھا۔ یعنی میں اس قدر بےخبر اور مدہوش تھا کہ گویا بزم بیخودی کی روشن شمع تھا۔ اور وہاں پھولوں کا جلوہ (جو گلاب کے پھولوں کی سُرخی کی وجہ سے بہت پُرشکوہ ہوتا ہے) میرے محبوب کے دوستوں کی صحبت یا محفل کا فرش بنا ہوا تھا۔

(۸۸) اوپر کی تمام تفصیلات ختم کرنے کے بعد کہتا ہے۔ غرضیکہ وہاں دوست کے ہاں فرش (زمین) سے لے کر عرش (آسمان) تک رنگ (رنگ رلیاں یا عیش) کی موج (لہروں سے) ایک طوفان کا عالم تھا یعنی وفور سامانِ عشرت تھا۔ اور یہاں ہمارے ہاں زمین سے آسمان تک صرف سوختن کا باب تھا۔ یعنی جو کچھ تھا سب ہمارے دل جلانے کا ساز و سامان

تھا۔ یا سوختن کا باب جیسے آہ سوختہ شدم۔ سوختم۔ سوختہ بودہ۔ می سوزم وغیرہ وغیرہ۔ گویا کتابِ سوختن کا ایک دفتر۔

(۸۹) ناگہاں (دفعتہً) اس رنگ سے (اس نمونے پر جیسا کہ اشعارِ ذیل سے واضح ہوگا۔) میرا دل لوٹنا جیسے آفتابہ۔ خون کا برتن بہانے لگا۔ کیونکہ میرا یہ دل (زخم دل پر) ناخن کی کاوش (کھجلانے) کے شوق کا لذت یاب تھا۔ یعنی زخم دل پر جو کھرنڈ آیا تھا۔ اُس کو چھیلا اور بکثرت خون بہنے لگا۔ اور اس طرح میرا دل گویا خون کا ایک برتن بن کے بہنے لگا ہے۔

(۹۰) نالۂ دل (دل کی آہ وزاری) میں رات اثر کا انداز (ڈھنگ) بالکل نہیں پایا جاتا تھا۔ کیونکہ گو بظاہر میرا دل بیزار سا نظر آتا تھا۔ جس سے میں متاثر ہو کر روتا تھا۔ اور آہ وزاری کرتا تھا۔ مگر حقیقت میں وہ میرے رقیب کی محفلِ وصال کا سپند (عود یا ہرمل) بنا ہوا تھا یعنی وہ رقیب یا دوست کی محفل کی رونق تھا۔ لہٰذا میرے کام کس طرح آ سکتا تھا۔

(۹۱) مقدم (آنا) سیلاب (طوفان) طوفان کے آنے سے میرا دل کس قدر نشاط آہنگ ہے۔ (خوش ہو رہا ہے) نشاط کے معنی خوشی۔ آہنگ۔ رنگ ڈھنگ۔ مگر شاید کہ) عاشق کا گھر صدائے آب (طوفان کے شور یا نغمے) کا ساز (پردہ) تھا۔ گویا جبکہ ساز مثلاً ستار۔ سارنگی طبلہ وغیرہ باجوں پر کپڑے کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ تو اس کے اندر ساز کا ہونا اور عاشق کے گھر کے اندر ویرانی کرنے کو طوفان کا آنا اور شور کرنا ایک ہی قسم کے اسباب ہیں۔

(۹۲) میں اپنی خاکستر نشینی یعنی انگ بھبوت رمانے (یا جوگ کی مشق کرنے) کی مدت کے فخر کا حال کیا بیان کروں۔ اس وقت میرے اندیشے (خیال یا محسوسات) کا پہلو گویا سنجاب (ایک قسم کی نرم پوستین) کے بستر میں لپٹا ہوا آرام کر رہا تھا۔ چونکہ عشاق جوگی بن جایا کرتے ہیں۔ اس خوشگوار زمانہ کا حال بیان کیا ہے۔

(۹۳) مصرعہ اول "پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا" ... "کی اپنے جنونِ نارسائے ورنہ یاں" یہ مصرعہ بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ جو سب مطبوعہ دیوانوں میں چلی آتی ہے۔ چنانچہ نسخہ حمیدیہ دیوان غالب میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ مصرعہ یوں ہو۔

سے کچھ نہ کی اپنے جنوں نے آہ رسائی ورنہ یاں" اس میں "کچھ نہ کی" کا جملہ داخل کرتا ہے کہ رسائی کا لفظ کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ لہذا بہترین اصلاحی مصرعہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ "کچھ نہ کی اپنے جنوں نے آہ رسائی ورنہ یاں یعنی ہمارے جنوں نے جو کسی مقصد کو نہ پہنچی) آہ کچھ رسائی حاصل نہ کی۔ ورنہ یہاں ایک ایک ذرہ اس جہان کو چمکانے یا فیض رسانی پہنچانے والے آفتاب کا رزم کش (مُنہ چھڑا دینے والا یعنی اس کا مدِ مقابل) بن گیا تھا۔ اپنی نارسائی شوق کا شکوہ کیا ہے۔ (۹۴ و ۹۵) یہ دو شعر قطعہ بند ہیں۔ سے

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے — کل تلک تیرا بھی دل مہر ووفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا — انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

آج کیوں تجھکو اپنے اسیروں (فدائیوں) کی پرواہ نہیں ہے۔ حالانکہ کل تلک (قبل ازیں) تیرا بھی دل محبت اور وفا شعاری کا باب (یعنی دروازہ یا سرچشمہ تھا) تو یاد کر وہ دن جبکہ تیرے دام (مراد زلف) کا ہر ایک حلقہ (زنجیر زلف یا ایسے بالوں کا کنڈل) اپنے صید (شکار یعنی عاشق) کے انتظار میں گویا ایک بے خواب آنکھ (جو حلقہ زنجیر کی طرح ہمیشہ اور کھلی ہوتی ہے) بن گئی تھی۔ مطلب یہ کہ پہلے تو عشاق طلب تھا۔ اب عشاق تیری طلب کرتے ہیں۔

(۹۶) میں نے رات غالب کو روک دیا (کہ زیادہ آنسو نہ بہا) ورنہ اس کے سیلِ گریہ (آنسوؤں کے بہاؤ میں یا آنسوؤں کی طوفانی رو میں گردوں (آسمان بھی کفِ سیلاب (ایک طوفان کی جھاگ) بن گیا ہوتا۔

غزل

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب ۹۷ خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو ۹۸ توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں ۹۹ جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال ۱۰۰ ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

۱۰۱ کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب

دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

(۹۷) مجھے ایک ایک قطرہ (خونِ جگر) کا حساب دینا پڑا۔ (یعنی میرے جگر میں دوست کی ایک ایک پلک کے گڑنے سے جب خون کے جداگانہ قطرے گرتے ہیں۔ تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔) کہ میرے جگر کا خون اسی دوست کی پلکوں کی ودیعت (مال، امانت) تھا۔ (جو کہ اس نے یوں ایک ایک کرکے گن لیا۔ اور واپس لے لیا)۔

(۹۸) ایک شہرِ آرزو جیسے یک انبارِ غم یا یک بیابانِ ماندگی (دیکھو شعر ۷۱) مراد تمناؤں کا ایک شہر۔ آئینہ تمثال دار (دال کے ساتھ) یعنی وہ چونکنے والا شیشہ کہ جو تصویر کا عکس اپنے اندر رکھتا ہو۔ اس آئینہ تصویر کو توڑا نہیں کرتے۔ بلکہ بحفاظت مکان میں رکھا کرتے ہیں۔ آئینہ کے صدہا معنی ہیں۔ اور ایک معنی آئینہ دل بھی ہیں۔ جو یہاں مستعمل ہیں۔ مطلب یہ کہ تو نے جو ایک آئینہ دل (یعنی میرے دل کا آئینہ) کہ تمثال دار تھا (یعنی اس میں تصویریں رکھی جاتی تھیں۔ اور وہ تصویریں میرے دل کی آرزوئیں تھیں) توڑ دیا۔ اب میں ہوں اور ایک ماتم شہرِ آرزو کا یعنی اپنے دل کا کہ جو بوجہ کثرت آرزو ایک اچھا خاصہ شہر تھا۔

(۹۹) میری لاش کو اب گلیوں میں کھینچے لئے پھرو۔ کیونکہ میں جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا (ہوا یعنی ہوس یا عشق و بدمستی۔ سرِ رہگذار۔ سڑک کے کنارے پر یا لہذا جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار۔ ایسی مستی یا عشق جو سرِ راہ رو بعمل ہو۔ اسکا متوالا تھا مطلب یہ کہ میں چونکہ ایک ایسا (ذلیل) عشق رکھتا تھا کہ جس میں میں نے سرِ راہ ہر کسی پر عاشق ہوکے جان دے دی تھی اب میرے مردے کو بھی راستوں یعنی گلیوں ہی میں کھینچے لئے پھرو۔ کہ میں اسی کا سزاوار ہوں۔ چونکہ ایک عاشقِ صادق ہر معشوق پر جو سرِ راہ گذرتا ہو۔ عاشق نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ ایسا کام کرنا کسی بوالہوس آدمی سے ہوتا ہے۔ کہتا ہے۔ کہ میں بھی بوالہوس ہوں۔ میری لاش کی بے حرمتی کرو۔

(۱۰۰) موجِ سراب۔ سراب وہ عالم ہوتا ہے۔ کہ جنگل میں ریت کے ذرّے شعاعِ آفتاب

ے ٹل گرد و پیش ایسے نظر آتے ہیں۔ کہ گویا ایک نہر چل رہی ہے۔ موجِ سراب۔ ایسی سرابی
ری لہر۔ دشتِ وفا۔ وفا کرنے کا جنگل۔ موجِ سراب کے خیال سے کہتا ہے۔ کیونکہ سراب
یشہ دشت ہی میں ہوا کرتا ہے۔ ہر ذرہ۔ یعنی اس سراب میں جو ریت کام آتی۔ اسکا ہر ذرہ
ہر تیغ تلوار کے وہ نقش جن سے اس کی عمدگی ظاہر ہوتی ہے۔ آبدار۔ چمکیلا۔ مطلب شعر
شتِ وفا کے سراب کی لہر کا کچھ حال نہ پوچھو۔ وہاں ہر ذرہ ریگِ سراب کا تلوار کے جوہر کی
رح آبدار۔ (چمکیلا) تھا۔ قاعدہ ہے کہ یہ قریب وہ ریت کے ذرے جسقدر زیادہ چمکیلے
وتے ہیں۔ اسی قدر سراب زیادہ موثر ہوا کرتا ہے۔ لہذا سراب وفا جو ہر دار تلوار کی طرح
وثر اور عاشق کے لئے وبالِ جان تھا۔

(۱۰۱) ہم بھی غمِ عشق کو کم جانتے تھے۔ اس میں یہ اشارہ ہے۔ کہ عوام جو بوالہوس
ہوا کرتے ہیں۔ اکثر عاشق تو ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کو کم جانتے ہیں۔ یعنی اس کی مشکلات کا
شروع میں اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور ایسا ہی ہمارا بھی پہلے حال تھا۔ مگر اب دیکھا
یعنی عاشق ہوکے اس کا تجربہ کیا۔ تو معلوم ہوا کہ کم ہوئے یعنی عشق میں سخت خفیف و
ذلیل ہونے کے بعد عشق تو ایک غمِ روزگار ہے۔ یعنی زمانہ بھر کی گلوگیر ہے۔ بقول حافظ ؎

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

عام شارحین غالب نے اس شعر کے یہ معنی لئے ہیں۔ کہ غمِ عشق کو ہم پہلے بہت کم خیال
کرتے تھے۔ مگر جب اس میں تخفیف ہوئی یعنی عشق کا غم کم ہوا تو دیکھا کہ اب غمِ روزگار نے اس
کی جگہ لے لی۔ جیسے عشق میں ہم بھلائے ہوئے تھے۔ مگر اعتراض یہ ہے۔ کہ پہلے مصرعے میں "بھی"
کا لفظ کیوں آیا ہے۔ یہ تو ضرور مصنف کے عشق اور دوسروں کے عشق میں کچھ تمیز کرنے کو لایا
گیا ہے۔ چنانچہ مفہوم بالا سے خوب واضح ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۱۰۲ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی ۱۰۳ در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو ۱۰۴ آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے ۱۰۵ جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ ۱۰۶ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط ۱۰۷ تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا ۱۰۸ لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ۱۰۹ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(۱۱۰) حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

---

(۱۰۲) بسکہ (چونکہ) ہر کام کا آسان ہونا مشکل امر ہے۔ آدمی کے لئے بھی انسان بننا میسر نہیں ہے۔ یعنی ایسے ساز و سامان بہت کم ہاتھ آتے ہیں۔ کہ جن سے وہ انسان بنے۔ میسر۔ بیسر نا سے ہے۔ یعنی آسان کیا گیا۔ لہذا آدمی کو بھی میسر نہیں۔ یعنی یہ بات ہر آدمی پر کچھ آسان نہیں کی گئی۔ کہ وہ انسان بنے۔ کیونکہ آدمی بظاہر ایک وحشی حیوان ہے۔ جیساکہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر علم و ادب اور اخلاق وغیرہ سیکھ کر اور اچھے کام کرنے ہی سے انسان بنتا اور گویا اس میں انسانیت آتی ہے۔ لیکن یہ اوصافِ حمیدہ ہر شخص کو ہاتھ نہیں آتے۔ لہذا ہر آدمی انسان نہیں بن سکتا۔ یعنی ؎

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۱۰۳) خرابی۔ بربادی۔ ویرانی۔ بیاباں ہونا۔ ویران و برباد ہونا۔ میرا گریہ یا میرا رونا میرے کاشانہ (گھر) کی ویرانی چاہتا ہے۔ یعنی اس کے برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ (لہذا یہ گریہ سیلابِ اشک بہاکے میرے گھر کو ویران کر رہا ہے) اور میرے گھر کے در و دیوار سے بیاباں ہونا۔ یعنی ویرانی ہی ویرانی ٹپک رہی یا ظاہر ہو رہی ہے۔

(۱۰۴) افسوس یہ شوق یا عشق کی دیوانگی کہ (جس کے تقاضے سے) مجھے ہر دم آپ ہی اُدھر (یعنی معشوق کے کوچے کی طرف) جانا پڑتا ہے۔ اور پھر آپ ہی وہاں جاکے

حیران رہ جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ معشوق کچھ التفات نہیں کرتا دیوانگی یا جنوں میں ایک جنونی آدمی جو کچھ کیا کرتا ہے۔ کسی سے مشورہ کر کے نہیں کرتا۔ اس لئے وہ آپ ہی کرتا دھرتا اور بعد کو خود ہی پشیمان ہوتا ہے)

(۱۰۵) چونکہ جلوۂ یار دوست کا حسن تقاضائے نگہ کرتا ہے (کہ مجھے ضرور دیکھو کیونکہ حسین آدمی اپنے حسن کے دکھانے کا بہت شایق ہوتا ہے۔ لہٰذا گویا حسن ہی اس امر کی تحریک کرتا ہے۔ لہٰذا آئینہ سے۔ یہاں مراد صیقل شدہ آئینہ کا جوہر بھی (یا خط جو صیقل آئینہ سے نمایاں ہوتا ہے۔) چاہتا ہے۔ کہ وہ پلکوں کی شکل بن جائے۔ تاکہ اس کے ذریعے وہ معشوق کے جلوے کو دیکھ سکے۔ کیونکہ دوست کا جلوۂ حسن یہی تقاضا کرتا ہے۔ کہ سب اس کو دیکھیں۔

(۱۰۶) عشرتِ قتل گاہ۔ مقتل میں جو کچھ ہو اُس سے لطف اندوز ہونا۔ اہلِ تمنا عشاقِ آرزومند۔ عیدِ نظارہ۔ بہارِ نظارہ کی عید۔ عیدیں کئی اقسام کی ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً عید الضحیٰ۔ اور عید الفطر وغیرہ۔ یہاں عشاق کی عیدِ نظارہ۔ حقل عشاقِ آرزومند کو مقتل میں جو عیش و عشرت حاصل ہے۔ اس کی کیفیت کچھ نہ پوچھ۔ وہاں تلوار کا (ان کے قتل کرنے کے لئے) ننگا ہونا (یعنی نیام سے نکلنا) گویا ان کی عید بہارِ نظارہ ہے۔

(۱۰۷) ہم خاک میں اپنا داغِ تمنائے نشاط لے گئے۔ یعنی مجھ سے عیش و نشاط کی آرزو میں دل کو جو داغ لگ گیا تھا۔ آخر اُسی کو لے کے مر گئے اب تُو ہو اور آپ بصد رنگ (صد ہا طرح کے عیش مزوں میں) گلستاں ہونا۔ یعنی خوشی حاصل کرنا۔

(۱۰۸) پارۂ دل۔ دل کے گوشت کے ٹکڑے یا ٹکڑے کی عیش و عشرت۔ تمنا کا زخم کھاتا ہے۔ یعنی امید وصال پوری نہ ہو۔ اور اس کا داغ حاصل ہو۔ اسی طرح جگر کے زخم کی عیش یہ ہے۔ کہ وہ نمکداں میں غرق ہو جائے۔ (کیونکہ زخم پر نمک لگے تو وہ اس جگہ جلن پیدا کرتا ہے۔ اور جب زخم ہی کو نمکداں میں رکھ دیا تو اور بھی

زیادہ جلن اُس کو حاصل ہوگی)

(۱۰۹) اس نے مجھے قتل کر کے اپنے ظلم سے توبہ کر لی۔ ہائے اس زود پشیماں (جلدی پچھتانے والے) کا پشیمان ہونا۔ محض طنز سے کہا ہے۔ کہ وہ زود پشیماں ہے۔ حالانکہ نہ معلوم کتنے عرصے سے عاشق پر اس کی جفا ہو رہی تھی۔ کہ جس سے یہ مر گیا (گویا اس نے وقت پر توبہ نہ کی۔ جیسا کہ کرنی چاہیئے تھی۔ تاکہ عاشق کی جان بچ جاتی۔ تو یہ دیر پشیماں ہوتا ہے نہ کہ زود پشیماں ہونا)

(۱۱۰) کہتے ہیں غالب ایک مرتبہ کوتوالِ شہر کی شرارت سے قید کر لیا گیا تھا۔ تو اُس نے وقتِ رہائی اپنا کرتہ پھاڑ کر یہ شعر کہا تھا۔ کہ غالب اُس جا۔ گرہ کپڑے کی قسمت پر افسوس آتا ہے کہ جس کی قسمت میں کسی عاشق کے کرتے کا گریبان بننا ہو یعنی عاشق اور دیوانہ برابر ہوتا ہے۔ دونوں حالتِ جنون میں اپنے کرتے پر یہ آفت لایا کرتے ہیں کہ اس کا گریبان اپنے ہاتھ سے پکڑ کر چاک کر ڈالتے ہیں۔ (جیسا کہ مرزا نے اپنے گریبان سے سلوک کیا اور یہ شعر کہا)

غزل

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا ۱۱۱	تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا ۱۱۲	جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے ۱۱۳	خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن ۱۱۴	دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

(۱۱۵) نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

(۱۱۱) خمارِ شوقِ ساقی۔ ساقی کے شوق کا خمار۔ (اس کی طلب یا اس کے آنے کے شوق کا نشہ) رستخیز اندازہ۔ قیامت کا نمونہ بن رہا تھا۔ یعنی بہت زبردست تھا۔ محیطِ بادہ

اگر کسی شیشہ کے گلاس میں کوئی رنگدار شراب ڈال کر پئیں۔ تو جس حد تک گلاس کے منہ کی طرف اس شراب سے گلاس کے اندر ایک اندر گول سا نشان پڑ جائیگا۔ اسے محیط بادہ کہتے ہیں۔ یعنی بادہ یا شراب کا گول خط۔ صورت خانہ۔ صورت کا گھر۔ جیسے یہ محیط بادہ ایک صورت خانہ ہے۔ کہ کسی طرح کی شکل بن گئی ہے۔ خمیازہ۔ انگڑائی یہاں مراد شراب کی یاد میں جماہیاں لینا۔ رات ساقی کے (آنے کے یا طلب کے) شوق کا نشہ گویا قیامت ہو گیا تھا۔ یعنی اسقدر زیادہ تھا۔ کہ محیط شراب تک (یعنی شراب کے گلاس کے اندر کا گول گول خط بھی) اس کی یاد میں جماہیاں بھرنے کا ایک صورت خانہ (یا اظہار واقعہ کا نشان) بن گیا تھا۔

(۱۱۲) ایک قدم ایک سی جست۔ وحشت جنونیوں کی جولانی۔ امکان۔ وہ عالم ہستی جسے عالم بقا یا اگلا جہان سمجھتے ہیں۔ درس دفتر امکان کھلا۔ مراد اس دنیا سے دوسری دنیا میں جا کر وہاں کے حالات سے سابقہ پڑا۔ جادہ۔ بڑے رستے میں ایک چھوٹی راہ یا پگڈنڈی۔ اجزائے جزو کی جمع جز ہیں۔ دو عالم وحشت۔ یہاں مراد ایک عالم ہستی و نیستی یعنی یہ دنیا اور وہ اگلی دنیا۔ شیرازہ بندھن۔ چونکہ یہاں اجزا۔ درس اور دفتر کا ذکر کیا ہے۔ اسی مناسبت سے شیرازہ بھی نظم ہوا۔ اس نظم میں انسان کے عالم وجود سے عدم میں جانیکا ذکر ہے۔ مطلب شعر۔ وحشت یا دیوانہ وار جولانی کی ایک ہی جست کے ساتھ اس عالم فنا سے اُس عالم بقا کے درس کا دفتر کھلا۔ یعنی یہاں سے وہاں جاکر وہاں کے حالات کا حال کھلا۔ مگر انسان جس پگڈنڈی پر سے یہاں آیا تھا۔ وہ ان ہر دو عالم وحشت (وسیع دنیاؤں) کے اجزا کا شیرازہ یعنی بندھن تھا۔ حاصل شعر یہ کہ انسان ایک قدم وحشت کا بھر کے عالم فنا سے عالم بقا میں چلا جاتا ہے۔ اور جس پگڈنڈی سے وہ گذرتا ہے۔ وہ عالم ان دو عالموں کے درمیان گویا ایک قسم کا شیرازہ بندھن یا دونو کو اتصال دینے کا ذریعہ ہے۔

(۱۱۳) وحشت خرامی ہائے۔ گھبرا کر جنگل کی طرف بغرض تنہائی بار بار نکلنا۔ (خرامی ایک دفعہ چلنا اور خرامی ہائے۔ کئی بار چلنا) لیلی کے گھبرا کر جنگل کی طرف بغرض تنہائی بار بار نکلنے کا

کون مانع ہے۔ صحرا گرد۔ (جنگل میں پھرنے والے) مجنوں کا گھر تو بغیر دروازہ کے تھا۔ یعنی جنگل مجنوں کا گھر سہی۔ مگر اس کا دروازہ کہاں۔ وہ تو صفا چٹ میدان ہے۔ مطلب یہ کہ گھر کا دروازہ اس لئے بنایا جاتا ہے۔ کہ جب ضرورت ہو۔ اس کو کسی اندر آنے والے پر بند کر دیا جائے۔ مگر مجنوں کے صحرا میں تو ایسا کوئی دروازہ ہی نہیں تھا۔ تو پھر لیلی ہر روز وہاں آ سکتی تھی۔ مگر وہ نہیں آتی تھی۔

(۱۱۴) حُسن سے مراد معشوق ہے۔ استغنا۔ بے پروائی۔ لہذا استغنائے حُسن معشوق کی لاپروائی۔ انداز۔ طریقہ۔ ڈھنگ۔ معشوق کی لاپروائی کے ڈھنگ کا حال نہ پوچھو۔ یعنی وہ کس طرح کی لاپروائی کرتا ہے۔ کہ وہ باوجودیکہ اسقدر حسین ہے۔ کہ اس کو بناؤ سنگار کی حاجت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی اس کا ہاتھ مہندی کا مرہون (گرو کیا ہوا) ہے۔ اور رخسار غازہ (سُرخی) کے ہاتھ رہن (گرو) ہے۔ گویا وہ محض لاپروائی سے ایسا کرتا ہے۔ ورنہ اس کو مہندی یا سُرخی کی ضرورت ہی کیا۔

(۱۱۵) میرے دل کے رونے نے میرے دل کے ٹکڑوں کے ورق تک برباد کردیئے۔ اب گویا میرا دل نہیں رہا۔ کہ کچھ ہوش ہو۔ اور فکر شعر ہو۔ لہذا میری یادگار نالہ (میرے غم عشق کی یادگار) ایک دیوان ہے۔ کہ جس کا کوئی ورق مرتب نہیں۔ اور شیرازہ تک نہیں بندھا۔

غزل

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا ۱۱۶ زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک ۱۱۷ ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ ۱۱۸ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں ۱۱۹ عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی ۱۲۰ یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ۱۲۱ ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

۱۲۲ ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھاویں گے کیا

(۱۱۶) سعی۔ تکلیف کرنا۔ زخم کا بھرنا۔ جب مرہم لگانے سے زخم کا گھاؤ بھر جاتا ہے اوراس پر کھرنڈ جم جاتی ہے۔ پہلے مصرعے میں "کیا" تحقیر کے لئے ہے۔ کہتا ہے کہ میرے دوست میرے ساتھ ہمدردی کرنے کے تقاضے کے سبب کیا تکلیف اُٹھائیں گے۔ (یعنی ان کی یہ تکلیف عبث ہے) کیونکہ جب تک میرے زخم کی مرہم پٹی کریں تب اس کا گھاؤ بھر جائیگا کیا میرے ہاتھ کا ناخن اس وقت تک اتنا بڑا نہ ہو جائیگا کہ اس بھرے ہوئے زخم کی کھرنڈ کو چھیل ڈالوں۔ حاصل شعر یہ کہ میں خود ہی اچھا ہونا نہیں چاہتا۔ تو پھر کوئی میرا علاج کیا کریگا۔

(۱۱۷) بے نیازی۔ لاپرواہی۔ بندہ پرور آپ کی لاپرواہی حد سے گذر گئی۔ کب تک ہم اپنے دل کا حال کہیں گے۔ اور آپ فرمایا کریں گے "کیا" "کیا" (یعنی کیا کہا پھر کہو)

(۱۱۸) اگر حضرت ناصح میرے پاس آئیں تو میرا دیدہ (آنکھ) اور دل ان کے فرش راہ ہوں گے۔ (یعنی ان کے رستہ پر میں اپنا دل اور آنکھیں بچھا دونگا) مگر کوئی مجھ کو یہ تو بتاؤ کہ (حضرت ناصح) مجھکو کیا سمجھائیں گے۔ یعنی میں کسی کی سننے ہی والا نہیں تو پھر کوئی مجھے نصیحت کیا کریگا۔

(۱۱۹) میں آج وہاں (دوست کے ہاں) تلوار اور کفن (سر سے باندھ کر) جاتا ہوں اب وہ میرے قتل کرنے کو کونسا عذر پیش کریں گے۔ (یعنی تلوار سے وہ مجھے قتل کر سکتے ہیں۔ اور میرے سر سے میرا کفن اُتار کے اس میں مجھے فوراً دفن کر سکتے ہیں)

(۱۲۰) اگر ناصح نے ہم کو (جنونی اور دیوانہ سمجھکر) قید کر دیا ہے۔ تو اچھا یوں ہی سہی (ہم قید میں پڑے رہیں گے) کیا ہمارے جنون عشق کے یہ انداز (رنگ ڈھنگ اس قید سے) چھٹ جائیں گے۔ (ہرگز نہیں قید کرنے سے عشق کا جنون دور نہیں ہوا کرتا۔)

(۱۲۱) خانہ زاد۔ گھر میں پیدا ہوا۔ مراد غلام۔ ہم تو زُلف کے خانہ زاد یا غلام ہیں۔ کیونکہ زلف زیادہ لمبی ہوا کرتی ہے۔ اور جب کنڈل مارے ایک خانہ سا بناتی ہے۔ لہٰذا اس کو خانہ زلف کہا کرتے ہیں۔ تو خانہ زاد زلف ایسا عاشق کہ گویا زلف کے گھر ہی میں پیدا ہوا تھا اور ان کا ابتدا ہی سے غلام بنا یعنی جو اس پر والا یا فریفتہ ہے۔ زلف کے ایسے کنڈل والے بالوں کو زنجیر زلف بھی کہا کرتے ہیں۔ حل۔ ہم زلف کے خانہ زاد غلام ہیں۔ زنجیر سے کیوں بھاگنے لگے۔ یعنی ہم زنجیر زلف کے تو پہلے ہی سے شیدائی ہیں۔ (ایک زنجیر کو جس سے کوئی قید کیا جاتا ہے۔ دیکھکر کیا بھاگ جائیں گے۔ اسی طرح ہم وفا کے گرفتار (قیدی) ہیں تو اب زندان (قید خانہ سے) کیا گھبرائیں گے۔ مطلب یہ کہ ایک دیوانے عاشق کو قید کا کیا ڈر۔

(۲۲) اب اس معمورہ یعنی بستی (مراد دلّی) میں غم محبت کا قحط ہے ہم نے مانا کہ دلّی میں رہیں تو ہم کھائیں گے کیا۔ یعنی دنیا میں ہر کوئی ایک دوسرے کا غم کھایا کرتا ہے۔ لیکن جب ایسی الفت کا قحط ہی ہو۔ تو کوئی کھائے کیا۔ نکتہ اس شعر میں یہ ہے۔ کہ جب قحط ہوتا ہے۔ تو سبکو کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔ تو گویا خود مصنف بھی کسی کا غم نہیں کھا سکتا۔ اور کوئی اُسکا بھی غم نہیں کھاتا۔ تو ایسے شہر میں کون رہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا ۱۲۳ اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا ۱۲۴ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ۱۲۵ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو ۱۲۶ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ۱۲۷ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ۱۲۸ جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ۱۲۹ غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے ۱۳۰ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ۱۳۱ نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ۱۳۲ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

۱۳۳ یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

---

(۱۲۳) ہماری یہ قسمت ہی نہیں تھی۔ کہ دوست کا وصال حاصل ہوتا۔ اگر اور زیادہ مدت جیتے رہتے تو یہی انتظار ہوتا (کہ اب وصال ہوتا ہے)۔ مگر یہ تو ہمارے نصیبوں ہی میں نہیں لکھا ہے۔

(۱۲۴) اگر تیرے وعدے پر ہم جیتے رہتے تو اے جاناں (معشوق) یہ جھوٹ جان (سمجھ) کیونکہ اگر تیرے وعدے کا ہمیں اعتبار ہوتا تو پھر (شادی مرگ ہو کر) خوشی سے مر ہی نہ جاتے۔ قاعدہ ہے کہ معشوق اکثر جھوٹے وعدے کیا کرتا ہے۔ تو عاشق اِن کا کبھی اعتبار نہیں کیا کرتا۔ اسی بنا پر یہ شعر کہا ہے۔

(۱۲۵) تیری نزاکت خلقی یا نزاکت یا نازکی سے میں نے جانا۔ کہ تو نے بودا اقرار کیا تھا۔ کیونکہ تو کبھی اس کو توڑ نہ سکتا۔ اگر یہ استوار (مضبوط اقرار) ہوتا۔ لطیفے کے طور پر کہتا ہے چونکہ تو نازک تھا۔ اس لئے نازک یعنی بودا اقرار کیا تھا۔

(۱۲۶) کوئی میرے دل سے پوچھے کہ تیرا نیم کش (بہت زور سے نہ کھینچا ہوا) تیر کیسا ہے۔ یہ خلش یا کاوش جو مجھے ہو رہی ہے۔ کب ہوتی۔ اگر تیر نیم کش نہ ہوتا اور جگر کے پار ہو جاتا۔ تیر نیم کش۔ جب زور سے تیر نہ چلایا جائے تو جس کو لگے اس کے اندر ہی اٹک کر قریباً نصف اندر اور نصف باہر ہوتا ہے۔ مگر پوری طاقت سے تیر چلایا جائے تو وہ جس کو لگے۔ اس کے جسم سے پار ہو جاتا ہے۔ لیکن آدھا تیر جب جسم میں اٹکا رہے تو سخت خلش یعنی درد ہوتا ہے۔ اور عشاق درد پسند ہیں۔ لہذا کہتا ہے کہ اس حالت کا لطف

کیا بیان کروں۔

(۱۲۷) یہ کہاں کی دوستی ہے۔ کہ میرا دوست ناصح بنا ہے۔ حالانکہ کوئی چارہ ساز یعنی میرے دردِ عشق کا علاج کرنے والا۔ یا میرا وہ رفیق کہ میرے ساتھ ہمدردی کر سکتا ہے میرا دوست ہوتا۔

(۱۲۸) شرار۔ چنگاری چقماق پتھر کو کسی اور پتھر سے مارو۔ تو اس میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ وہ شرار ہیں۔ اگر پتھر میں شرار کی بجائے وہ چیز ہوتی ہے۔ کہ جسے ہم غم سمجھتے ہیں۔ تو رگِ سنگ (پتھر کے رگ و ریشہ) سے وہ لہو بھی اس کثرت سے ٹپکتا۔ کہ جو پھر تھمتا ہی نہ سکتا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ غم پتھر تک کا بھی بوجہ شدت اثر کے خون بہا سکتا ہے۔

(۱۲۹) جاں گسل۔ جان توڑ دینے والا غم اگرچہ جان کو تباہ کر دینے والا یا گداز کر دینے والا ہے۔ مگر ہم کس طرح اس سے بچیں۔ اگر عشق کا غم نہ ہوتا تو روزگار اپنے پیٹ کا غم ہوتا جو کہ غم عشق کے سبب ہم بھلا چکے تھے۔

(۱۳۰) میں کسی سے کیا کہوں۔ کہ شبِ غم (فراق کی رات) کیسی ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ بہت بڑی بلا ہے۔ (کہ جس میں ہر وقت یہی خدشہ رہتا ہے کہ ہائے اب جان گئی۔ اب میں موا لہذا) مجھے اگر صرف ایک بار ہی مرجانا ہوتا (جیسے کہ سب لوگ مرا کرتے ہیں) تو یہ مرنا میرے لئے کچھ برا نہ تھا۔

(۱۳۱) ہم جو مر کے رسوا ہوئے (بے عزت ہوئے کہ ہر شخص یہی کہتا ہے۔ کہ فلاں فلاں پر عاشق تھا۔ اسی کے عشق میں مرا۔) کیوں نہ دریا ہی میں غرق ہو کے ڈوب مرے کہ ہماری لاش ہی نہ ملتی اور) نہ کبھی جنازہ اٹھتا۔ اور نہ ہمارا مزار بنتا۔ (یعنی ایسی رسوائی میں ہماری قبر بھی بنتی تو لوگ یہی کہا کرتے کہ یہ اس بدنام شخص کی قبر ہے۔

(۱۳۲) اسے (مراد خدا کو) کون دیکھ سکتا تھا۔ جبکہ وہ یکتا (بے مثل) یگانہ (واحد) ہستی ہے۔ یعنی اگر اس میں دوئی (دو ہونے کی) بو تک بھی ہوتی تو وہ کہیں دوچار ہوتا

یعنی کسی سے اس کو ملنے کا یا رُو در رُو ہونے کا اتفاق ہوتا (خدا کی وحدانیت پر مصنف نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے۔ اسی پر فخر کرتے ہوئے مقطع میں جو درج ذیل ہے کہتا ہے)۔

(۱۳۳) اے غالب یہ تصوف کے مسئلے (ایسے دقیق و اعلیٰ) اور یہ تیرا (سلیس) بیان ہم تجھ کو (ان کی واقفیت کے لحاظ سے) ولی گردانتے۔ اگر تو بادہ خوار (شرابی) نہ ہوتا۔

۱۳۴ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

۱۳۵ تجاہل پیشگی سے مدعا کیا — کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

۱۳۶ نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

۱۳۷ نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں — تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

۱۳۸ فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے — ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

۱۳۹ نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے — تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

۱۴۰ دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

۱۴۱ دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

۱۴۲ محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

۱۴۳ سن اے غارتگرِ جنسِ وفا سن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

۱۴۴ کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ — شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

۱۴۵ یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

۱۴۶ بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

(۱۳۴) ہوس کو۔ حرص کے تقاضے سے۔ نشاط۔ خوشی۔ نشاطِ کار۔ کام کرنے کی خوشی

اس لئے کہ کام کرنے سے روپیہ پیسہ ملتا ہے۔ کیا کیا۔ کس قدر۔ مرنا۔ کسی ہوس یا خواہش میں تکلیفیں اٹھانا۔ جیسے کہ کہا کرتے ہیں۔ وہ شخص دولت پر کس قدر مرتا ہے۔ یعنی کتنی ہوس ہے۔ مطلبِ شعر۔ حرص کے تقاضے سے کیا کیا نشاطِ کار ہے۔ یعنی کام کاج اور ان کے کرنے کی کس قدر خوشی ہے۔ اگر یہ مرنا (یعنی خواہش یا لالچ) نہ ہو۔ تو پھر جینے میں کسی کو لطف کیا آئے۔ یہاں "مرنا" بالمقابل جینا موت کے معنی نہیں رکھتا۔ بلکہ لالچ میں مرنا مراد ہے۔ کہ جس سے زندگی باوجود اس قدر محنتوں کے خوشگوار ہو جاتی ہے۔

(۱۳۵) تجاہل پیشگی۔ گویا ناواقفیت کو اپنا پیشہ بنا لینا یہاں قصداً تجاہل برتنا مراد ہے۔ سراپا ناز۔ سر سے پاؤں تک ناز و انداز سے بھرا ہوا۔ بہت مغرور۔ اے سراپا ناز۔ تیرے اس قصداً تجاہل برتنے یا انجان بن جانے کا مقصد کیا ہے۔ ہم کب تک دردِ دل سنایا کریں گے۔ اور تو کہہ دیا کریگا۔ کہاں کیا کیا (گویا سنا ہی نہیں)

(۱۳۶) معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے۔ کہ آپ کی بیجا نوازشیں (مہربانیاں جو آپ رقیب کے ساتھ) کرتے ہیں میں دیکھا رہتا ہوں۔ اب اس کے متعلق اگر شکایت ہائے رنگیں یعنی استعارہ و کنایہ میں بھی کروں تو اس کا گلہ کیا۔ مطلب یہ کہ جو بات محض کنایتاً کہی جائے وہ اکثر پُر لطف ہوا کرتی ہے۔ مگر آپ تو وہ بھی سننا نہیں چاہتے۔ اور میری شکایت کرتے ہیں۔

(۱۳۷) محابا کے عام معنی بلا پس و پیش ہیں۔ مگر ایک معنی لحاظ یا مروت بھی ہے (ملاحظہ ہو غیاث اللغات) تغافل۔ غفلت۔ تمکین۔ خودداری۔ صبر سے بیٹھنا۔ جیسے صبر و تمکین۔ تمکین آزما خودداری یا صبر کا امتحان کرنے والا۔ کٹھن۔ حق۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ پر نظرِ مروت فرمایا کریں۔ یا بے تکلفانہ بلا پس و پیش میری طرف دیکھا کریں۔ مگر یہ کیا کہ آپ مجھ سے غفلتیں برتتے ہیں۔ اور وہ بھی صبر آزما غفلتیں۔

(۱۳۸) ہوس۔ یہاں مراد کسی بوالہوس آدمی کی ہوس۔ جو صرف اپنی غرض تک ہوا کرتی ہے۔ غرض کی۔ تو پھر کسی سے مطلب کیا۔ ایسا شخص کبھی وفا نہیں کرتا۔ کہتا ہے

کہ ایک بوالہوس آدمی کی ہوس کو وفا کرنے کے ناموس (عزت) سے تعلق یہ تو ایسی چیز ہے کہ جیسے خس (تنکے) کو آگ لگا دو۔ تو بس ایک شعلہ بھڑک کر (فروغِ شعلہ یعنی شعلہ کی روشنی ہو کر) خاتمہ ہو جائیگا۔

(۱۳۹) نفس۔ میرا وجود موجِ محیطِ بیخودی ہے یعنی بیخودی کے محیط (سمندر) کی ایک لہر ہے۔ بے ساقی کی غفلتوں سے شکایت کیا۔ یعنی اگر وہ شراب نہ دے تو میں خود ہی بیہوش ہوں اس کی ضرورت کیا۔

(۱۴۰) عطر پیراہن۔ خوشبو کا کوئی نہ پڑا ہوا۔ یہاں مراد خوشبو سونگھنے کا عادی۔ میرا دماغ خوشبو یہاں سونگھنے کا عادی نہیں۔ لہذا مجھ کو بیا یا نسیم کی (جو باغ کی خوشبو میں لت پت ہوا کرتی ہے) آوارگیوں کا پرواہ نہیں ہے۔ (میری) بلا سے وہ پائے جدھر جاتی ہے)۔

(۱۴۱) ساز۔ باجا۔ انا لبحر میں سمندر ہوں۔ ہر ایک قطرے کا دل گویا ایک باجا ہے جس سے انا البحر (میں سمندر ہوں) کی صدا نکلتی ہے (جیسے منصور نے کہا تھا انا الحق میں خدا ہوں) اس لئے ہم اس کے ہیں (یعنی خدا کے) ہمارا پوچھنا ہی کیا۔ (یہ شعر تصوف میں ہے جہاں جزو کو ہمیشہ کل کا شریک سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ہمہ اوست)

(۱۴۲) محابا۔ پس و پیش کرنا۔ تم کس وجہ سے پس و پیش کرتے ہو۔ (یا مجھے قتل کرنے سے جھجکتے ہو) اور دیکھو میں اس بات کا ضامن ہوں کہ تمہارے تیرِ نظر سے اگر میں شہید ہو گیا۔ تو پھر تم سے خون بہا (قصاص) نہیں لیا جائیگا۔ (کیونکہ میں تمہارا عاشق صادق ہوں) اور جو سچے عاشق معشوق کی نگاہ کے شہید (قتل کئے ہوئے) ہوں۔ ان کا خون بہا کیا یعنی وہ لیا ہی نہیں جاتا۔

(۱۴۳) شوخِ اے محبوب) وفائی جنس (چیز) کو غارت کرنے والے حسن۔ دل کی قیمت ٹوٹ جائے۔ (یعنی یہ کم ہو جائے) تو اس کی صدا کیا یعنی اس کی آواز نہیں آیا کرتی۔ مطلب یہ کہ ہر جنس یا چیز ٹوٹ کر صدا دیتی ہے۔ تو اس کا افسوس ہوا کرتا ہے۔ لیکن تو پرواہ نہ کر کہ وفائی جنس کی قیمت ٹوٹ کر (یعنی یہ گھٹ کر) کوئی صدا نہیں آئے گی کہ افسوس ہوگا۔ اس لئے بخوشی اسے توڑتا رہ اور بے وفائی کیا کر۔

(۱۴۴) جگر داری۔ ضبط و تحمل۔ کس (عاشق) نے اپنے ضبط و تحمل کا دعویٰ کیا۔ بھلا عاشق کے دل کا شکیب (صبر و تحمل) کیا یعنی یہ نہیں ہوا کرتا۔

نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

(۱۴۵) وعدۂ صبر آزما۔ یعنی ایسا وعدہ جس کے ایفا کے لئے عاشق کے صبر کی آزمائش ہوتی ہے۔ یہ شعر نثر میں یوں لکھا جا سکتا ہے۔ اے قاتل (تیرا) یہ وعدہ صبر آزما کیوں (یعنی تو کیوں ایسا کیا کرتا ہے) اور لے کا فر تیرا یہ فتنہ طاقت ربا کیا۔ یعنی یہ فتنہ (فتنۂ عشق) کس قدر ہماری طاقت کو کھینچنے والا یعنی زائل کرنے والا ہے۔ کہ جس سے ہم سخت کمزور ہو گئے ہیں۔

(۱۴۶) غالب اس کی ہر بات ہماری جان پر ایک آفت ہے۔ یعنی عبارت کیا (ان کی باتیں کرنا) اشارت کیا (اشارہ و کنایہ استعمال کرنا) اور ادا کیا یہ سب برابر ہی موردِ آفات ہیں (کیا سے مراد یہ بات یا وہ بات)

غزل

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا ۱۴۷ پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ۱۴۸ الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا ۱۴۹ روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیٔ چشمِ خوباں ۱۵۰ تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا ۱۵۱ خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا ۱۵۲ کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب ۱۵۳ حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ۱۵۴ کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

۱۵۵ تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں ۱۵۶ کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

(۱۴۷) درخورِ قابل جب کوئی اور شخص ہمارے جیسا آپ کے قہر و غضب (برداشت کرنے کے) قابل نہ ہوا، تو پھر کیا یہ بات غلط ہے۔ کہ ہم جیسا (یہاں) کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ یعنی ظلم برداشت کرنے میں ہم فرد ہیں۔

(۱۴۸) بندگی۔ عبادت۔ خود بیں۔ مغرور۔ اپنے کو بڑا سمجھنے والا۔ ہم بندگی جس کو بندگی بیچارگی کہا کرتے ہیں۔ یعنی عبادت اس میں بھی ایسے خود بیں (مغرور یا خوددار) ہیں کہ اگر کعبہ کا دروازہ (ہمارے لئے پیشتر اس کے کہ ہم آئیں) کھلا نہ ہو تو اُلٹے پھر آئیں۔ (گویا کعبہ کی بھی پرواہ نہ کریں) +

(۱۴۹) تیری یکتائی (بے مثل ہونے) کا دعویٰ سب کو منظور ہے۔ اسی لئے کوئی بت آئینہ سیما (یعنی محبوب آئینہ کا سا نکھار رکھنے والا) تیرے سامنے نہ ہو یعنی تیرا مد مقابل بننے کو نہیں آیا۔ آئینہ کا قاعدہ ہے۔ کہ اس میں دیکھیں تو عکس نظر آتا ہے۔ جو مد مقابل ہوتا ہے۔ مگر یہاں وہ محبوب آئینہ سیما ہے۔ اور اس کے مد مقابل ہونے کو کوئی نہیں آتا۔ مراد یہ کہ وہ محبوب خدا ہے۔ جو بے چون و چرا اور بے مثل ہے۔

(۱۵۰) نازش۔ فخر۔ ہم نامی۔ ایک ہی نام ہونا۔ چشمِ خوباں (معشوقوں کی آنکھ) جسے شعرا چشم بیمار بھی کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ معشوق بڑی ناپرواہی سے اپنے عاشق کو دیکھا کرتا ہے اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا جس طرح "بیمار" حالتِ نزع میں بالکل بے پرواہی سے کسی کو دیکھا کرتا ہے۔ ویسا ہی وہ بھی اپنے عاشق پر نظر ڈال رہا ہے۔ یعنی بیمار کی آنکھ کی طرح اور وہ "چشم بیمار" رکھتا ہے۔ اگر تیرا بیمار (عاشق) اچھا نہ ہوا۔ تو یہ فخر کیا کم ہے کہ وہ معشوقوں کی (چشم بیمار) کی ہمنامی رکھتا ہے۔ یا ان کا ہم نام ہے اور عاشق "بیمار" کہلاتا ہے۔

(۱۵۱) وہ نالہ (آہ و فغاں) جو لب تک نہ پہنچے۔ (اور دل ہی دل میں رہے) وہ ایک داغ ہے (یعنی دل پہ جو داغ ہوا کرتا ہے وہ اسی طرح بنتا ہے) اب اس نالہ نارسا کی طرح وہ قطرۂ آب ہے۔ کہ جو خاک کا رزق ہو گیا (یعنی مٹی کے منہ میں آگیا) اور دریا میں پہنچ کر دریا نہ بن گیا۔ مراد یہ کہ "نارسائی" میں زندگی تک بھی

غارت ہو جاتی ہے۔

(۱۵۲) یہاں نام اور کام کی لفظی مناسبت کے سبب کہتا ہے۔ کہ وہ دکھ میرے نام کا ہے (یعنی میرے ہی لئے مخصوص کیا گیا ہے) جو کہ کسی کو نہ ملا ہو۔ اور وہ فتنہ (یعنی مصیبت فساد یا ہرج کہ جس سے کام میں ہرج آئے) میرے ہی کام میں برپا ہوتا ہے۔ کہ جو اور کہیں کبھی برپا ہی نہیں ہوتا۔ +

(۱۵۳) ایک دوکاندار اپنے کمان کی تعریف کرتے وقت کہا کرتا ہے "اپنی لڑائی کا کھیل ہوا۔ کوئی دکاندار نہ ہوتی" اسی طرح غالب کہتا ہے۔ اگر عشق کا ذکر کرتے وقت ہر بال کی جڑ سے خالص خون نہ ٹپک پڑے تو وہ عشق نہ ہوا۔ کوئی امیر حمزہ کی داستان ہوئی (جو کہ بہت طول طویل ہے مگر اثر سے خارج)

(۱۵۴) یہ شعر بھی اسی طرح کا ہے۔ مراد یہ کہ اگر ایک قطرہ میں دجلے جیسا بڑا دریا دکھائی نہ دے۔ اور جزو میں کل تو ایسی آنکھ محض لڑکوں کا کھیل ہے (بالکل بے حقیقت) نہ کہ دیدۂ بینا یعنی اصلیت کو پرکھنے والی آنکھ +

(۱۵۵) دوسرا مصرعہ صحیح طور پر یوں ہے۔ ؎

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اکثر نسخوں میں "پہ" "چھپ گیا ہے۔ جو غیر فصیح ہے۔ یہ خبر گرم تھی یعنی بطور افواہ ہر جگہ سنا گیا تھا۔ کہ غالب کے آج پرزے اُڑا دیے جائیں گے (گویا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں گے) ہم بھی یہ تماشا دیکھنے گئے لیکن یہ تماشا واقع نہ ہوا۔ حاصل شعر یہ کہ افواہ اکثر درست نہیں ہوا کرتی۔ چنانچہ وہ جتنی زبردست ہو جیسی کہ یہاں بیان ہوئی وہ اور بھی زیادہ غلط ثابت ہوتی ہے۔ شارحین نے اس شعر کے طول طویل معنی لکھے ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ غالب ایسے سنسنی خیز مضمون سے صرف اتنا ظاہر کرنا چاہتا ہو۔ کہ عشاق کے ٹکڑے بھی اڑنے کی کبھی صلاحیں ہوا کرتی ہیں۔ جو معشوق کے لئے کچھ بعید امر نہیں ہے +

(۱۵۶) جنوں جولاں۔ بہ سبب جنون جولانیاں کرنے والا۔ یعنی دیوانگی میں بگڑ کر دوڑ لگانے والا

گدائے بے سروپا۔ ایسا فقیر جس کے سر اور پیر میں کچھ نہ ہو۔ یعنی بالکل تہیدست۔ سر پنجہ مُشتا۔ جس میں کوئی چیز بندھی ہو۔ مژگانِ آہو۔ ہرن کی پلکیں جو خوب واضح ہوتی ہیں۔ پشت خار۔ ایک لکڑی جو کہ فقیر اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اور اس سے اپنی پشت کو (بوجہ میل مٹی میں رہنے کے) جب اس پر گرد جمی ہو۔ تو رگڑ کر اتار دیا کرتے ہیں۔ اے اسدؔ ہم جنون کے باعث آوارہ پھرنے والے وہ تہیدست فقیر ہیں۔ کہ ہمارے پاس پشت خار تک بھی نہیں ہے۔ اور ہرن کی پلکوں کا مشتا ہی اپنا پشت خار ہے۔ مطلب شعر۔ یعنی ہم اس قدر بے سروپا ہیں۔ کہ پشت خار جو ہر فقیر پاس رکھتا ہے۔ وہ تک بھی نہیں۔ اور جنگل میں پھرتے پھرتے ہرن کی مژگاں سے پشت خار کا کام لیتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ ہرن بھلا اس طرح کب کسی کے کام آیا کرتا ہے۔ گویا شعر سامان کی طرف سے ہر طرح جواب ہے۔ بمصداق مثل ؎

براتِ عاشقاں برشاخِ آہو

غزل

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا ۱۵۷ بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا ۱۵۸ بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا ۱۵۹ چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر ۱۶۰ رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے ۱۶۱ مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے ۱۶۲ چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی ۱۶۳ عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

۱۶۴ نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے

کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

---

(۱۵۷) پئے۔ واسطے۔ نذرِ کرم۔ تیرے کرم یا بخشش کے عوض نذر کرنے یا اس پر قربان کرنے کے لئے نارسائی۔ نہ پہنچ سکنا۔ مراد عبادت کرکے تجھ تک رسائی حاصل کرنا۔ شرمِ نارسائی پہنچ نہ سکنے کی شرمندگی۔ بخون غلطیدہ۔ خون میں لتھڑا ہوا۔ یعنی بہت بُری طرح پامال کیا ہوا۔ صد رنگ دعویٰ پارسائی۔ سو سو طرح سے زہد برتنے کا دعویٰ۔ مثلاً نماز پڑھی اور دل میں خدا کا دھیان نہیں۔ کسی غریب سے کوئی مقصد نکال لیا۔ اور اس کی مزدوری اسے دی۔ اور بظاہر اسے زکات ظاہر کیا۔ گویا یہ سو سو طرح پارسائی کے طریقے ہیں لیکن درحقیقت فریب ہیں۔ اور ان سے خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ مگر عام اہلِ مذہب ایسی عبادتوں ہی کی بنا پر دعوائے پارسائی کیا کرتے ہیں۔ اور بہشت کے دعویدار بنتے ہیں۔ خدا سے خطاب کرکے کہتا ہے۔ میں تیرے کرم (بخشش) پر قربان کرنے کے لئے اپنی نارسائی کی شرمندگی کا تحفہ لایا ہوں۔ (یعنی اپنے آپ کو گنہگاری کی شرم کھاکے تیرے پیش کرتا ہوں۔ کہ تو بخشدے) میرا جو سو سو طرح کا دعویٰ پارسائی تھا (کہ جس کی بنا پر کوئی تجھ سے امید بخشش رکھ سکتا ہے۔) وہ خون میں لتھڑا ہوا ہے۔ یعنی اس کو میں پامال کر چکا ہوں۔ وہ ایسی چیز نہیں ہے۔ کہ جس کی بنا پر میں تجھ سے بخشش کی امید کروں۔ بلکہ وہ تو میری (تجھ تک نارسائی کا ایک تحفہ ہے) تحفہ اس لئے کہا کہ اپنی شرمساری گنہ کو خدا کے سامنے پیش کیا ہے۔ گویا اسے ایک تحفہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ کہتا ہے چونکہ تیری بخشش کے عوض میرے ہاں یہی ایک سب سے اچھی چیز تھی۔ یعنی دعویٰ پارسائی کی پامالی اسے تیرے نذر کر دیا ہے ✤

(۱۵۸) حسن مراد خوبصورتی یا اسبابِ حسن مثلاً آنکھوں کا رسیلا ہونا۔ دانت موتیوں کی طرح۔ ناک موزوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان پر ہر شخص کی نظر خواہ مخواہ پڑتی ہے۔ اس لئے کہا حسنِ تماشا دوست۔ وہ حسن جو کہ اپنے دکھائے جانے کو دوست رکھتا یعنی چاہتا ہے۔ کہ اس کی طرف سب کی نظریں اٹھیں اور یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ہر شخص چاہتا ہے۔ کہ وہ دوسروں کی نظر میں اچھا نظر آئے۔ چنانچہ لباس پہنتے ہیں تو خوبصورت شکل و صورت بناتے ہیں تو پسند ہیں۔ اب

جو شخص قدرتاً حسین ہو تو گویا اور بھی زیادہ اس حسن نمائی کا خواہاں ہوا کرتا ہے۔ تو یہ ایک قدرتی بات ہے۔ سی بنا پر کہتا ہے۔ چونکہ حُسن جو قدرتاً اپنی نمائش کو عزیز رکھتا ہے۔ اسے بے وفائی (یعنی کسی شخص سے تعلق رکھکر اوروں سے التفات نہ کرنے) کے لئے رسوا نہیں ہونا چاہئے۔ یعنی اس کا قصور کیا یہ تو ایک قدرتی امر ہے۔ کہ سب کی نظریں اس پر پڑیں۔ لہذا یہ (سب کی نظریں اس پر اٹھنا) صدہا مہریں ہیں۔ کہ جن کی بنا پر (حسن) اپنی پارسائی (مراد معصومیت اور بے گناہی کا) دعویٰ کر سکتا ہے۔ حاصل شعر یہ کہ حسین کو خدا ہی نے تو پیدا کیا۔ اگر اس پر فطرتاً سب کی نظریں پڑتی ہیں۔ تو گویا وہ سب کے لئے ہے۔ پھر اس پر کسی خاص شخص کے ساتھ متعلق رہنے کے لئے بے وفائی کا الزام کیوں لگایا جائے۔ وہ خود تو ایسا نہیں بن گیا۔ صد مہریں۔ دعوے کی مناسبت سے کہا ہے۔ کہ جس دعویٰ کے ثبوت میں صدہا مہریں ثبت ہوں وہ قابل تصدیق ہوتا ہے +

(۱۵۹) زکاتِ حُسن دینا۔ اس سے مراد یہ ہے۔ کہ معشوق سے کہتا ہے۔ تو میرے گھر میں آکر اپنے حسن کا جلوہ دے تو گویا یہ تیری دولتِ حسن کی زکات ادا ہوگی۔ جلوۂ بینش۔ دیکھنے کا جلوہ یا نور۔ مراد آنکھوں کا نور۔ مہر آسا۔ سورج کی طرح۔ چراغ خانۂ درویش ہو۔ یعنی فقیر کے گھر میں ایسا نظر آئے۔ جیسے چراغ کہ اگر یہ نہ ہو۔ تو خانۂ درویش بالکل تاریک و ویران دکھائی دے۔ کاسۂ گدائی۔ یہاں مراد قرصِ آفتاب جو گول گول فقیر کے کاسہ کی طرح ہوتا ہے۔ اے میری آنکھوں کے نور تو میرے گھر میں آ کہ گویا اپنی دولتِ حسن کی زکوٰۃ دے۔ جس طرح قرصِ آفتاب جو مانند کاسۂ گدائی ہے کسی فقیر کے گھر میں آکر یعنی اس میں چمک کر اس کو منور کر دیتا ہے۔ تو وہ فقیر کے گھر کا چراغ بن جاتا ہے۔ (ورنہ اس کے ہاں ویرانی و تاریکی ہی چھائی رہتی ہے) چونکہ مال زکات فقیر کے کاسے (لکڑی کے پیالے) میں ڈالا جاتا ہے۔ تو گویا یہ آفتاب (جس سے یہاں مراد حسنِ دوست ہے۔ اور وہ بشکل کاسہ ہے۔) خود مال زکوٰۃ سے کے فقیر کے جھونپڑے میں آتا ہے +

(۱۶۰) عشاق اپنے قتل کئے جانے کو بہت محبوب رکھتے ہیں۔ گویا سے

عشرتِ قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ

لہذا اگر ان کو معشوق قتل نہ کرے تو یہ اس کی قساوت ہے۔ یعنی بے رحمی میں داخل ہے۔ کیونکہ وہ زندہ رہ کر عشق کی سخت سخت مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ کہ جن سے مر جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ کہتا ہے اے قاتل (یا محبوب ظالم) تو نے مجھ کو بے جرم سمجھ کر قتل نہ کیا یا مارا نہیں ہے (تو یہ تیری قساوت میں داخل ہے)۔ اس لئے میں خیال کرتا ہوں کہ تو نے جو یہ حق دوستی ادا نہیں کیا۔ وہ اس طرح تیری گردن پر رہا۔ جیسے کسی بے گنہ کو مار دیا جائے۔ تو اس کا حق یا معاوضہ قاتل کی گردن پر رہتا ہے۔ مراد یہ کہ معشوق کو تحریک دلاتا ہے۔ کہ اپنے عاشق کو قتل کر کے حق دوستی ادا کر۔

(۱۶۱) تمنائے زباں۔ زبان کی آرزو جو یہی ہو سکتی ہے۔ کہ وہ کسی امر کا پیٹ بھر کر اظہار کرے۔ محو سپاس۔ شکریہ کرنے میں سر تا پا غرق۔ اب میری زبان کی آرزو (یعنی کوئی بات کہنا) اس بے زبانی یا چپ کے شکریئے میں محو ہے۔ کہ جس کی بدولت اپنی بے دست و پائی (تہیدستی و بے کسی) کے گلا کرنے کا تقاضا ہی مٹ گیا۔ یعنی جب مجھ پر چپ چھا گئی۔ تو کوئی تقاضا ہی کس طرح کر سکتا ہوں۔ اب گویا ایک صورتِ اطمینان حاصل ہو گئی ہے۔ ورنہ زبانِ شکوہ ہوتی۔ تو تجھ سے (مراد خدا سے یا اور کسی سے) اپنی بے کسی کا حال بیان کر کے ذلیل ہوتا۔ (یہ چپ جس کا یہاں بیان ہوا ہے۔ اس لئے لگی۔ کہ انتہائے غربت میں انسان دیوانہ سا ہو کے اس پر چپ ہی چھا جاتی ہے)

(۱۶۲) نفس۔ سانس یا وہ ہوا کہ جب ہم بولتے ہیں تو ہمارے گلے سے خارج ہوتی ہے۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ گلستاں کے شروع میں لکھتا ہے۔ کہ ہر ایک سانس یا نفس جو جسم سے باہر آتا ہے۔ یا اندر جاتا ہے۔ گویا خدا کی تعریف کرتا ہے۔ یہاں غالب لکھتا ہے۔ کہ میں جو رنگین نوائی (طرح طرح کے نغمے گاتا ہوں یا شعر کہتا ہوں) تو یہ میرے نفس کا تقاضا ہے۔ وہی اک بات ہے یعنی اس طرح کی ہے۔ نکہتِ گل

پھولوں کی خوشبو۔ چمن کا جلوہ۔ باغ کی جھلک یا نمود۔ مراد اس کی بہار۔ انسان چمن کی بہار دیکھکر طرح طرح کے نغمے گانے لگتا ہے۔ اسی طرح اس کا نفس (سانس کا آنا جانا باعث گویائی ہے تو) یہاں میرا نفس متقاضی ہوتا ہے۔ کہ میں رنگین نوائی کروں۔ اور وہاں (یعنی چمن میں) پھولوں کی خوشبو (جو کہ چمن سے میرے دماغ میں آتی ہے۔ اور جلوۂ چمن یعنی بہار بن جاتی ہے۔ اس کی وجہ) سے میں رنگین نوائی کرنے لگتا ہوں۔ تو یہ دونو چیزیں ایک ہی طرح کی ہیں۔

(۱۶۳) ہیچارہ جو۔ شکوہ و شکایت کرنے کو ڈھونڈنے والا یعنی قصداً کسی کا گلا کرنے والا (خواہ کوئی سبب ہو یا نہ ہو) زنجیر رسوائی۔ ایسی رسوائی میں جکڑا ہونا کہ کسی طرح مفر نہ ہو۔ عدم تک۔ جب تک کہ یہ دنیا مٹ کے عالم عدم نہ آوے۔ گویا ہمیشہ کے لئے۔ اے بیوفا عدم تک (یعنی جب تک اس دنیا کا خاتمہ ہوکر دوسری دنیا نہ آئے۔ یعنے ہمیشہ کے لئے تیری بے وفائی کا چرچا رہیگا۔ کیونکہ ہر معشوق جو ہیچارہ جو ہے۔ (یعنی اپنے عاشق کے برخلاف ڈھونڈ ڈھونڈ کر شکایتیں کرتا رہتا ہے۔) اس کا منہ اس کے لئے زنجیر رسوائی ہے۔ کیونکہ وہ جب عشاق کی شکایت کرتا ہے (حالانکہ عشاق اس کے مستحق نہیں ہیں تو گویا ایک نامناسب کام کرتا رہتا ہے۔ بلکہ اپنی بیوفائی کا اظہار کرتا ہے کہ اس کا دہن اس کے لئے ضرور ہمیشہ زنجیر رسوائی ہے۔ کیونکہ یہ منہ تو کبھی مرتے دم تک کسی سے جدا نہیں ہو سکتا۔

(۱۶۴) اے غالب تو اپنے خط کو اتنا طول طویل نہ لکھ (کیونکہ بہت لمبا چوڑا خط نازک معشوق کے لئے بار خاطر ہوگا۔ اور وہ مطلقاً توجہ نہیں کرے گا) صرف اتنا لکھدے کہ جدائی کے ستموں کو تیرے سامنے عرض (پیش) کرنے کے لئے حسرت سنج ہوں۔ یعنی اس خط میں صرف اسی حسرت کا یا ارمان دل کا بیان کرتا ہوں۔ (کہ تو میرے سامنے ہو اور میں اپنے دل کا دکھڑا روؤں)

گر بہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائیگا ۱۶۵ بے تکلف داغ مہ مُہر دہاں ہو جائیگا
زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب ۱۶۶ پرتو مہتاب سیل خانماں ہو جائیگا
لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر ۱۶۷ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا ۱۶۸ یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحاں ہو جائیگا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا ۱۶۹ مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا
گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط ۱۷۰ شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا
باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر ۱۷۱ ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ہو جائیگا
وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو ۱۷۲ اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا
۱۷۳ فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

(۱۶۵) اگر مجھ سے شب فرقت کا اندوہ (غم) بیان نہیں کیا جائیگا یعنی مجھے بوجہ غم ایسی چپ لگے گی کہ کچھ منہ سے بول ہی نہیں سکوں گا۔ تو اس چپ کا یہ سبب ہوگا کہ گویا شب فرقت میں جو چاند نکلا تھا اسی کا داغ (بے تکلف بلا تامل کہہ سکتے ہیں) میرے منہ کی مہر بن گیا ہوگا۔ منہ پر مہر ہونے کے معنی چپ رہنا ہے۔

(۱۶۶) زہرہ آب ہونا۔ طاقت جاتی رہنا۔ پتہ پانی ہونا۔ سیل۔ سیلاب۔ اگر ہجر میں شام ہی کو میرا پتہ ایسا پانی ہونے لگا۔ (تو ساری رات میں) تو چاند کا پرتو (عکس مراد چاندنی) میرے خانماں (گھر وغیرہ) کے لئے ایک طوفان بن جائیگا۔ یعنی رات بھر میں اس کا صفایا کر دیگا۔

(۱۶۷) چونکہ وہ جاگتے وقت مجھ کو اپنے پاؤں کا بوسہ لینے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ حالانکہ قدم بوسی کی ہر شخص اجازت دیتا ہے۔ لہذا میں اس کے سوتے ہوئے اس کے پاؤں کا بوسہ لوں تو سہی (گو یہ ایک معمولی سی بات ہے) مگر ایسی باتوں سے اس کافر کو بدگمانی پیدا ہوگی۔ (وہ یہ کہ وہ سمجھے گا۔ کہ میں

کسی بُری نیت سے اس کے اعضائے بدن کو چھونے لگا تھا)

(۱۶۸) صرفِ وفا ۔ مراد دوست سے وفائیں کر کر کے کہ جس کے لئے کچھ مدت درکار ہوتی ہے ۔ نذرِ امتحان ۔ یہاں مراد معشوق اپنے عاشق کو دیکھے ۔ تو وہ اس کے دیکھتے ہی (یعنی اس کا " امتحان " ہوتے ہی) اپنا دل کھو بیٹھے ۔ مل ہم سمجھتے تھے کہ وفائیں کر کر کے (ایک مدت میں) ہمارا دل صرف ہو گا ۔ یعنی ان وفاؤں کے بعد وہ ہمارا دل لے لیگا ۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا ۔ کہ یہ اس سے بہت پیشتر ہی اس کے نذرِ امتحاں ہو جائے گا ۔ یعنی آغازِ وفا ہی کے وقت ہم اس کو کھو بیٹھیں گے +

(۱۶۹) سب کے دل میں جگہ ہونا ۔ مقبول عام ہونا ۔ سب کو اچھا لگنا ۔ عام طور پر کہا کرتے ہیں ۔ کہ دوست مہربان تو کل مہربان ۔ اس شعر کا بھی یہی مفہوم ہے ۔ چونکہ سب کے دل میں تیری جگہ ہے ۔ یعنی تو مقبول عام ہے ۔ اگر تو راضی ہو ۔ تو مجھ پر گویا سارا جہان مہربان ہو جائیگا ۔

(۱۷۰) تعلیم فرماتی رہی یعنی مجھ کو سکھاتی رہی ۔ شعلہ خس میں نہاں ہونا ۔ یعنی گھاس پھوس کو آگ لگا دیں ۔ تو اس سے شعلہ بھڑک اٹھتا ہے ۔ لیکن اگر اس سے نہ بھڑکے تو گویا اس میں چھپ کر رہ گیا ۔ اگر تیری نگاہِ گرم (قہر کی نظر) مجھے ضبط کی تعلیم دیتی رہی ۔ یعنی میں اس سے مرعوب ہو کر ضبط کرنا سیکھتا رہا ۔ تو جس طرح میری رگوں میں خون چھپا رہتا ہے ۔ (یعنی تیرے رعب کے مارے اسی طرح) گھاس پھوس میں بھی شعلہ نہاں ہو جائیگا ۔ یعنی یہ غیر ممکن بات ہے ۔ مگر تیرے قہر کی گرم نگاہ سے یہ بھی ممکن ہو جائیگا ۔

(۱۷۱) مجھ کو باغ میں نہ لے جاؤ ورنہ ہر گلِ تر (گلاب کا لال لال تازہ پھول) میرا حال دیکھکر چشم خوں فشاں ہو جائیگا ۔ یعنی اس کی آنکھوں سے بھی لہو بہنے لگیگا ۔ مراد یہ کہ بہت افسردہ خاطر ہوں ۔ مجھے باغ میں کیوں لیجاتے ہو ۔ میر درد کا ایک شعر ہے ۔ ؎

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہووے دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

(۱۷۲) مشہور ہے کہ جس شخص کے ساتھ یہاں بے انصافی ہو ۔ اور وہ انصاف اس کو نہ ملے تو قیامت کے روز اس کو وہ انصاف دیا جائیگا ۔ کیونکہ وہ روزِ انصاف ہے ۔ آج تک یہی امید سب لوگ کرتے چلے آئے ہیں ۔ کہ وہاں (یہاں مراد محشر یا قیامت میں ہر شخص کا انصاف ہو جائیگا ۔ لیکن وہ بڑے افسوس کا مقام ہو گا ۔ اگر وہاں بھی (تو نے جو ظلم مجھ پر کئے ہیں ان کا) انصاف نہ ہو گا +

(۱۷۳) ایک مثل ہے نادان کی دوستی جی کا زیان ۔ کہتا ہے ۔ اے اسد آخر تو بھی دانا آدمی ہے ۔ (یعنی عشق کے حالات بہت جانتا ہے) سوچ کہ ایسی دوستی (جو کسی کمسن یا الھڑ معشوق سے ہو اس) میں کیا فائدہ ہے یہ نادان کی محبت آخر تیری جان کا نقصان کرا کے رہے گی ۔ ایک اور بات بھی مشہور ہے ۔ کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر +

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

کسی بُری نیت سے اس کے اعضائے بدن کو چھونے لگا تھا)

(۱۶۸) صرفِ وفا۔ مراد دوست سے وفائیں کر کرکے کہ جس کے لئے کچھ مدت درکار ہوتی ہے۔ نذرِ امتحان۔ یہاں مراد معشوق اپنے عاشق کو دیکھے۔ تو وہ اس کے دیکھتے ہی (یعنی اس کا "امتحان" ہوتے ہی) اپنا دل کھو بیٹھے۔ حل ہم سمجھتے تھے کہ وفائیں کر کرکے (ایک مدت میں) ہمارا دل صرف ہوگا۔ یعنی ان وفاؤں کے بعد وہ ہمارا دل لے لیگا۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ یہ اس سے بہت پیشتر ہی اس کے نذرِ امتحان ہو جائے گا۔ یعنی آغازِ وفا ہی کے وقت ہم اس کو کھو بیٹھیں گے +

(۱۶۹) سب کے دل میں جگہ ہونا۔ مقبولِ عام ہونا۔ سب کو اچھا لگنا۔ عام طور پر کہا کرتے ہیں۔ کہ دوست مہربان تو کل مہربان۔ اس شعر کا بھی یہی مفہوم ہے۔ چونکہ سب کے دل میں تیری جگہ ہے۔ یعنی تو مقبولِ عام ہے۔ اگر تو راضی ہو۔ تو مجھ پر گویا سارا جہان مہربان ہو جائیگا۔

(۱۷۰) تعلیم فرماتی رہی یعنی مجھ کو سکھاتی رہی۔ شعلہ خس میں نہاں ہونا۔ یعنی گھاس پھوس کو آگ لگا دیں۔ تو اس سے شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ لیکن اگر اس سے نہ بھڑکے تو گویا اس میں چھپ کر رہ گیا۔ اگر تیری نگاہِ گرم (قہر کی نظر) مجھے ضبط کی تعلیم دیتی رہی۔ یعنی میں اس سے مرعوب ہو کر ضبط کرنا سیکھتا رہا۔ تو جس طرح میری رگوں میں خون چھپا رہتا ہے۔ (یعنی تیرے رعب کے مارے اسی طرح) گھاس پھوس میں بھی شعلہ نہاں ہو جائیگا۔ یعنی یہ غیر ممکن بات ہے۔ مگر تیرے قہر کی گرم نگاہ سے یہ بھی ممکن ہو جائیگا۔

(۱۷۱) مجھ کو باغ میں نہ لے جاؤ ورنہ ہر گل تر (گلاب کا لال لال تازہ پھول) میرا حال دیکھ کر چشم خوں فشاں ہو جائیگا۔ یعنی اس کی آنکھوں سے بھی لہو بہنے لگیگا۔ مراد یہ کہ بہت افسردہ خاطر ہوں۔ مجھے باغ میں کیوں لیجاتے ہو۔ میر درد کا ایک شعر ہے۔ سے

نہ کہیں عیش تمھارا بھی منغص ہووے ——— دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

(۱۷۲) مشہور ہے کہ جس شخص کے ساتھ یہاں بے انصافی ہو۔ اور وہ انصاف اس کو نہ ملے تو قیامت کے روز اس کو وہ انصاف دیا جائیگا۔ کیونکہ وہ روزِ انصاف ہے۔ آج تک یہی امید سب لوگ کرتے چلے آئے ہیں۔ کہ وہاں (یہاں مراد محشر یا قیامت میں ہر شخص کا انصاف ہو جائیگا۔ لیکن وہ بڑے افسوس کا مقام ہوگا۔ اگر وہاں بھی (نوٹ جو ظلم مجھ پر کئے ہیں ان کا) انصاف نہ ہوگا +

(۱۷۳) ایک مثل ہے نادان کی دوستی جی کا زیان۔ کہتا ہے۔ اے اسد آخر تو بھی دانا آدمی ہے۔ (یعنی عشق کے حالات بہت جانتا ہے) سوچ کہ ایسی دوستی (جو کسی کمسن یا الھڑ معشوق سے ہو اس) میں کیا فائدہ ہے یہ نادان کی محبت آخر تیری جان کا نقصان کرا کے رہے گی۔ ایک اور بات بھی مشہور ہے۔ کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر +

درد منت کشِ دوا نہ ہوا ——— میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ——— اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ——— تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ——— گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی ——— آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ——— بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی ——— حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما ——— کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے ——— لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(۱۷۴) منت کش احسان مند۔ اگر میں اچھا نہ ہوا تو کچھ برا نہ ہوا۔ کیونکہ میرا درد (دکھ) دوا کا احسان مند نہ ہوا۔ یعنی میں کسی کا احسان برداشت کرنا پسند نہیں کرتا۔ اچھا ہے کہ اچھا نہ ہوا ⁂

(۱۷۵) میں تم سے کوئی گلا کرتا ہوں (مثلاً رقیب کا زمانے کا یا اپنی قسمت وغیرہ کا) تو تم رقیبوں یعنی غیروں کو کیوں اکٹھا کر لیتے ہو۔ کیا یہ بھی کوئی تماشا ہے۔ یعنی میرا شکوہ و شکایت کرنا ایک تماشا ہوا۔ غضب کا ہے نہ ہوا۔ مراد یہ کہ عاشق یہ چاہتا ہے کہ اس کے اور دوست کے معاملات میں اور کوئی شخص دخل نہ دے۔

(۱۷۶) دوست سے کہتا ہے کہ جب تو ہی خنجر آزما نہ ہوا۔ یعنی ہمیں قتل کر کے تو نے یہ نہیں آزمایا۔ کہ تیرا خنجر تیز ہے یا کیسا ہے۔ تو پھر ہمیں اوروں سے کیا امید ہو سکتی ہے۔ کہ ان کے ہاں جا کے اپنی قسمت کا امتحان کریں۔ مطلب یہ کہ جب معشوق ہی عاشق کو قتل نہ کرے (جو معمولی سی بات ہے) تو پھر ہماری قسمت ہی میں کچھ نہیں۔ اس کا امتحان کرنا فضول ہے۔

(۱۷۷) تیرے لب کس قدر شیریں ہیں یعنی تیرا لب و لہجہ کس قدر میٹھا اور دلآویز ہے کہ رقیب (جو تیرے ساتھ برابری کا دعویٰ کرتا ہے) وہ بھی تیری گالیاں کھا کے بے مزا نہیں ہوتا۔ یعنی کڑوا نہیں ہے۔ ایک مثل ہے۔ زبان شیریں ملک گیری۔ مگر یہاں عاشق اپنے معشوق کے طرزِ گفتگو کی جو اس قدر پُر اثر ہے تعریف کرتا ہے۔

(۱۷۸) ایک اردو مثل ہے "اور دن جنگی تہوار کے دن ننگی" کہتا ہے کہ دوست کے ہمارے ہاں آنے کی خبر سنی گئی ہے۔ اور آج ہی گھر میں بوریا تک بھی نہیں ہے۔ (مراد یہ کہ ایک چیز کی جب سخت ضرورت پڑے تو اس وقت وہ موجود نہیں ہوتی۔) یا ہم اس قدر محتاج ہیں کہ کسی خاص تقریب کے لئے ہمارے پاس کچھ موجود نہیں ہے۔

(۱۷۹) نمرود۔ ایک بادشاہ تھا۔ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اور وہ جھوٹا قرار دیا جا کر بہت ذلیل ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی بادشاہی میں مخلوق کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا کیونکہ فائدہ تو خدا ہی پہنچا سکتا ہے۔ جو کہ مالک کل ہے۔ مطلب شعر۔ جب زندگی میں یعنی بحالت ایک

بندہ ہونے کے یا انسان ہونے کے میرا بھلا نہیں ہوا۔ (مجھے کچھ اپنی زندگی سے سود نہیں، تو کیا اب بھی کوئی نمرود بادشاہ (ایک جھوٹا خدا) خدائی کر رہا ہے۔ کہ ایسا ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ اپنی نامیدی پر خدا کو بطور طنز خطاب کر کے پوچھتا ہے۔ کہ ایسا کیوں واقع ہوا ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ اگر بندگی کا مفہوم عبادت قرار دیا جائے تو شاعر کہتا ہے۔ کہ میری عبادت کی (یعنی اپنے خدا کے بر حق کی) اور میرا بھلا نہ ہوا (یعنی عبادت قبول نہ ہوئی۔ جیسے کہ اہل شرع کہا کرتے ہیں۔ کہ یہ امر خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ کہ وہ کسی کی عبادت قبول کرے یا نہ کرے۔) تو کیا یہ بھی کوئی وہ نمرود کی یعنی کسی جھوٹے خدا کی بادشاہی تھی۔ کہ ایسا ہوا۔ حالانکہ خدا کو تو انصاف کرنا پڑتا ہے۔ کہ ہر کسی کی محنت کا حق ادا کرے اگر نہیں کیا تو یہ کوئی خدا کی بادشاہت نہ ہوئی۔ نمرود کی ہوئی اس صورت میں شاعر نے اہل شرع کے دعوے کو جھٹلایا ہے۔ اور انھیں سے طنز آخطاب بھی کیا ہے۔

(۱۸۰) میں نے خدا کو جان دے دی۔ تو یہ دی ہوئی تو اسی کی تھی (پھر کیا ہوا حق بہ حقدار رسید مگر نہیں) حق تو یہ ہے کہ مجھ سے خدا کی اس نعمت کا جو اس نے مجھے دی تھی یعنی جان ایسی پیاری چیز۔ اس کا کچھ حق ہی یعنی شکریہ یا معاوضہ ہرگز ادا نہ ہو سکا۔ (زبان فارسی میں شکرِ نعمتِ حق کا جملہ عموماً سنا گیا ہے) پہلے حق کا مفہوم "سچی بات" دوسرا حق۔ حق ادائی کے معنی میں آیا ہے۔ اور خدا کی حق ادائی یہی ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اور یہ انسان کی طاقت سے باہر ہے۔

(۱۸۱) زخم اگر دب گیا (یعنی اس کا آماس بیٹھ گیا۔) تو چاہیے تھا۔ کہ اب لہو تھم جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ برابر چل رہا ہے۔ ایسے ہی میرا کام اگر رک گیا۔ تو اسے (میرے زخم کی طرح) چلنا چاہیے تھا۔ مگر وہ نہیں چلا۔ یعنی رواں نہیں ہوا۔ دوسرے معنی۔ زخم اگرچہ دب گیا ہے۔ لیکن لہو نہیں تھما ہے کام اگر رک گیا ہے۔ اس کے معنی زخم جو بوجہ دبنے کے بظاہر اچھا ہو رہا تھا۔ مگر در حقیقت ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ لہو نہ تھم سکا تو وہ گویا اچھا ہوتے ہوتے رک گیا ہے۔ لہٰذا یہ کام اگر رک گیا تو کچھ روا نہ ہوا۔ یعنی اچھی بات نہ ہوئی۔ زخم کو رو بصحت ہو جانا چاہیے تھا یہاں یہ مفہوم جائز

مناسب اور روا بات ہے۔ اور پہلے مصرعے میں گر معنی اگرچہ ہے۔

(۱۸۲) یہ ناہمزنی ہے (ڈاکہ) یا کہ دلستانی (شانِ معشوقیت) ہے کہ ہمارا دل وہ دلستاں (معشوق) لیتے کے ساتھ ہی روانہ ہو گیا۔ یعنی ڈاکو کا کام ہے۔ اسے تو ہمارا دل لے کے یعنی ہمارا محبوب بن کے ہمارے ساتھ کچھ رفاقت کرنی چاہیے تھی۔

(۱۸۳) کچھ تو پڑھئے۔ یعنی کوئی شعر سنائیے۔ کروٹ لیتے ہیں۔ آج غالبؔ نے کوئی غزل نہیں سنائی۔

غزل

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا ۱۸۴ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب ۱۸۵ مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی ۱۸۶ دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو ۱۸۷ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں ۱۸۸ کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ۱۸۹ ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے ۱۹۰ مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

۱۹۱ فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ

جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

---

(۱۸۴) میرے شوق یعنی عشق کو دل میں بھی جگہ کی تنگی کی شکایت ہے (باوجودیکہ دل میں زمانہ بھر کی کیفیتیں سما سکتی ہیں۔ اور ایک موتی جو چھوٹی سی چیز ہے۔ اس میں پورے دریا کا اضطراب محو ہے یعنی سمایا ہوا ہے۔ مراد یہ کہ گوہر کی چمک دمک ایسی ہوتی ہے۔ کہ جیسے دریا لہریں مارتا ہو۔ اور دریا کی لہریں ایک بے قرار آدمی کے ہاتھ پیر مارنے کے مشابہ ہوا کرتی ہیں۔ لہذا دریا کی لہریں گویا بے قراری کے سبب یا موتی میں سما گئی ہیں۔ مگر میرا عشق اتنا زیادہ وسیع ہے کہ

وہ دل جیسی وسیع جگہ میں بھی نہیں سما سکتا۔ اور اس کو تنگیٔ جا کا گلہ ہے۔

(۱۸۵) میں جانتا ہوں کہ تو اور میرے مکتوب (خط) کا پاسخ (جواب) یہ غیر ممکن بات ہے۔ لیکن میں بھی مجبور ہوں اپنے خامہ فرسا ذوق کا یعنی خط لکھنے والے شوق کا وہی مجبوری بار بار مجھے خط لکھوا دیتا ہے)

(۱۸۶) اگر دنیا میں بہار کا موسم کوئی ہے بھی تو وہ حنائے پائے خزاں ہے۔ یعنی جب خزاں ختم ہوتی ہے۔ تو بہار کا آغاز ہوتا ہے۔ مگر وہ تھوڑے سے دنوں میں رفو چکر ہو جاتا ہے۔ تو گویا خزاں ہی کے پاؤں کی حنا تھی۔ کہ اس کے بعد وہ عمل ہوئی تھی۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوا کہ دنیا کا عیش ہمیشہ کے لئے دل کی کلفت یا ناحق کی تکلیف کا باعث ہے حنا یعنی مہندی صرف چند یوم ہی رہتی ہے۔ اسی طرح بہار بھی چند روزہ ہے۔ تو گویا یہ ملتی جلتی چیزیں ہیں۔ اور بہار کو پائے خزاں اس لئے کہا کہ بہار خزاں کے بعد بھی آتی ہے اور پہلے بھی مگر یہاں آخر الذکر مثال سے شعر میں کام لیا گیا ہے۔

(۱۸۷) مجھے فراق کے غم میں سیر باغ کی تکلیف نہ دو۔ یعنی ایسے میں مجبور نہ کرو کہ میں وہاں جاؤں۔ کیونکہ مجھے (پھولوں کی) بے موقع ہنسی کا دماغ نہیں ہے یعنی میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یا ایسی باتوں سے التفات نہیں رکھتا (اور پھولوں کی بے موقع ہنسی اس لئے۔ کہ وہ میرے ایام فراق میں مجھ کو خندہ یعنی ہنستے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یعنی کھلے ہوئے) اور میں بحالت رنج ہوں گا تو ان کا ہنسنا میرے لئے گویا بے موقع یا بےجا ہوگا۔

(۱۸۸) چشم بینا۔ خوب پرکھنے والی آنکھ۔ میرے جسم کے ہر ایک بال کی جڑ ایک پرکھنے والی آنکھ کا کام دیتی ہے۔ پھر بھی محرمیٔ حسن کو تا ہنوز ترستا ہوں۔ یعنی ابھی حسن کا محرم راز یا واقف نہیں ہو سکا۔ کہ حسن کیا چیز ہے۔ مراد یہ کہ حسن کو پرکھنے والا کوئی ہی ہوا کرتا ہے۔

(۱۸۹) پہلے مصرعے کی تشریح ہے۔ دل ناز و ادا سے پہلے ہی اسکو دے بیٹھے۔ مطلب یہ ہے چونکہ ہم اپنا دل اس کے ناز و ادا سے پہلے ہی اس کو دے چکے یعنی صرف اس کی

شکل ہی دیکھکر دل باختہ ہوگئے تھے۔) اب اس کے حسن۔ زلفیں اور رخسار کے تقاضے کا دماغ نہیں رہا۔ یعنی دل تو ناز و ادا سے پہلے دے رہا گیا تھا۔ اب وہ ناز و ادا کرنے لگا۔ تو یہ گویا تقاضائے حسن ہے۔ (کیونکہ تقاضا وہ فعل ہوتا ہے۔ کہ بار بار ہو۔ اور یہاں معشوق پہلے اپنی شکل دکھا کے ہمارا دل لے چکا ہے اور اب ناز و ادا سے بھی لینا چاہتا ہے۔) اس لئے ہمیں اس کا دماغ نہیں ہے۔ یعنی ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ کہ بار بار دل دیا جائے۔ حاصل شعر یہ کہ عاشق صرف ایک ہی مرتبہ دل دیتا ہے۔ اور پھر وہ ایک بوالہوس آدمی کی طرح کئی کئی بار عاشق نہیں ہوا کرتا۔ دوسرے معنی یہ کہ ہم تو اس کو اپنا دل اس کے ناز و ادا سے بھی پہلے دے چکے ہیں۔ یعنی صرف اس کی صورت ہی دیکھکر اب وہ ناز و ادا کرنے لگا جو تقاضائے حسن ہے یعنی حسن مقتضی تھا۔ کہ وہ ناز و ادا کرے۔ تو اس کے لئے ہمیں دماغ کہا۔ یعنی جب دل ہی پہلے جا چکا ہے۔ تو اس کے ناز و ادا کا کون متحمل ہو۔

(۱۹۰) نگاہ میں ہونا۔ مد نظر ہونا۔ یہ سمجھو کہ میرا رونا میری حسرت دل کے اندازے کے موافق ہے (یعنی جتنی حسرت دل مجھ کو رلاتی ہے۔) بلکہ مجھ کو تو دریا کا جمع و خرچ مد نظر ہے یعنی جس طرح دریا میں بے اندازہ پانی آتا۔ اور پھر اسی طرح نکل جاتا ہے۔ اسی طرح میں اپنے آنسوؤں کو بہانا چاہتا ہوں۔

(۱۹۱) آسمان کو دیکھکر اے اسد میں اس (محبوب) کو یاد کرتا ہوں۔ یا مجھے وہ یاد آتا ہے۔ (کیونکہ ظلم کرنا آسمان کا کام ہے۔ اور وہ اس کام میں کار فرما ہے یعنی سب کا سربراہ ہے) چونکہ یہاں دوست کی جفا آسمان سے ملتی جلتی ہے لہذا وہی اس محبوب کے جور و ستم کا بھی سربراہ ہے۔

---

۹۲. قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

۹۳. اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

(۱۹۲) ایک شیشہ کے گلاس میں بار بار کوئی سیال چیز ڈالی جائے۔ تو ایک تو اس کے منہ سے کچھ نیچے ایک گول سا خط پڑ جاتا ہے۔ یہ خط جام کہلاتا ہے۔ دوسرے اس شیشے میں کبھی کبھی ایک بوند اس سیال چیز کی تن تنہا بھی رہ جاتی ہے۔ نفس پرور ہوا۔ موٹا ہوا۔ اس کے وجود نے پرورش پائی۔ مطلب شعر۔ جام مے کا خط بالکل موتی پرونے والے دھاگے کا نمونہ بن گیا۔ اور اس میں وہ شراب کا قطرہ جو بوجہ حیرت یعنی اپنی پریشانی کے (مواد شراب سے علیحدہ ہوگیا تھا) وہاں (خط جام کے دھاگے) میں اس نے اپنے وجود کو پرورش دلائی۔ اور اسی دھاگے نے گویا اس کو پرو کر اسے وہاں قایم رکھا۔ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے۔ حاصل شعر کوئی اخلاقی نکتہ نہیں ہے۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ شراب سے قطرہ جب جدا ہوگیا۔ تو اپنی علیحدگی کے سبب پریشان ہوا۔ اور وہیں خط جام پہ پرورش پاکے رہ گیا۔

(۱۹۳) عشق کے اعتبار (یعنی اس کو یہ یقین کہ میں ہی اس کا عاشق ہوں اور آہیں بھرتا ہوں اس) کی خرابی دیکھنا۔ کہ جب غیر نے آہ کی (تو اس کو میری سمجھ کر وہ) مجھ پر خفا ہوا۔

غزل

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا ۱۹۴ — تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

اہل بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخی ناز ۱۹۵ — جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا ۱۹۶ — عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

۱۹۷ — نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

---

(۱۹۴) تقریب سفر۔ سفر کرنے کے موقع پہ محمل باندھا یہاں مراد لیلیٰ نے جب مجنوں کی طرف صحرا میں جانے کے لئے اپنے اونٹ پر محمل باندھا۔ تپش شوق۔ لیلےٰ کے لئے مجنوں کے دل کے شوق کی بیتابی نے۔ ہر ذرہ گویا ریگ صحرا کا ہر ذرہ۔ جب لیلیٰ نے سفر کرنے کے موقع پر اپنے

اونٹ پر محمل باندھا تو مجنوں کے دل کے شوق کی بیتابی نے جو کہ پہلے کیسے ملنے کی خاطر تھی ہر ذرۂ ریگِ صحرا پر ایک دل باندھ دیا گویا وہ ہزار ہا دلوں کے شوق کو لے کر اس سے ملنے کو تیار ہو گیا۔ یا اتنے دل کہ ایک ایک ذرۂ ریگِ صحرا پر بندھا ہوا تھا۔ مراد لیلیٰ کے شوقِ عشق کا اظہار کیا ہے۔

(١٩٥) اہلِ بینش۔ وہ عقلمند آدمی جو اصلیت کو پا سکیں یا جو خوب پرکھنے والے ہوں مطلبِ شعر۔ حیرت کدہ۔ اس سے یہاں مراد آئینہ ہے کیونکہ آئینہ کو حیرانگی سے نسبت دی جاتی ہے۔ شوخیِ ناز۔ معشوق کی وہ شوخی کہ ناز و انداز کے تقاضے سے کی جائے۔ مثلاً کسی عاشق کو اپنے ناز و انداز سے قتل کر دینا۔ جوہرِ آئینہ۔ جب آئینہ کو صیقل کیا جاتا ہے تو اس میں ایک لمبا خط سا جھلک مارتا ہے۔ وہ جوہرِ آئینہ ہوتا ہے۔ طوطیِ بسمل۔ زخمی طوطا۔ دوست کے آئینہ میں جو خطِ جوہر نظر آرہا ہے۔ وہ خطِ جوہر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ناز و انداز کی شوخی کے سامنے جب اپنے اس حیرت کدہ کو شوخیِ ناز یعنی آئینہ کو شوخِ نظر سے دیکھا۔ تو اس کا جوہر کہ طوطی کی طرح (سبزی مائل) تھا۔ اور خط جو ہر اس کی طرح بھاگ رہا کر لیتا طوطیِ بسمل بن گیا۔ اور پرکھنے والوں نے یعنی شعراء نے اس کو طوطیِ بسمل ہی باندھا خطِ جوہر نہیں لکھا۔ مراد یہ کہ محبوب دلنواز کی ناز و انداز کی نظر اسقدر موثر ہوا کرتی ہے کہ آئینہ پر بھی اثر کرتی ہے۔

(١٩٦) عرصہ۔ لڑائی۔ عرصہ میدان۔ لڑائی کرنے کا میدان۔ میری یاس اور امید نے یا امید و بیم نے لڑائی کا میدان طلب کر رکھا ہے۔ (کیونکہ میرے دل میں امید بھی حد سے زیادہ ہے۔ اور ناامیدی بھی۔ تو ان کے باہم لڑائی کرنے کے لئے گویا وسیع میدان ہونا چاہئے۔ اور میرے دل کی وسعت اس کے لئے کافی نہیں ہے) لہٰذا عجزِ ہمت نے (یعنی اسقدر توفیق نہیں تھی کہ دل غیر محدود طور پر وسیع ہوتا کہ اس میں امید و بیم دل کھول کے لڑ سکتے۔ اب سائل کے دل (یعنی میرے) دل کا طلسم باندھا ہے۔ مراد عجزِ ہمت کہ توفیق نہیں اس عذر کا جادو کیا" یعنی یہ عذر معقول پیش کر۔ ماحصلِ شعر یہ کہ دل کو بڑی وسعت چاہئے کہ اس میں یاس و امید جسقدر کہ ایک عاشق رکھا کرتا ہے سما سکیں لہٰذا یہ

کہ کر کہ خدا نے ایسا دل ہی نہیں دیا۔ وہ چپ ہو جاتا ہے۔ یہاں ہمت کے معنی توفیق۔ عجزِ ہمت۔ توفیق نہ ہونا۔

(١٩٧) تشنگیِ ذوق۔ شوق کا تشنہ رہنا۔ یہاں مراد شوقِ شعر گوئی کا پورا نہ ہونا۔ غالب مجھے "اپنے دلی شوقِ شعر گوئی کے پورا نہ ہونے" کے متعلق مضمون (حسبِ منشا) نہ بندھ سکے حالانکہ میں نے دل کھول کر (تشنگیِ ذوق کے تقاضے سے) دریا کو بھی ساحل باندھ دیا۔ یعنی اس ذوقِ تشنگی کے سبب دریا کو بھی پانی نہیں۔ بلکہ خشکی "مثلِ ساحل قرار دے لیا۔ یعنی اسقدر مبالغہ کیا۔ پھر بھی میری تسکینِ شعر گوئی نہ ہوئی۔

غزل

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں ١٩٨ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں ١٩٩ وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں ٢٠٠
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

(١٩٨) میں رچا اسقدر شراب خوار ہوں کہ ذرا شراب سامنے آئے تو اسے کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ تشنہ کام۔ حلق کا تشنہ رہنا۔ ترنہ ہونا۔ میں اور محفلِ شراب خواری سے پیاسا آؤں۔ (بظاہر اس کا سبب میری جھوٹی توبہ تھی۔ لہٰذا) اگر میں نے اوروں کے دکھانے کو توبہ کر لی تھی تو ساقی کو کیا ہوا تھا۔ (اس نے تو کوئی شراب پلانا چھوڑ نہیں دیا تھا) وہی ذرا تقاضا کر کے مجھے شراب پلا دیتا (تاکہ میری پیاس اتر جاتی۔ اور میں تشنہ کام نہ رہتا۔ اور میری جھوٹی توبہ کے ٹوٹنے کا عذر بھی قابلِ پذیرائی ہوتا۔)

(١٩٩) دوست نے ایک ایسا اچھا تُلا پورا تیر چلایا ہے۔ کہ دل اور جگر جو سینے میں پہلے علیحدہ علیحدہ تھے۔ اب اسی ایک تیر میں دونوں چھدے پڑے ہیں۔ اور وہ دن چلے گئے کہ دل و جگر الگ الگ ہوا کرتے تھے۔

(۲۰۰) درماندگی۔ عاجزی درماندگی یعنی ناکارہ ہونے کی حالت۔ جب انسان ناکارہ ہو تو اے غالب ایسے میں کوئی تدبیر (یعنی بہتری کی) اس سے بن پڑے تو میں جانوں (یعنی ایسا کم ہوتا ہے) گویا جب رشتہ بے گرہ تھا۔ یعنی میری مشکل پر کوئی گرہ (یعنی کوئی الجھن) نہیں تھی۔ تو اس وقت میرا ناخن بھی اس گرہ کے کھولنے کے قابل تھا۔ (اب مشکل پہ گرہ پڑی تو ناخن بھی ایسے وقت بیکار ہو گیا۔) مراد ہو کہ مشکلات کے وقت انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا ۲۰۱ بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے ۲۰۲ کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

۲۰۳ بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

---

(۲۰۱) ہمارا گھر رو رو کر دریا بہانے سے ویران نہیں ہوا۔ بلکہ پہلے ہی ایسا تھا جیسے بیابان (یعنی ایک وسیع ٹکڑا خالی زمین کا) بے آب ہو۔ تو بیابان ہے۔ پانی سے بھر جائے تو بحر ہوتا ہے۔ لہذا اگر بحر اس جگہ نہ رہے۔ تو پھر بیاباں ضرور بن جائیگا۔ اسی طرح ہمارا گھر بھی دراصل بیابان ہی ہے۔

(۲۰۲) دل کی تنگی (المناک حالت) کا کیا شکوہ کریں۔ یہ وہ کافر (موذی) دل ہے۔ کہ اگر تنگ نہ ہوتا۔ یعنی المناک نہ ہوتا۔ تو پریشان ہو جاتا۔ (کسی طرح نہیں ستاتا ضرور رہتا) قاعدہ ہے کہ کوئی چیز (مثل دل کے) جو تنگ بھی ہو سکتی ہے۔ اور وسیع بھی تو ان دو حالتوں میں سے ایک حالت اختیار کرے گی۔ اسی لئے کہا کہ دل اگر تنگ نہ ہو تو پریشان یا منتشر ہو جائیگا۔

(۲۰۳) ورع۔ عبادت۔ رضواں۔ داروغۂ جنت۔ کاش رضواں ہی یار کے گھر کے دروازے کا دربان ہوتا کہ حسبِ عادت ہمیں بہشت یعنی دوست کے گھر میں داخل

ہونے کی اجازت دیتا اور عمر بھر کی عبادت کے بعد ہم وہاں داخل ہو کے عیش مناتے (حالانکہ دوست کی عمر بھر خدمت کی۔ اور وہ ہمیں اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ یا دوست کا گھر جنت ہے تو وہاں بھی رضواں ہونا چاہیئے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۲۰۴ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا ۲۰۵ نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

۲۰۶ ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

---

(۲۰۴) قاعدہ ہے کہ انسان جب تک زندہ ہے۔ سب تکلیفیں اس کو ہوتی ہیں اور اس سے برے کام بھی بعض اوقات ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ پیدا نہ ہوتا یا پیدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ تو اسے کیا تکلیف نہ گناہ ہی سرزد ہوتے ہیں۔ نہ ثواب۔ اسی مضمون کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ کچھ نہ تھا۔ (یعنی جب میں موجود نہیں تھا) تو فنا کی حالت میں فنا فی اللہ تھا۔ اور گویا عالم عدم میں میں خدا ہی تھا۔ کہ دونوں ایک ذات تھے۔ اور اگر اب کچھ نہ ہوتا یعنی مر کر فنا ہو جاؤں۔ تو پھر بھی وہی صورت ہے۔ کہ فنا فی اللہ ہو جاؤں گا اور "خدا" سے پیوست ہو جاؤں گا۔ لہذا میرا فنا ہونا ہی بہتر ہے۔ حالانکہ اب ہست ہو کے گناہوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہوں۔ تو اس سے میرا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ اور اسی لئے مجھ کو میرے ہونے نے گویا ڈبو دیا۔ یا غارت کر دیا ہے۔ لہذا اگر میں نہ ہوتا۔ کچھ بات نہ تھی۔ یعنی ایسی تکلیفات مجھے پیش نہ آتیں۔

شارحینِ غالب نے اس شعر کو یوں حل کیا ہے۔ کہ جب کچھ نہ تھا۔ تو خدا تھا۔ اور اگر کچھ نہ ہوتا۔ تو بھی خدا ضرور ہوتا۔ گویا ہر دو صورت میں خدا موجود رہتا۔ مگر مجھ کو میرے ہونے نے ڈبویا۔ اگر نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ یعنی اس سے کسی کا کیا کچھ بگڑ جاتا۔ یہ معنی غلط ہیں۔ کیونکہ مصنف نے یہاں انسان اور خدا کا مقابلہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ صرف یہ

دکھایا ہے کہ میری ہستی موجبِ آلام و منہیات ہے۔ اگر نہ ہوں تو اس سے میں بدرجہا بہتر حالت میں رہوں۔

(۲۰۵) میں جب غم سے اسقدر زچیں (اپنے آپ سے بیزار) ہوں تو سر کٹے یا نہ کٹے مجھے اس سے کیا تکلیف کہ غم کروں۔ اس لئے کہ اگر میرا سر تن سے نہ جدا ہوتا۔ (یعنی کاٹا نہ جاتا) تو ضرور ہے۔ کہ زانوں پر دھرا ہوتا۔ (ایک مدہوش آدمی سر بہ زانو ہی رہا کرتا ہے) اور زانو پہ سر ہونا غم کرنے کی علامت ہے۔ تو اس صورت میں بھی گویا غم مجھے لاحق ہوتا۔

(۲۰۶) مدت ہوئی غالب فنا فی اللہ ہو گیا۔ مگر اب بھی اس کی وہ بات یاد آتی ہے جو وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" یعنی یہ بات اگر اس طرح (ہمارے حق میں) ہوتی۔ تو کیا کسی کا کچھ بگڑ جاتا۔ مراد یہ کہ وہ اپنے دل کی حسرتوں ہی میں مر گیا۔

غزل

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا ۲۰۷ یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی ۲۰۸ کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ۲۰۹ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے ۲۱۰ تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے ۲۱۱ پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار ۲۱۲ یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل ۲۱۳
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

(۲۰۷) باغ کی ایک ذرہ بھر زمین بھی بیکار یعنی بے فائدہ و بے مصرف نہیں ہے۔ اس میں ایک جادہ (پگڈنڈی) بھی ایسی مفید ہے۔ جیسے کہ لالہ کے پھول میں کا وہ فتیلہ یا بتی کی

(جو لالہ کے پھول میں بتی کی طرح نکلی ہوتی ہے اور اس کا یہ فائدہ ہوا کرتا ہے۔ کہ وہ لالہ کی خوبصورتی کو بڑھاتی ہے۔ اگر یہ قطع کی جائے تو گُلِ لالہ بالکل لنڈ منڈ سا دکھائی دے اسی طرح) باغ میں عام روشوں کے علاوہ جو باغ کے تختوں میں لوگوں کے آنے جانے سے پگڈنڈیاں بن جاتی ہیں۔ وہ بھی اس فائدے سے خالی نہیں ہوتیں۔ کہ ان کے ذریعہ باغ کے کسی قطعہ کو بہت جلد عبور کر سکتے ہیں۔ حالانکہ روشوں پر سے اگر باغ کے تختوں کو عبور کریں۔ تو بڑی دقت ہوتی ہے۔ (یہاں بیکار سے مراد کسی طرح کا کوئی فائدہ ہے۔ جیسے کہ پگڈنڈی کا خاص فائدہ اوپر لکھا گیا ہے) دوسرے معنی جو شارحین نے لکھے ہیں۔ یہ کہ جادہ سے مراد روشِ باغ ہے (حالانکہ جادہ اور روش میں جو کہ کھلا راستہ ہوتا ہے بہت فرق پایا جاتا ہے۔) وہ اسقدر لالہ کے پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ کہ گویا وہ بھی گُلِ لالہ کا فتیلہ یعنی بتی بن گئی ہے۔ بوجہ اپنی لمبوتری شکل کے۔ مگر یہ کیا ضرور کہ بیکار کے لفظ سے باغ کی کسی پیداوار ہی کا تعلق ہو۔ اس کے عام معنی کسی طرح کا کوئی فائدہ دینے سے نہ رہنا ہے۔

(۲۰۸) بلبل کے کاروبار (یعنی پھول کے لئے بیقرار ہونا اس پر نثار ہونا وغیرہ وغیرہ) پر پھول کا ہنسنا ہے۔ یعنی وہ اس کی ہنسی اڑا رہا ہے (کیونکہ وہ اسقدر کھل کے گویا ہنس رہا ہے) یہ ہنسی یا بلبل کی تحقیر کیوں اس لئے کہ جس کو عشق کہتے ہیں وہ دماغ کا خلل بتایا جاتا ہے۔ لہذا بلبل کو بھی خللِ دماغ ہو گیا ہے۔ اور پھول اس پر ہنس رہا ہے۔ (کیونکہ کھلا ہوا پھول ایک ہنستے آدمی کے کھلے ہوئے منہ کے مشابہ ہوتا ہے۔) +

(۲۰۹) تریاکی - افیمی۔ نشہ خور۔ میرا یہ فکرِ سخن (شعر گوئی) کا نشہ کوئی نیا نہیں ہے یعنی میں بہت پرانا شعر بنانیوالا ہوں۔ اور شعرا اکثر رات کے وقت چراغ کے سامنے شعر بناتے ہیں۔ اور چراغ کا دھواں ان کے منہ تک پہنچا کرتا ہے۔ (اگلے زمانہ میں مٹی کے دیئے ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔) لہذا میں چراغ کے دھوئیں کا قدیمی تریاکی یا نشہ خور ہوں یا اس کا رسیا ہوں۔ اور مجھے یہ دھواں کھانے کی گویا عادت ہے۔

(۲۱۰) ہم عشق کی قید سے صدہا مرتبہ آزاد ہوئے۔ لیکن کیا کریں ہمارا دل ہی "فراغت" کا دشمن ہے۔ یعنی بار بار کسی پر عاشق ہوکے مبتلائے غمِ عشق ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ بات ہماری فطرت ہی میں داخل ہے۔ کہ کسی نہ کسی چیز کی محبت میں ہم مصروف رہیں۔

(۲۱۱) آشوب۔ مصیبت۔ آگہی۔ واقفیت یا ہوشیاری۔ عجز حوصلہ۔ حوصلہ کا عاجز ہونا۔ یہاں مراد مصیبت کے برداشت کرنے کی ہمت نہ پڑنا۔ ایاغ (پیالۂ شراب) کا خط کھینچا یعنی اس میں شراب ڈال ڈال کر پی۔ تو اس سے مذکورہ بالا پیالے کے اندر شراب کے نشان پڑ گئے۔ مراد ساغر بھر بھر کے شراب نوشی کرتے رہے۔ کیونکہ آگہی یعنی دنیا میں ہوشیار رہنے اور شرع یا منہیات سے باخبر ہوکے زندگی بسر کرنے میں سخت دقتیں لاحق ہوتی ہیں۔ اور وہ دقتیں ہر شخص برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ بالکل نیک پاک اور باخبر ہوکے رہے۔ لہذا اس ہوشیاری کی مصیبت برداشت کرنے کی ملامت ہوتے کے (یعنی شراب پئے بغیر) کس کو طاقت ہے۔ (گویا گئے دم اور جائے غم) اسی لئے اس مصیبت سے ہمارے حوصلہ یا ہمت نے عاجز ہوکر پیالۂ شراب (ایاغ) کا خط کھینچا ہے۔ یعنی ساغر میں شراب ڈال ڈال کے پینا شروع کیا ہے۔ حاصلِ شعر یہ کہ شراب خواری سے ہر ایک رنج بھول جاتا ہے۔

(۲۱۲) خونِ دل سے اگر مراد شراب لی جائے۔ کیونکہ یہ دل کا خون یا اس کی طاقت کو بڑھاتی ہے۔ تو کہتا ہے کہ بغیر شراب کے آنکھوں میں غبار چھا جائے یعنی ناطاقتی کی وجہ سے آنکھوں تلے اندھیرا ہو جائے۔ لہذا ہر شخص شراب کی جستجو میں ہے۔ اور یہ میکدہ (ساری دنیا) شراب ہی کی تلاش میں خراب خستہ ہے۔ گویا ہر شخص عیش پسند ہے

(۲۱۳) باغِ شگفتہ تیرا (محبوب سے کہتا ہے) تیرے حسن کا پھلا پھولا باغ میرے دل کے لئے عیش و عشرت کی بساط یا فرش ہے۔ ابرِ بہار (جس کے سبب میخوار خوش ہوا کرتا ہے۔) وہ کس کے دماغ کا خمکدہ (یعنی باعثِ مسرت) ہے مطلب یہ کہ مجھے تو تیرا حسن ہی وجہ مسرت ہے۔ مجھے یہ دماغ یعنی پرواہ نہیں ہے۔ کہ ابرِ بہار آئے۔

تو باغ شگفتہ ہو اور وہ میری (مسرت کا) خمکدہ (یا سبب سرور) ہو۔

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا ۲۱۴ رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ۲۱۵ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ ۲۱۶ اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام ۲۱۷ رخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا ۲۱۸ نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ۲۱۹ ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ ۲۲۰ دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
۲۲۱ دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

(۲۱۴) وہ میری چینِ جبیں (پیشانی کی شکن) سے سمجھ گیا۔ کہ کوئی غم پنہاں ہے یعنی میرے دل میں کوئی غم چھپا ہوا ہے (گویا) وہ ایک خط کے عنوان کی بے ربطی (بے ترتیبی) ہی کے باعث تاڑ گیا۔ کہ اس خط کا راز (یعنی اس میں جو لکھا ہے) وہ کیا ہے۔ یہی کہ لکھنے والے نے بحالتِ پریشانی ایسا خط لکھا ہے۔ تو ضرور ہے کہ اس کے اندر اس نے اپنے غم اور پریشانی ہی کے حالات قلم بند کئے ہوں گے۔

(۲۱۵) یک الف بیش نہیں یعنی ایک الف سے زیادہ نہیں۔ مراد یہ کہ جس طرح کوئی شخص مبتدی ہو۔ تو کہتے ہیں کہ وہ الف بے سے زیادہ نہیں جانتا۔ ایسا ہی میری بھی (ہنوز) ابتدائی حالت ہے۔ مگر اس جملے میں ایک تلمیح یہ پائی جاتی ہے قلندر لوگ کپڑے پھاڑ کے اپنے سینے پر ایک نشان "ا" کا بنا لیا کرتے ہیں جس سے ان کا مطلب گویا اللہ کا عشق ہوتا ہے۔ صیقلِ آئینہ۔ یہاں آئینہ سے سینہ دل مراد ہے۔ اور صیقلِ آئینہ صفائے دل ہے۔ گریباں سمجھنا۔ یعنی آئینہ

دل کو گریبان سمجھ لیا ہے۔ اور عشاق بحالتِ دیوانگی اپنے گریبان کو پھاڑ دیا کرتے ہیں۔ مگر یہاں غالب کہتا ہے کہ میں بجائے کپڑوں کے اپنے دل ہی کو گریبان زاروے کے تار تار کر رہا ہوں گا یا قلندروں کی طرح اپنے کپڑے نہیں پھاڑتا بلکہ اپنے دل کی صفائی کر رہا ہوں۔ مگر ابھی یک الف بیش نہیں یعنی ابتدائی حالت میں ہوں (قلندر یا آزاد لوگ تو صفائی قلب کے لئے اپنے گریبان کو پھاڑا کرتے ہیں) اور میں اپنے دل ہی کو گریبان سمجھ کے چاک چاک کرتا رہتا ہوں۔ صیقل آئینہ کے استعارے ہیں ایک یہ خوبی بھی ہے۔ کہ جس آئینہ کو صیقل کیا کرتے ہیں۔ وہ فولادی ہوا کرتا ہے؛ اور اس میں سے ایک لمبے خط کی جو "الف نما" ہو۔ جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ شعر استعارہ در استعارہ تحفت دقیق بنگیا ہو لیکن مصنف نے ایک جگہ یہی معنی اس کے قرار دئے ہیں۔ اس شعر کی نثر یوں ہے۔ صیقل آئینہ جب سے کہ گریباں سمجھا میں چاک کرتا ہوں۔ ہنوز یک الف بیش نہیں لیکن اغلب ہے کہ یہ شعر اس طرح ہو ؎

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جیسے کہ گریباں سمجھا

یعنی آئینہ دل کو جیسے گریباں سمجھا۔

(۲۱۶) میرے دل کی گرفتاری (رنج و غم میں مبتلا ہونے) کی کیفیت نہ پوچھ میرا دل اس سے اسقدر تنگ ہوا۔ کہ میں اپنے دل کو (بوجہ مصائب) قید خانہ سمجھا۔ حاصلِ شعر۔ زندگی بوجہ کثرتِ آلام، یک قید خانہ ہے۔

(۲۱۷) میری بدگمانی نے (محبوب) کا چلنا پھرنا (جس سے پسینہ آجاتا ہے) اس لئے نہ چاہا یعنی گوارا نہ کیا کہ پسینے پسینے ہو کے سب کے رخسار پر جو ایک قطرہ پسینے کا آیا۔ تو میں اس کو کسی کی حیرت زدہ آنکھ سمجھا۔ (اور میں نہیں چاہتا کہ اس کے رخ پر کسی کی آنکھ ہو) دوسرے معنی اس کی بدگمانی نے نہ چاہا کہ وہ سرگرم خرام ہو (یعنی چلے پھرے) کیونکہ وہ جب چلا تو اس کے رخ پر ایک قطرہ پسینے کا

آگیا۔ تو اس نے سمجھا کہ یہ کسی کی متحیر آنکھ اس کے رخسار پر پڑی تھی۔ لہذا نہ چلنا ہی مناسب ہے۔

(۲۱۸) میں نے اپنے عجز (ناتوانی و ضعفِ حالت) کے سبب کہ مثل خس کے ہے۔ یہ خیال کیا کہ وہ بدخو ہوگا۔ گویا محض خس کی بنض کے خواص معلوم کرکے سمجھ گیا۔ کہ میں نے تپش شعلہ کا حال جان لیا۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ خس اور تپش شعلہ کو تعلق نہیں کیا۔ مراد یہ کہ میری کمزوری اور دوست کی بدمزاجی کو ایک دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ پھر اپنے آپ کو خس قرار دے کر اس کے مزاج کو تپش شعلہ کی طرح گرم خیال کرنا محض حماقت ہے۔ حاصل شعر یہ ہے کہ میں خس طبیعت ہوں اور دوست شعلہ

(۲۱۹) سفرِ عشق یا عشق کے عالم میں مجھے جو ضعف لاحق ہوا۔ تو مجھے آرام کی حاجت محسوس ہوئی۔ اور چونکہ ہر قدم چل کر ضعف سے گر پڑتا تھا۔ میں اپنے سایہ کو (جو میرے ساتھ ہی ساتھ چلتا تھا۔) اپنا شبستان سمجھنے لگا۔ یعنی رات کو ٹھہرنے کی جگہ تصور کرکے وہیں پڑا رہنے لگا۔ مطلب یہ کہ ضعف سے ایک قدم چلتا۔ تو گر پڑتا اور پھر وہیں پڑا رہتا تھا۔

(۲۲۰) میرا دل دوست کی پلکوں کے بالوں سے (جو تیر کی مانند ہوا کرتے ہیں) مرتے دم تک بھاگتا رہا۔ یعنی اس کی زد سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ گویا میں موت کے تیر کی نوک یا پیکان قضا کا دفع کرنا اس قدر آسان سمجھا۔ پیکان برچھی یا تیر کی نوک۔ قضا۔ موت۔ پیکان قضا۔ موت کے تیر کی نوک۔ مراد تیر نظر سے فرار

(۲۲۱) اے اسد اس (کافر معشوق) کو یہ سمجھ کے کہ وہ وفاداری کریگا۔ دل کیوں دیا تھا۔ تو نے یہ غلطی کی جو ایک کافر شخص کو (جسے وفاداری کا پاس نہیں ہوتا) مسلمان سمجھ کے اپنا دل دے دیا۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ۲۲۲ دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۲۲۳ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی	۲۲۴	پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل	۲۲۵	نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی	۲۲۶	کیوں ترا راہگذر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی	۲۲۷	گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں	۲۲۸	دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال	۲۲۹	دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے	۲۳۰	دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

۲۳۱ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(۲۲۲) میرا دل اور جگر تشنۂ فریاد ہوا (دراصل فریاد آیا فارسی میں کہتے ہیں اردو میں تشنۂ فریاد ہوا ہی کہیں گے) یعنی فریاد کرنے کا خواہاں ہوا۔ پھر مجھے اپنی رونے والی آنکھ یاد آگئی کہ اس سے روؤں۔

(۲۲۳) مولانا حالی نے اس شعر کے یہ معنی لکھے ہیں۔ کہ دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذری تھی۔ اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کے یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی وقفہ ہو جاتا ہے۔ اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ (یادگارِ غالب) دم نہ لیا تھا۔ ابھی کچھ وقفہ نہ گذرا تھا۔ قیامت یہاں مراد دوست کے سفر پر جانے کے لئے جدا ہونا۔ اور اس سے عاشق کے دل پر صدمہ پہنچا۔ مطلب شعر۔ ابھی تیرے وقتِ سفر ہم سے جدا ہونے کی یاد پر جو قیامت کا نمونہ تھی کچھ وقفہ نہیں گذرا تھا۔ کہ پھر وہی تیرا وقتِ سفر یاد آیا۔ مراد یہ کہ ہم بہت جلد جلد تیری جدائی کا وقت یاد کرتے ہیں۔ تو اس سے گویا قیامت بار بار ہم پر پیدا ہوتی ہے۔

(۲۲۴) نیرنگ جادو یا طلسم۔ نیرنگِ نظر۔ آنکھوں کا جادو۔ یعنی آنکھوں کو

فریب دینے والا۔ مجھ کو وہ میری آنکھوں کو فریب دینے والا (یعنی جس سے کہ پہلے بھی میں تنگ چکا ہوں) پھر یاد آیا۔ یہ میری آرزو کی سادگیاں ہیں۔ کہ وہ فریبی بار بار مجھے یاد آتا ہے۔

(۲۲۵) عذرِ واماندگی۔ میری کمزوری و ناتوانی کا عذر قبول ہو۔ یہاں قبول محذوف ہے۔ حسرتِ دل۔ دل کی یہ حسرت یا رنج۔ نالہ کرتا تھا۔ یعنی زور سے آہ وزاری کرنے لگا تھا۔ جگر یاد آیا۔ اپنے جگر کی طاقت آہ وزاری جو کمزور ہے یاد آئی۔ جگر کے معنی طاقت بھی ہے۔ اے حسرتِ دل۔ میری ناتوانی کا عذر قبول ہو۔ میں زور سے آہ وزاری کرنے لگا تھا۔ کہ جگر کی کمزوری یا اس کی طاقت برداشت جو آہ وزاری کرنے میں کمزور ہے۔ یاد آگئی۔

(۲۲۶) یہ ایک عام مشاہدہ ہے۔ کہ عاشق اپنے معشوق کو جب کسی جگہ گذرتے ہوئے دیکھ پاتا ہے تو وہ بار بار اسی راستے پر جاتا ہے۔ اور اکثر وہاں بڑی دیر تک بیٹھا ہوا راہ دیکھتا رہتا ہے۔ کہ شاید دوست ادھر سے پھر گذرے۔ اور اس سے ملنے کا اتفاق ہو۔ شعرا نے اس مضمون کو عموماً نظم کیا ہے۔ کہتا ہے۔ پھر تیرا راہگذر مجھے یاد آیا۔ اب میں وہاں روز جایا کروں گا۔ اور تیرے انتظار کی مصیبت اٹھایا کروں گا۔ بہتر تھا کہ ایسا نہ ہوتا۔ کیونکہ زندگی یوں بھی یعنی بغیر اس کے بھی تو گذر جاتی۔ مگر اب کہ یہ الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ کہ تو اس راستے سے گذرا کرتا ہے۔ تو وہاں جا جا کر بیٹھنا اور اپنے دن کاٹنا گویا ایک مصیبت کی زندگی ہو گئی۔ جو نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ یعنی تیرا راہگذر نہ ہی یاد آیا کرتا۔ تو اچھا ہوتا۔

(۲۲۷) اگر تیرا مکان بہشت میں یاد آگیا۔ تو میں اس کی اتنی تعریف کروں گا۔ کہ اس کے سامنے بہشت بھی کچھ چیز معلوم نہ ہوگی۔ تو یہ بات رضواں کو جو بہشت کا داروغہ ہے۔ ناگوار گذرے گی۔ اور اس کی اور ہماری وہاں لڑائی ہو جائیگی۔

دوسرے معنی۔ ہم بہشت کو تیرے ہی گھر جیسا دیکھ کر دھوکا کھا جائیں گے اور اس کو تیرا مکان خیال کر کے اس میں داخل ہونا چاہیں گے۔ تو رضواں جو بہشت کا

(۲۳۶) ایک بجلی اسی میری آنکھوں کے سامنے کوند گئی۔ تو کیا یعنی تم بجلی کی طرح شعلہ رو بن کے میرے سامنے آئے اور پھر فوراً چلے گئے۔ تو اس سے میرے ... کی تسکین کیا خاک ہوتی۔ کوئی بات بھی تو میرے ساتھ کرتے کہ میرے لب تشنۂ تقریر یعنی آپ سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔

(۲۳۷) چونکہ دوست کا حسن یوسف کے حسن سے کچھ زیادہ ہے۔ میں اس کو یوسف کہوں۔ (تو گویا اس کی سبکی ہوتی ہے) پس یہ شکر کر اگر وہ چپ رہے تو بھی خیریت رہی ورنہ (اس کی اس سبکی کے باعث) وہ مجھ سے بگڑ بیٹھتا۔ تو اس ... میں میں لایق تعزیر یا قابل سزا بھی تھا۔

(۲۳۸) غیر کو (اس حالت میں) دیکھ کر میرا کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہو۔ کہ وہ ... و زاری کرتا تھا۔ (اور تیرے آگے ذلیل ہوتا تھا۔) اور ساتھ ہی طالب تاثیر بھی یعنی چاہتا تھا کہ اس کا رونا تجھ پر کچھ اثر کرے۔ (گویا رقیب کی ایسی خواری سے کیوں نہ ٹھنڈا ہو)۔

(۲۳۹) جواں میر۔ وہ جو جوان مرجائے۔ فرہاد کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ... پہاڑ کھودتا رہتا تھا تاکہ اس میں سے دودھ کی نہر بہالائے۔ تو شیریں کا وصال ... غرض اسی باعث فرہاد کو کوہکن بھی کہتے ہیں۔ مطلب شعر۔ کوہکنی جو فرہاد کا پیشہ ... اس لئے اس کو بدنام نہ کیجئے۔ کیونکہ پیشہ میں کوئی عیب نہیں۔ بلکہ ہمیں ... سر دل (دیوانوں) میں وہ ایک جواں میر بھی تھا۔ یعنی تھا تو ہمیں جیسا۔ مگر ... مرگ ہو کے مرگیا۔ تو عشاق کے نزدیک وہ اور زیادہ واجب التعظیم تھا۔

(۲۴۰) ہم تو مرنے کو کھڑے تھے۔ (یعنی اپنی موت کا نشانہ بن کے) یار اگر ... پاس ہمیں قتل کرنے کو نہ آیا تو نہ ہی۔ آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا ... وہ اسی کے ساتھ دور سے ہم پر تیر چلا کے ہمیں مار ڈالنے سکتا تھا۔

(۲۴۱) محض استہزا کے طور پر کہتا ہے۔ کہ ہم جو فرشتوں کے لکھے پر ناحق ... جاتے ہیں۔ (یعنی فرشتے ہمارا اعمالنامہ لکھ کر قیامت میں پیش کر رہے ہیں

... ہیں اس پر گرفتار کیا جا رہا ہے۔ اور وہ ناحق کیونکہ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ادم تحریر ... ہمارا اعمالنامہ لکھتے وقت) ہمارا کوئی آدمی بھی موجود تھا۔ جواب ہرگز نہیں۔ کیونکہ ... فرشتے جن کا نام "کراماً کاتبین" ہے اور وہ لوگوں کے اعمالنامے لکھا کرتے ہیں ... کو لکھتے ہوئے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تو ان کا کہنا بلا شہادت و تصدیق مان لینا ... ایک طرفہ ڈگری دینا ہے۔

(۲۴۲) ریختہ۔ زبان اردو میں غزل گوئی۔ اے غالب ریختے میں تمہیں استاد ... ہی نہیں کہنے والے نہیں ہو۔ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر (میر تقی) بھی تھا۔ ... شعرائے اردو کا عقیدہ ہے۔ کہ غزل میں میر سے بڑھکر اور کوئی شاعر نہیں ... ہوا ہے۔

لب خشک در تشنگی مردگاں کا ۲۴۳ زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
۲۴۴ ہمہ نا امیدی ہمہ بد گمانی
میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

---

(۲۴۳) لب خشک۔ خشک ہونٹ۔ دل تشنگی مردگاں۔ پیاس کے سبب دل مرگئے ... زیارت کدہ۔ مقام زیارت۔ مزار۔ دل آزردگاں۔ غم رسیدہ لوگ۔ میں ... ان لوگوں کا جو پیاس سے مرگئے ہوں۔ خشک ہونٹ ہوں۔ گویا غم رسیدہ لوگوں کی ... زیارتگاہ یا مزار ہوں۔

(۲۴۴) فریب وفا خوردگاں۔ وفا کا فریب کھائے ہوئے ... مراد وفا کرکے دھوکا کھائے ہوئے۔ یعنی بعوض وفا کے جفا اٹھائے ... ہیں وفا کا فریب کھائے ہوئے لوگوں کا دل ہوں۔ کہ جس میں سراسر ... ناامیدی اور بدگمانی بھری ہوئی ہے۔ یعنی وفا کرکے آخر دوست سے مایوس ... ہوگیا ہوں۔ اور اس سے بدگمان بھی رہتا ہوں۔ کہ وہ مجھ سے ہمیشہ جفا کے

ساتھ ہی تحسین آیا کرے گا۔

۲۴۵ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا — اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

۲۴۶ چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اسکے برابر نہ ہوا تھا

۲۴۷ توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

۲۴۸ جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

۲۴۹ میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں — یعنی سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہوا تھا

۲۵۰ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۲۵۱
جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

(۲۴۵) آج تک تو کسی کا بھی دوست نہیں بنا تھا (چنانچہ امید تھی کہ اوروں یعنی رقیبوں کا دوست تو نہ ہوگا۔ مگر ان غیروں پر بھی تو نے اب تک وہ ظلم یعنی ایسا ظلم کیا کہ (تیرے ہاتھ سے) مجھ پر نہیں ہوا تھا۔ مراد یہ کہ تو ہر شخص کے ساتھ سخت ظلم کرتا ہے۔ بلکہ دوستوں پر تو کچھ اور بھی جفا کرتا ہے۔

(۲۴۶) ماہِ نخشب۔ ایک مصنوعی چاند تھا۔ جو حکیم ابنِ مقنع نے پارے سے مرکب کرکے بنایا تھا۔ یہ ایک کنوئیں سے نکلا کرتا تھا۔ اور چار فرسنگ تک روشنی دیا کرتا تھا) دستِ قضا۔ قدرت کا ہاتھ۔ قدرت کے ہاتھ یعنی خود قدرت نے سورج کو بناتے بناتے ماہِ نخشب کی طرح (جو ایک غیر مکمل چاند تھا) ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ یعنی سورج ابھی میرے دوست (محبوبِ خوش جمال) کے برابر (حسین) نہیں ہوا تھا۔

(۲۴۷) اس شعر کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قطرۂ آب جو آنکھوں میں (نکلا ہوا) تھا۔ اور ابھی ہمت کرکے آنکھوں سے (آنسو کی طرح) زمین پر نہیں

گرا تھا۔ وہ موتی نہیں بنا تھا۔ (یعنی موتی بننے کے لئے پہلے اسے آنکھ سے بشکل آنسو کے زمین پر جست کرکے گرنا تھا۔ پھر مٹی میں رہ جانا تھا۔ اور وہاں سے سمندر میں جاکے گوہر بننا تھا۔ مگر وہ ایسا نہیں کرسکا۔ تو گویا وہ کم ہمت تھا۔) اور توفیق یا علو مرتبہ باندازۂ ہمت یعنی جس قدر کوئی محنت کرے یا مصیبت اٹھائے۔ روزِ ازل سے حاصل ہوا کرتی ہے۔

دوسرے معنی۔ جو قطرہ آنسو کا میری آنکھوں میں تھا۔ اور آنکھوں میں ہونا اردو محاورے میں معزز و مقتدر ہونے سے مراد ہے۔ تو وہ اس لئے مقتدر تھا کہ وہ زمین پر گرکے سمندر میں جا نہیں ملا۔ اور اپنا گوہر بننا اس نے پسند نہیں کیا۔ اور وہ بشکل آنسو ہی ہمیشہ میرے ساتھ وفا کرتا رہا۔ تو میں نے اس کو اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ یہ توفیق (عزت و قدر) اپنی اپنی ہمت ہی کے اندازے کے موافق روزِ ازل سے ہر شخص کو ہوا کرتی ہے۔ شارحینِ غالب نے عموماً یہی معنی بیان کئے ہیں۔ مگر اس مفہوم میں پھر ہمت کا مطلب گویا صبر و قناعت ہوا جو کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ غالباً وہ پہلے معنی ہی درست ہیں۔ کیونکہ ایک اور مقام پر بھی غالب نے اسی طرح کا ایک خیال ظاہر کیا ہے۔ ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

اس شعر کے معنی آئندہ کسی صفحہ میں دیکھ کر ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں۔ کہ مصنف کا اصلی مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ دیگر غالب کو اردو زبان کے محاورے نظم کرنے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ آنکھوں میں ہونا سے مقتدر ہونا سمجھا جاسکتا تھا لیکن زیادہ صحیح یہ ہے۔ کہ قطرۂ آب یعنی آنسو کا آنکھوں میں چھپا ہوا رہنا مقصود رکھا جائے۔ اور اس کے ہمت کرکے باہر نہ آنے یعنی آنسو بن کر بغرض گوہر ہونے کے نہ نکلنے کے سبب اس کی توفیق یا درجہ کو گھٹا ہوا قرار دیا جائے تو بہتر ہے۔

(۲۴۸) قدِ یار۔ دوست کے سرو قد کھڑے ہونے کا انداز جو ایک حسین آدمی

ہونے کی وجہ سے عموماً بہت متاثر کرنے والا ہوتا ہے۔ اور عشاق کے لئے تو گویا ایک فتنۂ باقیامت ہے۔ کہتا ہے۔ کہ جب تک میں نے قدِ یار کے (دلپسند) سین کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ (اور اس سے میرے دل پر ایک قیامت سی نہیں گذر گئی تھی) میں فتنۂ قیامت کا معتقد نہیں ہوا تھا۔ یعنی یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ قیامت کیسی آفت خیز ہوتی ہے۔ سو وہ عالم محشر دوست کو سرو قد دیکھنے سے مجھ پر گذر گیا۔

(۲۴۹) گناہوں کا دریا۔ بوجہ پانی کی قلت کے سراسر خشک ہو گیا۔ حالانکہ میں اس گناہوں کے دریا سے گذر راتھا) میرے دامن کا ایک سرا بھی ابھی تر نہ ہوا تھا۔ شعرا گناہوں کو ایک دریا سے مشابہ سمجھا کرتے ہیں۔ اور جو شخص گنہ گاری کرتا ہے۔ گویا وہ اس دریا سے گذرتا ہے۔ چونکہ جتنا کوئی دریا میں زیادہ گہرا جاتا ہے۔ اُتنا ہی اس کا دامن زیادہ بھیگتا ہے۔ اس شعر میں اسی خیال پر مصنف نے معنیٔ شعر کی بنیاد رکھی ہے۔

(۲۵۰) دستور ہے کہ دو دوستوں میں پہلے کچھ رنجش ہوتی ہے۔ اور ان کو اپنے اپنے شوق یعنی آپس کی محبت کا کچھ تھوڑا سا سبق (تجربہ) حاصل ہوتا ہے پھر یہ رنجش مبدّل بہ عداوت ہو جاتی ہے۔ گویا یہ سبق مکرر ہوتا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ دوست نے مجھ پر خفگی کا اظہار کیا تھا۔ یا مجھ پر خفا سا ہو گیا تھا۔ (یہاں آزردگی بمعنی خفگی ہے) اور میں سادہ دل (دوست کی اس خفگی کو معمولی بات سمجھ کے) اب تک اس سے خوش رہتا ہوں۔ لیکن میری یہ خوشی یا حالتِ اطمینان اس لئے ہے۔ کہ مجھے اپنے شوق (عشق) کا تا ہنوز مکرر سبق (دوبارہ تجربہ) حاصل نہیں ہوا تھا۔ یعنی دوست اول مرتبہ تو معمولی طور پر مجھ سے ناراض ہوا۔ اور پھر اس کے بعد وہ اپنا بدلہ لینے کو جو کچھ مجھ سے کرنا چاہتا ہے۔ یعنی مجھے سبق شوق مکرر دینا چاہتا ہے۔ (جو یہی کہ مجھے قتل کر دیگا) اس سے ابھی واسطہ نہیں پڑا اور نہ یہ بات میرے خیال ہی میں آئی ہے۔ اس لئے میں احمق تاحال خوش

پھرتا ہوں ❋

(۲۵۱) شعرا داغِ دل کو آگ کی طرح جلتا ہوا تصور کیا کرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ سمندر (جو ہمیشہ آگ میں رہا کرتا ہے) اس نے آتش کدہ کو ابھی اپنی جا گیر (یہاں مراد اپنے بیٹھنے کی جگہ یا نشست گاہ) نہیں بنایا تھا۔ یا اس کو اپنا گھر بنا کے وہاں نہیں رہا کرتا تھا۔ تو اس سے قبل اس کا تحصیلِ (آتش) کرنا یعنی اس کا آگ لینا میرے دماغِ دل جگر سے جاری تھا۔ حاصلِ شعر یہ کہ سمندر پہلے مجھ سے آگ (گرمی) لیا کرتا تھا پھر وہ آتشکدے میں اپنی جاگیر بنا کے بیٹھ گیا۔

۲۵۲ شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

۲۵۳ مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کسقدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

۲۵۴ حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

۲۵۵ کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

(۲۵۲) ناموس۔ عصمت۔ عزت۔ رات کو وہ (محبوب) اپنے عاشق کے ساتھ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا۔ یعنی مصروفِ خلوتِ وصال تھا۔ اور وہ بزم خلوت اس قدر فروزاں تھی۔ یعنی دوست کے جلوہ سے اسقدر منور ہو رہی تھی۔ کہ (بسبب رشک کے) ہر شمع کا رشتہ یا (بتی) اس کے فانوس کے کسوت (لباس) میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ یعنی دوست کے جلوے اور شمع کی روشنی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ فانوس۔ وہ شیشے کا گلوب یا کپڑا وغیرہ جو شمع کے گرد لگا ہوا ہوتا ہے۔

(۲۵۳) مشہدِ عاشق۔ وہ جگہ جہاں عاشق شہید ہوا مشہدِ عاشق سے جو کوسوں دُور تک مہندی اُگتی ہے یا رب (وہ عاشق) پابوسی کی حسرت میں کسقدر ہلاک ہوا تھا

یعنی کتنی مرتبہ وہ دوست کے مہندی رنگے پاؤں کے چوسنے کی حسرت میں مرا تھا کہ جگہ جگہ مہندی ہی اس کی قبر پر پیدا ہوگئی ہے

(۲۵۴) محبت کا نتیجہ بجز امید ٹوٹنے کے اور کچھ نہ دیکھا۔ گویا ایک دوست کا دل دوسرے کے دل سے ملا ہوا ایک لب افسوس تھا۔ یعنی افسوس کی حالت میں انسان اپنے ہونٹ کاٹا کرتا ہے۔ تو دو دوستوں کے دل ملے ہوئے لب افسوس تھے۔ جو محبت کے نتیجہ پر افسوس کر رہے تھے۔

(۲۵۵) وہ بیماری جس میں غم کھانا پڑتا ہے۔ میں اس کی فراغت کا کیا حال کہوں۔ غم کے سبب سے جو خون دل کھایا۔ تو یہ خون کیموس نہیں بنا تھا۔ اور نہ پھر کیموس بلکہ آخر الذکر حالت سے بے نیاز ہو کر یہ براہ راست بشکل خون جسم میں ہضم ہوگیا تھا علم طب میں لکھا ہے۔ کہ ہم جو کچھ کھاتے ہیں پہلے ایک سیال سا بنتا ہے۔ جو کیلوس ہوتا ہے۔ پھر یہ کیلوس ہی کیموس بن کے خون بن جاتا ہے۔ اور اس خون کے جسم میں جذب ہونے سے انسان پرورش پاتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے۔ کہ میں بیماریٔ غم میں خون دل کھایا کرتا تھا۔ اور چونکہ وہ کیموس نہیں بنتا تھا۔ تو گویا اس فراغت کا کیا حال کہوں۔ یعنی جب معدے کو ایک کام نہ کرنا پڑا۔ تو سمجھو کہ اس کو فراغت ہوگئی۔ لیکن یہ فراغت اس لئے ہوئی کہ بجائے غذا کے غم کی بیماری میں میں خون دل کھایا کرتا تھا۔ مراد یہ کہ رنج و غم میں سخت مبتلا تھا۔ اور غم ہی خوراک بنگئی تو فراغت حاصل ہوگئی۔

---

۲۵۶ آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے ۔۔۔ صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

۲۵۷ قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

---

(۲۵۶) صاحب ۔ یہاں مراد محبوب ہے۔ اپنا سا منہ لے کے رہ جانا۔ حیران رہ جانا۔ صاحب یعنی محبوب کو اپنا دل کہیں دینے میں بڑا غرور تھا۔ یعنی وہ فخر یہ کہتا تھا

کہ میں تو کسی کو دل نہیں دیا کرتا۔ یعنی کسی پر فریفتہ نہیں ہوتا۔ تو اب وہ اپنا منہ آئینہ میں دیکھکر حیران کیوں رہ گئے۔ اس لئے کہ وہ اپنے ہی فریفتہ و مفتون ہوگئے ہیں۔

(۲۵۷) قاصد کو اپنے ہاتھ سے قتل نہ کیجئے۔ کیونکہ اس کو آپ کے پاس بھیجنے میں میرا قصور تھا۔ یہ قاصد کی خطا نہ تھی۔ کہ وہ آپ کے پاس چلا گیا۔ (یہاں اپنے ہاتھ سے گردن مارنا اس لئے کہا کہ دوست نے حالت خفگی میں قاصد کو بڑی بری طرح قتل کرنا چاہا ہے

---

۲۵۸ عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا ۔۔۔ جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

۲۵۹ جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے ۔۔۔ ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

۲۶۰ مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں ۔۔۔ شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

۲۶۱ بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے ۔۔۔ یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

۲۶۲ وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن ۔۔۔ غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

۲۶۳ گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار ۔۔۔ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

۲۶۴ دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں ۔۔۔ حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

۲۶۵ بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

---

(۲۵۸) عرض ۔ پیش کرنا۔ نیاز۔ نذر نیاز۔ عرض نیاز عشق۔ عشق کی نذر پیش کرنا اس پہ چڑھاوا چڑھانا۔ میں اب عشق کی نذر (نیاز) چڑھانے کے قابل نہیں رہا۔ (یعنی کسی پر اب اپنا دل دے کے عاشق نہیں ہو سکتا۔) کیونکہ جس دل پر مجھے ناز تھا۔ (یعنی جس دل کی نسبت مجھے خیال تھا کہ اس کو اور کوئی شخص مجھ سے چھین نہیں سکتا۔ وہ اب مجھ سے میرا دل لوٹ لے گیا ہے۔ (اور) وہ دل میرے پاس نہیں رہا۔

(۲۵۹) شمع کشتہ ۔ بجھا ہوا چراغ۔ درخور محفل۔ مجلس کے لائق میں (اب

داروغہ ہے۔ وہ ہمیں داخل نہیں ہونے دے گا۔ اور اس وجہ سے ہماری اس کی خوب لڑائی ہوگی۔

(۲۲۸) آہ وگریہ وزاری کرنے کی جرأت کہاں (چونکہ میرے جگر میں ہے) لہذا اب دل سے تنگ آ کے جگر کو یاد کیا ہے۔ کہ خوب آہ وزاری کروں۔ دل بے حوصلہ تھا جگر یاد آیا

(۲۲۹) پھر میرا خیال (یہاں مراد میری یاد) تیرے کوچے کی طرف ہے: مگر (شاید) مجھے اپنا گمشدہ دل یاد آیا ہے۔ کہ جو تیری گلی میں ہے۔

(۲۳۰) کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ یعنی ایسی بیابان کی سی ویران حالت ہے کہ اس سے زیادہ کیا ہوگی۔ تاہم اس دشت (ویران بیابان) کو دیکھ کر اپنا گھر یاد آیا جو اس سے بھی کچھ زیادہ گیا گزرا ہے۔ دوسرے معنی۔ ایسی ویرانی ہے کہ دشت کو دیکھ کے خائف ہوئے۔ اور گھر یاد آگیا۔

(۲۳۱) میں نے لڑکپن میں مجنوں کو پتھر اٹھا کے مارنا چاہا تھا۔ کہ اپنا ہی سر یاد آگیا۔ اور اسی کو اس سے چھوڑ دیا۔ (کیونکہ عشاق اپنے سر کے پھوڑے جانے کے بہت شائق ہوا کرتے ہیں۔ اور میں اوائل عمری میں اچھا خاصہ دیوانہ تھا۔

دوسرے معنی۔ میں لڑکپن میں مجنوں پر پتھر اٹھا کے مارنے لگا۔ تو بوجہ ہمدردی انسانی اپنا سر یاد آگیا۔ (کہ اگر اس پر کوئی یوں پتھر مارے تو اس کی کیا حالت ہوگی) لہذا پتھر مارنے سے باز رہا۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا ۲۳۲ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ۲۳۳ اس میں کچھ شائبۂ خوبی تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلادوں ۲۳۴ کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ۲۳۵ ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ۲۳۶ بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی ۲۳۷ گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا ۲۳۸ نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام ۲۳۹ ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی ۲۴۰ آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ۲۴۱ آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

۲۴۲ ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

---

(۲۳۲) ہوئی تاخیر (دیر) تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ یعنی آپ کو میرے پاس آنے میں جو کچھ دیر ہوئی ہے۔ تو اس دیر کا ضرور کوئی سبب ہے۔ ہاں آپ تو آتے تھے۔ یعنی آنا چاہتے تھے۔ مگر آپ کا کوئی عناں گیر بھی تھا۔ یعنی آپ جب آنے لگے۔ تو کوئی شخص (یعنی رقیب) آپ کا عناں گیر (باگ پکڑنے یا روکنے والا) بھی تھا۔ اسی نے آپ کو یہاں [illegible] نہ آنے دیا۔

(۲۳۳) مجھے اپنی تباہی کا (تمہیں کو اس کا سبب ٹھہرا کے) گلہ شکوہ کرنا بالکل بے جا ہے۔ کیونکہ اس میں کچھ شائبہ (حصہ) میری خوبی تقدیر کا بھی تھا۔ یعنی طنز سے کہتا ہے۔ کہ میری اچھی قسمت بھی (جس سے یہاں مراد بدقسمتی ہے) اس کی کسی حد تک ذمہ دار ہے۔

(۲۳۴) اگر تو مجھے بھول گیا ہو۔ تو میں تجھے نشان دے کے بتادوں۔ تاکہ تو یاد کرے کہ تیرے فتراک میں کبھی کوئی نخچیر (شکار) بھی بندھا ہوا تھا۔ پس وہ نخچیر میں [illegible]۔ اب تو تجھے یاد آگیا۔

(۲۳۵) تیرے وحشی (عاشق دیوانہ) کو قید خانہ میں تیری زلف یاد آتی ہے [illegible] کے ساتھ کچھ رنج زنجیر کے بھاری بوجھ سے بھی اس کو پہنچتا تھا۔ [illegible] زنجیر قیدی اپنے پاؤں [illegible] ہاتھوں میں جو لوہے کی زنجیریں ڈالتے ہیں [illegible] بھاری بوجھ۔

مرکے) زندگی کی حسرت (یعنی کسی بات کا حاصل نہ ہونا اس کا رنج) اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں۔ میں ایک بجھا ہوا چراغ ہوں جو محفل سے یہاں مراد دنیا کہتا ہے۔ کہ میں اب اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ کیونکہ حسرت سے مر چکا ہوں۔

(۲۷۰) شایان۔ قابل۔ اے دل اب میں (قاتل کے نزدیک اس کے) دست و بازو کے ذریعہ قتل کئے جانے کے قابل بھی نہیں رہا۔ (یعنی وہ قاتل مجھ کو قتل کرنے کے لائق ہی تصور نہیں کرتا) لہذا میرے مرنے کی کچھ اور ہی تدبیر کر۔ یعنی پہلے تو تو خیال کیا کرتا تھا کہ میں قاتل کے ہاتھ سے قتل ہو کے اس زندگی سے چھوٹ جاؤں گا۔ مگر وہ اب مجھ قتل کا بھی سزاوار نہیں سمجھتا۔ یعنی اس قدر مجھ سے نفرت ہے۔

تو اب کسی اور ڈھب سے مرنا چاہئے۔ دوسرے معنی کہ میں انتہا کمزور ہوں کہ قابل رحم ہوں نہ قابل قتل۔ اور دوست کی ہیبت ضعیف کا مارنا شایاں نہیں

(۲۷۱) بر روئے۔ مقابل۔ شش جہت۔ چھ طرف یعنی نیچے۔ اوپر۔ شمال جنوب مشرق مغرب۔ جس سے مراد دنیا ہے۔ اگر آئینہ سے مراد مصنف کی۔ دل کا آئینہ یعنی دل ہے (کیونکہ آئینہ کے اصطلاحی معنی دل بھی ہیں) تو اپنے صفائے قلب کے متعلق کہتا ہے۔ کہ در آئینہ یعنی میرے دل کا دروازہ ساری دنیا پر کھلا ہوا ہے (جس کی مرضی چاہے یہاں آئے سب کے لئے میرے دل میں جگہ ہے) یہاں ناقص اور کامل کا ہرگز کچھ فرق نہیں رہا۔

دوسرے معنی ا۔ یہ کہ آئینے کے صاف قلب والے سے متعلق کہتا ہے۔ کہ اس کا دروازہ ساری دنیا کے لئے کھلا ہوا ہے اس میں بوجہ اس کی صفائے قلب کے ناقص و کامل کا کچھ امتیاز نہیں رہا ہے۔

(۲۷۲) شوق (شوقِ دیدار) نے نقاب حسن کے بند کو وا کر دیا ہے۔ یعنی شوقِ دیدار بھلا اب اسقدر فائض المرام یا کامیاب ہوا ہے۔ کہ اس نے حسن کو بے پردہ کر دیا ہے اور اب اس کے اور میرے درمیان اور کوئی چیز بجز میری نگاہ کے (جو اس کے رخ

پر پڑتی ہے) حائل نہیں رہی ہے۔ مراد یہ کہ شوق کامیاب ہوا۔ اور دوست کی صحبت حاصل ہو گئی۔

(۲۶۳) حاصل۔ کسی کھیت کی پیداوار اور حاصل کے معنے انجام کے بھی ہیں۔ میرے دل سے وفا کی کھیتی کا شوق مٹ گیا۔ یعنی اب وفا کرنا میں نے ترک کر دیا کیونکہ ایسی وفا کی کھیتی کی پیداوار یا انجام حسرت اُٹھانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مراد حاصل وفائے عشق صرف حسرت یا دل کے ارمانوں کا دل ہی دل میں رہنا ہے۔

۲۶۴۔ میں عشق کی بیداد (ظلم) سے نہیں ڈرتا۔ مگر اے اسد مجھکو جس دل پہ ناز تھا (یعنی جس کی بدولت میں عشق کی مصیبتیں جھیل سکتا تھا۔ اور اسی لئے مجھے اس پہ فخر تھا) میرا وہ اب دل نہیں رہا۔ (یعنی وہ حوصلہ جاتا رہا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف ۲۶۶ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے ۲۶۷ گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا

شوق ہے سامان طرازِ نازشِ اربابِ عجز ۲۶۸ ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے ۲۶۹ میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے ۲۷۰ عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

۲۷۱ کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد

سنگ سے سر مار کر ہووے پیدا آشنا

(۲۶۶) رشک مجھے کہتا ہے کہ ہائے وہ غیر یار قیب سے اخلاص (یگی محبت) برتتا ہے۔ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر (کسی سے محبت نہ رکھنے والا) بھلا کسی کا (خواہ رقیب ہی کیوں نہ ہو) کب دوست بننے والا ہے۔

۲۶۷ ذرہ ذرہ یعنی تمام مترہ۔ میخانۂ نیرنگ۔ طلسمات کا شراب خانہ جو دوسروں پہ گویا جادو کر کے انھیں مبہوت بنا دینے والا ہو۔ گردشِ مجنوں مجنوں کا صحرا میں پھرنا۔ ساغر شراب کا پیالہ۔ جو کہ محفل میں سب کو شراب پلانے کے لئے

چھڑا یا جاتا ہے۔ یہاں ایک متحرک ساغر مراد ہے۔ دنیا کا ذرہ ذرہ یعنی دنیا تمام تر ایک میخانۂ طلسم ہے جو بدولت کسی متحرک ساغر کی حرکت کے باعث ہی طلسماتی میخانہ ہے (مراد قانونِ قدرت) جس طرح مجنوں کی صحرا نوردی لیلیٰ کی چشمک (یا آنکھوں کے اشاروں) سے آشنا ہے۔ یعنی اس سے متعلق ہے کہ لیلیٰ جدھر آنکھ پھیر دے مجنوں بھی ادھر کو چل دیتا ہے۔ گویا قانونِ قدرت لیلیٰ ہے اور چونکہ سب کچھ اس کے یہاں تابع ہے۔ تو وہ سب کچھ گویا مجنوں ہے کہ اس لیلیٰ کے اشارے پر چلتا ہے۔

۲۶۸ - سامان طراز۔ سامان کی صورت پیدا کر دینا۔ جیسے رقم طرازی لکھنے کی صورت میں لانا۔ نازش۔ فخر۔ ارباب عجز۔ عاجز لوگ۔ کوتاہ سرمایہ والے۔ عاجزوں کے لئے سامان و سامان کی کوئی صورت پیدا کرنے والا۔ محض ان کا شوق (عشق) ہے کہ جس پر وہ بڑا ناز کرتے ہیں۔ جیسے کہ صحرا کی ریت کا ایک ذرہ اور ذروں سے مل کر صحرا جیسی عظیم الشان ہستی بن جاتا ہے۔ اور صحرا دستگاہ ہے یعنی صحرا اس کی پشت و پناہ ہے۔ اور اسی طرح قطرہ (جو دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے وہ) دریا کا دوست ہے (تو گویا قطرے کو دریا سے ذرہ کو صحرا سے عشق ہے۔ جس کی بدولت وہ قائم ہیں۔ ایسا ہی ہم کم مایہ لوگوں کا عشق بھی ہمیں زندہ رکھتا ہے۔

۲۶۹ گلہ سنج۔ گلہ شکوہ کرنے والا۔ اپنے محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے رشک کا گلہ کرنے والا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہم دونو ایک خاص قسم کا عشق رکھتے ہیں۔ (جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کا رشک کر سکتے یعنی رقیب بن سکتے ہیں۔ مگر وہ عشق کیا ہے کہ) میرا زانو ہے (مراد غم و فکر کی وجہ سے میرا سر زانو پر دھرا رہتا ہے) اور تیرا آئینہ دوست ہے۔ کہ ہر وقت اپنے بناؤ سنگار کے عشق میں اس آئینے کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔

(۲۷۰) اب میں ہوں اور وہ آفت کا ٹکڑا (یعنی میرے لئے آفتیں اور مصیبتیں پیدا کرنے والا) میرا (وحشی یا) بیقرار دل جو کہ عافیت (صبر و سکون) سے بیٹھنے کا دشمن اور آوارہ گردی کا دوست ہے۔

(۲۷۱) نقاش کے معنے نقش کھینچنے والا۔ یہاں مراد پتھر پر نقش بنانے والا یعنی کامل فن سنگتراشی (جیسے کہ پتھر کی ایک سل پر مورتیاں بنائی جاتی ہیں) تمثال تصویر۔ یہاں کوئی بت کہ وہ بھی ایک تصویر ہی ہوا کرتی ہے۔ کوہکن فرہاد کہ جس کی نسبت مشہور ہے کہ پہاڑ کھودا کرتا تھا اور پہاڑ سے سر مار کے یا پتھر کھودنے والے تیشے سے سر پھوڑ کر مر گیا تھا۔

کوہکن نے سنگ یعنی پہاڑ کے پتھر سے اپنا سر پھوڑ کر چاہا تھا۔ کہ وصال شیریں حاصل ہو۔ مگر وہ حاصل نہ ہوا تو کہتا ہے کہ کیا اس طرح پتھر سے سر پھوڑنے سے بھی کوئی دوست پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی دوست مل جاتا ہے
لہذا فرہاد محض پہاڑ کے پتھر پر شیریں کی ابھری ہوئی تصویر کا نقش بنانے والا تھا (یعنی اس کا سنگ کوہ سے سر مارنا یہی معنی رکھتا ہے) ورنہ بجز اس کے اس کی محنت کا کچھ حاصل نہ ہوا۔ مراد یہ کہ اسکی سنگکنی سے شیریں کی ایک تصویر پہاڑ پر کھنچ گئی تھی۔ بلکہ ایران میں وہ ٹوٹا پھوٹا پہاڑ اب بھی عشق شیریں کا پتہ دیتا ہے۔ مراد اس سے فرہاد اپنے اصلی مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۲۷۲ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب ۲۷۳ آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے ۲۷۴ عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے ۲۷۵ بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں ۲۷۶ انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا ۲۷۷ ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو ۲۷۸ دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

۲۷۹ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

۲۷۲۔ اس پری چہرہ (معشوق) کا ذکر اور پھر ہمارا اس کے حسن کی تعریف بیان کرنا ایسا مؤثر تھا کہ آخر وہ شخص جو اس کے عشق میں ہمارا راز داں تھا۔ (اور جس کی مدد سے ہم اپنے معشوق سے ملا جلا کرتے تھے۔) وہی اس پر عاشق ہو کر ہمارا رقیب بن بیٹھا۔ مراد یہ کہ ہم اپنے معشوق کا ذکر ایسے پر تاثیر طریقے سے کرتے تھے کہ جو سنتا تھا اس کا عاشق ہو جاتا تھا۔

(۲۷۳) وہ یعنی دوست آج بزم رقیب میں ہے۔ اور آج ہی اس کو اپنا امتحان منظور ہوا ہے۔ کہ دیکھے وہ کسقدر شراب پی سکتا ہے۔ یہ معاملہ دیکھ کر عاشق فریاد کر کے کہتا ہے کہ یارب کیا آج ہی جبکہ وہ دوست بزم رقیب میں ہے اس کو بہت شراب پینے کا امتحان منظور ہونا تھا۔ کہ وہ اس سے خوب بدمست ہو جائے گا۔ تو رقیب کو اپنے دل کے ارمان نکالنے کا پورا پورا موقع ہاتھ آئے گا۔

(۲۷۴) عرش۔ کہتے ہیں ساتویں آسمان کے اوپر ایک مقام ہے۔ جو بہت بلند ہے۔ کہ اس سے آگے جانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اسی شرعی خیال کے برخلاف کہتا ہے کہ اے کاش! عرش سے بھی اُدھر یعنی اس کے ذرا پرے اس کی دوسری طرف ہمارا مکان ہوتا۔ تو ایک ایسی بلندی پر ہم ایک اور منظر (جائے نظارہ بنا سکتے) تاکہ وہاں سے ہم عرش کی بلندی کا مقابلہ کرتے۔ اور ثابت کر دیتے کہ انسان کا رتبہ عرش سے بھی زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے؛ "یا عرش سے ادھر ہوتا" کا مطلب بھلا

مکان عرش کے نیچے یعنی آسمانوں کے نیچے نہ ہوتا تو اس بلندی سے ہم عرش سے بھی زیادہ بلندی پر جا پہنچتے۔

(۲۷۵) اُن کا پاسبان بارے ہمارا آشنا نکلا (بے تکلفی کے سبب) وہ جسقدر ہمیں اپنے طعن و تشنیع سے ذلیل کریگا یا دوست کے مکان کے اندر جانے سے روکے گا اور ہمیں پکڑ کر ذلیل کریگا۔ ہم اس سے ہنس ہنس کر باتیں کریں گے۔ تاکہ وہ مل جائے اور ہمیں دوست کے مکان میں داخل ہو جانیکا ایک موقع ہاتھ آئے۔

(۲۷۶) دوست کو اپنا حال غم خط میں لکھتے لکھتے میری انگلیاں زخمی ہو گئیں (یعنی اسقدر خطوط طول طویل عرصۂ دراز تک لکھتا رہا۔ کہ انگلیاں پھوٹ گئیں اور خامہ (قلم) سے تو گویا خون ہی بہنے لگا۔ (یعنی وہ بھی عاجز ہو گیا) یہ درد دل کب تک لکھا کروں گا بہتر ہے کہ میں اُن کو خط بھیجنے کی بجائے ان کے پاس خود ہی چلا جاؤں اور اپنی انگلیاں دکھا دوں۔ تاکہ وہ میرا درد دل (رحم کھا کر) مجھ سے سُن لیں۔

(۲۷۷) دوست سے بطور شکایت کہتا ہے کہ میں نے آپ کے سنگِ آستاں (دہلیز کے پتھر) پر سجدہ کیا۔ آپ نے اسکو اپنے لئے ایک وجہ ننگ (شرم) تصور کیا اور اس پتھر کو وہاں سے بیفائدہ ہٹوا دیا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ حالانکہ وہ پتھر میرے سجدوں سے خود بخود ہی گھس کے مٹ جاتا۔

(۲۷۸) ہمزباں ہونا۔ ایک جیسی باتیں کرنا۔ یا مل کے ایک ہی مضمون پر اظہار خیالات کرنا۔ ہم نے اپنے دشمن یعنی رقیب کو بھی دوست کی شکایت میں اپنا ہمزبان بنا لیا ہے۔ تاکہ وہ ہمارے سامنے شکوہ سنجیٔ دوست میں ہمارا شریک ہو جائے تو بعد کو اگر اس سے ہماری چغلی کھائے کہ ہم اسے ایسا ویسا کہتے تھے۔ تو وہ دوست اس کو یہ کہہ کر "تو بھی تو ہماری شکایتیں کرتا تھا" ہرگز اس سے ملتفت نہ ہو۔

(۲۷۹) چونکہ جہلاء اکثر مکر و فریب سے دنیا میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شعرا کا خیال ہے کہ جاہل رہنا اور کوئی ہنر نہ سیکھنا ہی بہتر ہے۔ حالانکہ یہ غلط عقیدہ ہے تاہم مصنف کہتا ہے۔ اے غالب ہم کہاں کے دانا تھے۔ کس ہنر میں لاثانی تھے کہ ایسا کوئی سبب نہ ہوتے پر بھی آسمان ہمارا دشمن ہو گیا۔ یعنی ہم مبتلائے

آفات رہا کرتے ہیں۔ اہل کمال بوجہ حسد عوام مورد آفات ہیں۔ اسلئے فلک کا شکوہ کیا ہے

غزل

۲۸۰ سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے — کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

۲۸۱ رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا

---

(۲۸۰) سرمۂ مفت نظر۔ سرمہ بیچنے والے اپنے سرمے کی ایک سلائی خریدار کو مفت دے دیا کرتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی آنکھوں میں اسے ڈال کر سرمے کا امتحان کرے لہذا وہ سرمہ۔ سرمۂ مفت نظر کہلاتا ہے۔ "میں ایک سرمۂ مفت نظر ہوں" (یعنی سرمے کی خوبی کا امتحان کرنے کو جو اس سے ایک سلائی بھر کے خریدار کو دیجاتی ہے) میری یہی قیمت ہے۔ (گویا ایک حقیر سی چیز ہوں مگر مفید خاص و عام) "تاکہ میرے خریدار (یعنی میرے دوستوں اور مجھ سے تعلق رکھنے والوں) کو فائدہ پہنچے۔ اور میرا احسان ان پر رہے۔

(۲۸۱) ایک اردو مثل ہے" مارے اور رونے نہ دے" مصنف کہتا ہے کہ اے ظالم مجھے (پیٹ بھر کر) رونے دے۔ تاکہ میرے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ اور میں چپ ہو کے بیٹھ جاؤں۔ اور اس صورت میں تو بھی مجھے دیکھکر ہرگز متاثر نہ ہوگا ورنہ اب تو میں رونے لگتا ہوں۔ تو تو چیں بجبیں ہوتا ہے۔ اور تیرے چہرے سے عیاں ہوتا ہے۔ یعنی یہ ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ میرے دل میں غم عشق پنہاں ہے اور اس سے میں روتا ہوں تو تجھ کو خفگی سی پیدا ہوتی ہے۔ لہذا اس کے دور کرنے کو کہ یہ کسی طرح تیرے چہرے پر سے ظاہر نہ ہو۔ مجھ کو اچھی طرح رو لینے دے۔ اور دل کی بھڑاس نکال لینے دے۔

غزل

۲۸۲ غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں طرۂ گیاہ کا

۲۸۳ بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ — صید ز دام جستہ ہے اس دامگاہ کا

۲۸۴ رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

۲۸۵ مقتل میں کس نشاط سے جاتا ہوں کہ ہے — پُرگل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

۲۸۶ جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

---

(۲۸۲) عشاق اپنے معشوق کی سادہ وضع ہی کو جو قدرتی ہوا کرتی ہے بہت پسند کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ایک حسین شخص کو بناؤ سنگار کی کیا حاجت۔ اس کو قدرت ہی نے بناؤ سنگار کرکے یہاں بھیجا ہے۔ اس شعر میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ وہ غافل (محبوب) اپنی خود آرائی کے ناز (یعنی معشوقانہ شغلے) کے وہم میں لگا ہے۔ یعنی یہ محض اس کا ایک وہم ہے۔ کہ وہ اپنا بناؤ سنگار ہی سے اپنے ناز و انداز کا اثر دکھا سکے گا ــ یہاں تو گھاس کا ایک طرہ یا کونپل بھی ایسی نہیں ہے کہ جس پر صبا نے کنگھی نہ کی ہو۔ یعنی قدرت خود ہی ایک گھاس کے تنکے سے لے کر انسان تک ہر ایک چیز کو اسقدر خوبصورت پیدا کرتی ہے۔ کہ اس کو مزید سنگار کی کچھ ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

(۲۸۳) قدح۔ شراب پینے کا پیالہ۔ رنگ۔ رنگ۔ یہاں۔ لطف عیش۔ صید ز دام جستہ۔ وہ شکار جس کو پکڑنا چاہیں تو جال میں پھنس کر نکل جائے۔ یعنی ایک حسرت خیز شکار۔ اس دامگاہ۔ دامگاہ سے مراد وہ جگہ جہاں پر شکار کے پکڑنے کو جال بچھایا گیا ہو۔ اور اس دامگاہ سے یہاں مراد دنیا ہے۔ جہاں ہم عیش کو گویا اپنے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ مراد۔ دنیا سے عیش و عشرت کی کچھ امید نہ رکھ

کیونکہ یہ جال سے فرار شدہ شکار ہے کہ پھر ہاتھ نہیں آسکتا۔

(۲۸۴) رحمتِ الٰہی۔ اس کی نسبت مشہور ہے۔ کہ وہ گنہگاروں کو بھی بخشوا دیتی ہے۔ اس عقیدے کی بنا پر کہتا ہے کہ کیا بعید ہے۔ کہ رحمتِ الٰہی ہماری شرمندگی کے باعث ہمارے عذرِ گناہ نہ پیش کرنے کو قبول کرلے اور اسی بنا پر ہمیں خدا سے بخشوا کے بہشت دلوا دے۔ چونکہ اہلِ شرع کا قول ہے کہ ہر شخص جب تک اپنے گناہوں کا اقرار نہیں کریگا۔ وہ بخشا نہیں جائیگا۔ غالب اس کے برخلاف یہ لکھتا ہے۔ کہ ہم رحمتِ الٰہی سے آگے جا کے کہدیں گے کہ محض شرمندگیٔ گناہ ایسا نہیں کرنے دیتی تھی۔ تو کیا بعید ہے کہ وہ ہماری نیت ہی پر وہاں ہمارے گناہ بخشوانے کا باعث ہوجائے۔ بعض نسخوں میں اس شعر کا دوسرا مصرعہ یوں لکھا ہے۔ ؎

شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

(۲۸۵) پُرگل۔ پھولوں سے بھرپور۔ ہم کسقدر خوشی سے قتل گاہ کی طرف جاتے ہیں۔ گویا ہم سمجھتے ہیں۔ کہ دوست نے ہم کو اپنے ہاتھ سے زخمی کردیا ہے۔ اور وہ زخم گویا پھول ہیں۔ جن کی طرف ہماری نگہ لگی ہوئی ہے۔ اور ہماری اس نگاہ کے دامن میں وہ زخموں کے پھول بھرے ہوئے ہیں (اور ان پھولوں کو دیکھ دیکھ کر ہم خوش ہو رہے ہیں)

(۲۸۶) معشوق سے کہتا ہے۔ کہ تو ایک نگاہِ گرم (ہمارے جلانے کو بھی) ہماری طرف نہیں کرتا۔ (اس قدر ظالم شخص ہے۔) حالانکہ اسد کی جان اس نگہِ گرم کی مشتاق ہے۔ تجھے رحم کرنا چاہئے۔ اور تیرے التفات طلب کا وکیل پروانہ ہے۔ (جو کہ خود شمع کے جلنے کا مشتاق رہتا ہے۔ اور اس کی حالت پہ شمع رحم کیا کرتی ہے۔ یعنی اس کو اپنی نگہِ گرم سے جلاتی رہتی ہے۔ تجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہئے)

غزل

۲۸۷ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا — کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

۲۸۸ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

۲۸۹ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

۲۹۰ ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ — یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

۲۹۱ موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے — آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

۲۹۲ عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

۲۹۳ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

---

(۲۸۷) وہ ظلم کرنے سے باز آئے مگر کیا باز آئیں گے۔ اب کہتے ہیں کہ ہم تجھ کو منہ نہیں دکھائیں گے۔ (یعنی بوجہ ظلم۔ تو یہ ان کا منہ نہ دکھانا بھی تو ایک ظلم ہے۔ ان کے عاشق کے لئے۔ لہذا اس صورت میں بھی وہ ظلم کرنے سے گویا باز نہ آئیں گے۔)

(۲۸۸) عام طور پر مشرقی قوموں میں انسان کی قسمت ستاروں سے وابستہ سمجھی جاتی ہے۔ اور چونکہ ستارے گردش کرتے رہتے ہیں۔ تو حسبِ نجوم انسان کی قسمت بھی بدلتی رہتی ہے۔ یعنی کبھی اچھی اور کبھی بُری۔ لہذا کہتا ہے کہ رات دن سات آسمان چکر کھا رہے ہیں۔ ہم (اپنی موجودہ بدحالی سے) گھبرائیں کیوں (ان ستاروں کی گردش کے سبب) ہمارے لئے بھی کچھ نہ کچھ ہو رہیگا۔ یعنی ہمارے دن بھی پھر اچھے آجائیں گے۔

(۲۸۹) لاگ ہونا۔ دشمنی ہونا۔ لگاؤ ہونا۔ دوستی یا تعلق ہونا۔ اگر اس کی ہم سے دشمنی بھی ہو۔ تو ہم اس کو ایک قسم کا تعلق خیال کریں۔ لیکن (وہ جب ہمیں خاطر ہی میں نہ لائے اور) اس سے کسی طرح کا تعلق ہی نہ ہو تو پھر کیا دھوکا

کھائیں کہ وہ بھی ہمارا کوئی ہے۔ دوست یا دشمن۔

(۲۹۰) فریاد کرکے کہتا ہے کہ یا رب ہم نامہ بر کو خط دے کے پھر اس کے ساتھ ساتھ (اس وہم سے کہ شاید وہ ہمارا خط پہنچائے یا نہ پہنچائے) کیوں ہو لئے اس طرح نامہ بر کو بے اعتبار جان کر ہم اپنا خط کیسے پہنچائیں گے۔

(۲۹۱) ہم آستانِ یار پر بیٹھے ہیں تو اب بیٹھے ہی رہیں گے۔ اور اگر وہ دوست ہمیں اس ضد کی وجہ سے قتل بھی کر دے اور خون کی دھار ہمارے سر سے بھی بلند ہو جائے تو کیا ہم اُٹھ جائیں گے۔ ہرگز نہیں۔

(۲۹۲) راہ دیکھنا۔ کسی بات کے انتظار میں مضطربانہ طور پر بسر کرنا۔ مصنف کہتا ہے کہ اس دنیا میں کئی اتنے رنج پے درپے پہنچے۔ کہ ہم بے قرار ہو کے اپنے مرنے کی راہ دیکھا کئے۔ یعنی خود خواہش کرتے رہے۔ کہ مر جائیں۔ اب مر جانے پر دیکھئے کہ وہ ہمیں کیا دکھائیں۔ آیا اسی طرح پھر مرنے کی راہ یا اور کوئی اچھا انجام۔

(۲۹۳) وہ پوچھتے ہیں کہ غالب کون ہے (حالانکہ یہ پوچھنا یا تو ان کا تجاہل عارفانہ ہے۔ یا ان کی بے پروائی کہ ان کے ساتھ اسقدر وفا کی اور ابھی تک ان کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ میں کون ہوں۔) لہذا (یہ سنکر میرا کلیجہ تو جل اٹھا) کوئی انھیں بتائے کہ غالب کون ہے۔ یعنی وہ یہ بات انھیں بتائے کہ غالب ان سے اس قدر وفائیں کرتا رہا اور تعجب ہے کہ ابھی تک وہ اسے جانتے تک ہی نہیں ہیں۔

غزل

۲۹۴ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

۲۹۵ حریفِ جوششِ دریا نہیں خود داریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

(۲۹۴) ایک آئینہ کی پشت پر ہمیشہ کچھ کثیف مادہ مل دیا جاتا ہے تو اس کی منہ دیکھنے والی طرف اجلی اور روشن ہو جاتی ہے۔ اسی طرح چمن جس میں کھاد ہوتی ہے مٹی ہوتی ہے۔ میلا کچیلا پانی وغیرہ ہوتا ہے۔ اس زنگار یعنی کثیف مواد ہی سے وہ تر و تازہ ہوتا ہے۔ اور اس میں بادِ بہار چلتی ہے۔ (جو اسقدر صاف و شفاف ہوتی ہے جیساکہ آئینہ) لہذا یہ بادِ بہار ایک آئینہ کی مانند ہے۔ اور یہ چمن اس کا زنگار یا کثافت۔ پس ثابت ہوا۔ کہ لطافت (صفائی) بغیر کثافت (غلیظ مواد) کے اپنا جلوہ سے رنگ روپ ہی کچھ پیدا نہیں کر سکتی۔ گویا کہ لطافت و کثافت لازم و ملزوم ہیں۔

(۲۹۵) حریف۔ مقابلہ کرنے والا۔ دریا کے جوش کا مقابلہ کرنے والا ساحل دریا میں ضبط نہیں ہے۔ (یعنی دریا جب زور سے لہریں مارتا ہے تو مضبوط سے مضبوط ساحل کو بھی وہ توڑ دیتا ہے) لہذا جہاں تو ساقی ہو۔ یعنی اسقدر موثر شخصیت رکھنے والا انسان) تو تیرے سامنے کوئی پھر شراب نہ پئے۔ اور ہوشیار رہنے کا دعویٰ کرے تو اس کا وہ دعویٰ بالکل باطل ہے۔

غزل

۲۹۶ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
۲۹۷ تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد　　تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
۲۹۸ دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام　　مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہونا
۲۹۹ اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　اسقدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
۳۰۰ ضعف سے گریہ مبدل بدمِ سرد ہوا　　باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
۳۰۱ دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال　　ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
۳۰۲ ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا　　روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
۳۰۳ گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچہ کی ہوس　　کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

۴۴ تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

۳۰۵ بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

(۲۹۶) قطرہ جب دریا میں جاکر مل جاتا ہے۔ تو دیکھنے میں تو گویا فنا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ وہ دریا میں جاکر اور قطروں سے واصل ہوتا ہے۔ تو اس کی یہ حالت اس کے بقا کا باعث بن جاتی ہے۔ جو اس کے لئے گویا موجب عشرت ہے۔ (کیونکہ وہ اور قطروں سے ملا ہوا خوب لہر میں لیا کرتا ہے۔) اسی طرح درد یعنی دردِ عشق کا حد سے گذرنا۔ اس شخص کے لئے جو عشق الٰہی رکھتا ہو۔ بظاہر اس کی موت کا باعث بنا کرتا ہے۔ مگر چونکہ وہ مرکے واصل بحق ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کے درد کی دوا درد کا حد سے گذر جانا ہی ہوتا ہے۔

(۲۹۷) علی گڑھ میں ایسے تالے بہت بنتے ہیں۔ کہ جو بغیر چابی کے اس طرح کھلتے ہیں کہ اس تالے پر کوئی لفظ لکھا ہوتا ہے۔ اس لفظ کے حروف جب تالے کو پھرا پھرا کے باہم ملاتے ہیں تو وہ فوراً کھل جاتا ہے۔ اس تالے کو قفل ابجد کہا کرتے ہیں۔ بات بننا۔ اس سے یہاں مراد اس تالے کے حروف کا مل کر کوئی لفظ بنا لینا ہے۔

تیری اور میری قفل ابجد کی طرح جب کوئی بات بن گئی۔ یعنی ہم کسی خاص مقصد پر ایک دوسرے سے متفق ہوگئے۔ اور اس پر دونو رضامند تھے۔ تو میری قسمت میں چونکہ جدا ہونا لکھا تھا۔ میں اسی وقت تجھ سے جدا ہو گیا ہوں (حاصل یہ کہ تجھ سے میرا کوئی مقصد مثلاً وصال حاصل ہو بھی جاتا ہے۔ تو میں فوراً اس سے محروم ہو جاتا ہوں۔)

(۲۹۸) میرے دل میں جو زحمت یا دکھ موجود ہے اس کے علاج کی کشمکش یعنی سینکڑوں علاج کرتے ہیں۔ اور کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اتنی پیہم

تکلیفوں سے میرے دل کا خاتمہ ہو گیا۔ گویا دل ایک عقدہ یا گرہ تھی۔ جو کہ چارۂ زحمت سے (جس کو یہاں عقدے سے مشابہ کیا ہے) گھستے گھستے مٹ گئی۔ مزد یہ کہ ہمارے دردِ دل کا علاج الٹا ہمارے لئے مصیبت کا باعث ثابت ہوا۔

(۲۹۹) اب تو تُو نے ہم پر جفا کرنی بھی چھوڑ دی۔ گویا بالکل بے تعلق سا ہو گیا۔ اللہ اللہ۔ یعنی مقام تعجب ہے۔ تیرا اہل وفا کے ساتھ اس قدر دشمنی سے پیش آنا۔

(۳۰۰) ضعف کے سبب رونے کی طاقت نہ تھی۔ مگر یہ رونا ضبط کیا۔ تو آہ یعنی دم سرد کی صورت سے خارج ہونے لگا۔ کیونکہ آہ کرنے کو تو کچھ طاقت درکار نہ تھی۔ لہذا "گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا" اور یہ آہ یا دم سرد ہوا ہوتی ہے اور گریہ پانی تو گویا ہمیں ہوا سے پانی بن جانے کا یقین آگیا

(۳۰۱) انگشتِ حنائی۔ مہندی لگی ہوئی انگلی۔ جو سرخ مثل گوشت کے ہوتی ہے۔ کہتا ہے۔ کہ میرے دل سے تیری مہندی لگی ہوئی انگلی کا خیال ایسا ہی ناممکن ہو گیا۔ جیسے کہ گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا۔ جو غیر ممکن ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ تیری انگشت حنائی کا خیال میرے دل سے نہیں جاتا۔

(۳۰۲) پہلے دوسرے مصرعے پر غور کرو۔ مصنف کہتا ہے کہ روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا۔ میرے لئے ایسا مسرت انگیز ہے۔ جیسے کہ ابر بہاری کا برس کر کھلنا۔ یعنی جب مینہ خوب برس کر بادل صاف ہو جاتا ہے۔ تو دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ ایسا ہی میرے لئے۔ رو رو کر غم فرقت میں فنا ہو جانا شعر یوں ہے۔ ؎

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

(۳۰۳) گل تر۔ خوشبودار تازہ پھول۔ جس پر صبا گذرتی ہے۔ تو اس کی خوشبو پھیلتی ہے۔ گردِ رہِ جولانِ صبا۔ صبا کے دوڑنے کی راہ کی گرد یا مٹی۔ اگر گل تر کو تیرے کوچہ کی ہوس نہیں ہے۔ تو پھر اس کا صبا کے دوڑنے کی راہ کی

گرد بن جانا کیوں ہے۔ مطلب یہ کہ گل تر ٹوٹ کر زمین پر گرتا اور خاک ہو جاتا ہے تو یہ اس ہوس سے کہ اس کی خاک صبا کے چلنے کے رستے میں بطور گرد کے پڑی رہے تو صبا اس کو اڑا کے تیرے کوچے میں لے جائے۔

(۳۰۴) آئینہ سے یہاں مراد فولادی آئینہ ہے۔ وہ چونکہ دھات کا ہوا کرتا ہے۔ اس پر برسات کی غلیظ ہوا گذرتی ہے۔ تو وہ زنگار کھا کر سبزی مائل ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے۔ کہ برسات میں فولادی آئینے کا سبز ہو جانا دیکھ کہ برسات کی ہوا بوجہ پانی کی شمولیت کے غلیظ اور کثیف تھی۔ تو اس سے آئینہ زنگار کھا گیا۔ مگر یہ ہوا اگر صاف ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ بلکہ آئینہ خوب چمکتا رہتا پس اسی پر غور کر تاکہ بالعکس ہوائے صیقل (صاف شفاف ہوا) کا اعجاز (اثر) مجھ پر کھل جائے کہ یہ کسقدر اُجلا کرنے والی چیز ہے۔ کہ یہ جب تک چلتی رہتی ہے۔ سب کچھ صاف رہتا ہے اور زنگار نہیں کھاتا۔ یا جبکہ غلیظ ہوا ہی آئینہ کو سبز کر دے تو صاف ہوا تو اعجاز ہوگا

(۳۰۵) جلوۂ گل۔ پھول کی خوبصورتی۔ ذوقِ تماشا۔ دیکھنے کی لذت۔ چشم کا وا ہو جانا۔ یہاں مراد دیکھنے سے آنکھ کا کھل جانا یعنی دیکھکر اپنی بصیرت کو بڑھانا۔ اے غالب طرح طرح کے پھولوں کی خوبصورتی۔ دیکھنے یا سیر کرنے کی لذت بخشتی ہے۔ تیری آنکھ کو چاہئے کہ وہ ہر رنگ میں یعنی ہر کیفیت میں وا ہو جائے یا ہر کیفیت کو مشاہدہ کر کے اپنی بصیرت میں اضافہ کرے۔

غزل

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب ۳۰۶ دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن ۳۰۷ سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے ۳۰۸ سر پہ گذرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر ۳۰۹ موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو ۳۱۰ موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

جسقدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز ۳۱۱ دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر ۳۱۲ شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال ۳۱۳ ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ ۳۱۴ بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل ۳۱۵ موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل ۳۱۶ رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

۳۱۷ ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

---

(۳۰۶) ہو بال کشا۔ اپنے پر کھولے۔ بطِ مے۔ شراب کی صراحی جو بطخ کی شکل کی ہوتی ہے۔ دل و دست۔ قوت۔ دل و دستِ شنا۔ شناوری یعنی تیرنے کی قوت۔ پھر وہ وقت آیا (یعنی موسم بہار) کہ شراب کی لہر اپنے پر کھولے۔ اور بطخ کی شکل کی شراب کی صراحی کو وہی موجِ شراب شناوری یعنی شراب میں تیرنے کی قوت دے یا اس کے تیرنے کے لئے ساز و سامان بہم پہنچائے۔ مراد یہ کہ بہار آئی۔ خوب شراب اڑائے۔ موجِ شراب سے شراب کا دور بھی مراد ہے۔

(۳۰۷) سیہ مستی۔ بہت مستی۔ اربابِ چمن۔ باغ کے سبز و شاداب درخت تاک انگور کی ٹٹی چونکہ انگور کی شراب بھی بنتی ہے۔ اس لئے کہتا ہے۔ باغ کی سرسبز درختوں کی بدمستی کا سبب نہ پوچھ۔ انگور کی ٹٹی کے سایہ میں جب ہوا گزرتی ہے تو موجِ شراب بن جاتی ہے۔ (اور وہ سارے درختوں کو شراب پلا دیتی ہے) مراد یہ کہ بہار کی ہوا سے درخت جھوم رہے ہیں۔

(۳۰۸) بالِ ہما۔ ہما کا پر۔ جو شخص کہ شراب میں غرق ہو جائے وہ اچھا نصیبہ رکھتا ہے۔ کیونکہ موجِ شراب اگر کسی کے سر سے بھی گذر جائے یعنی وہ اس میں ڈوب بھی جائے (باعث شرابخوری کے تباہ بھی ہو جائے) تو وہ (موجِ شراب نہیں

بلکہ) سمجھو کر اس کے سر پر سے ہما اڑ گیا۔ اور عام طور پر مشہور ہے۔ کہ جس کے سر سے ہما گذر جائے۔ وہ بادشاہ ہو جاتا ہے یا اس کا نصیبہ جاگ اٹھتا ہے۔

(۳۰۹) برسات کا موسم بہت مستی آور ہوتا ہے۔ عجب کیا اگر موجِ ہستی (زندگی کی لہر یعنی زندگی کا سلسلہ یا اس کی گذران) بھی اس موسم کی (نشہ آور) ہوا کے اثر سے موجِ شراب یعنی شراب کی لہر ہی کا ایک سلسلہ بن جائے۔

(۳۱۰) طوفانِ طرب یا خوشی کی افراط کے سبب ہر طرف چار موجیں اٹھ رہی ہیں۔ موجِ گل (پھولوں کی کثرت ہر طرف) موجِ شفق (آسمان پر شفق کا دور تک پھیلنا) موجِ صبا (ہر طرف بادِ نسیم کا چلنا) اور موجِ شراب یعنی شراب کا دور۔

(۳۱۱) نباتات کی روح جسقدر جگر تشنہ ناز ہے یعنی اس کا جگر ناز کرنے یا لہلہانے کا مشتاق ہے۔ اسیقدر موجِ شراب اسکو آب بقا کے گھونٹ سے تسکین دیتی ہے۔ یعنی سبزۂ باغ کو شراب ہی پانی پہنچا کر بالغ کرتی ہے۔ اور اس کا یہ پانی آب حیات سے بڑھ کر قیمتی ہے۔

(۳۱۲) رگِ تاک۔ انگور کی رگ۔ شہپرِ رنگ۔ ایک رنگدار بہت بڑا پر۔ موجِ شراب انگور کی رگوں میں (یعنی اس کے اندر) خون کی صورت بنکر چل رہی ہے کیونکہ وہ ایک بہت بڑے رنگدار پر (مراد شراب کے خونی رنگ) سے بال کشا ہوئی ہے یعنی اڑ رہی ہے۔ حاصل شعر یہ کہ شراب کا لال لال رنگ انگور کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ (اگر اس کو انسان پئے گا۔ تو اس کا خون بھی بڑھ جائے گا۔

(۳۱۳) چونکہ میرے تصور میں موجِ شراب اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اس لئے میرے اس تصور میں یعنی گذرگاہِ خیال میں گویا موجۂ گل سے چراغاں ہو رہی ہے یعنی شراب کی رنگت سرخ ہوتی ہے۔ اور گلاب کے پھول کا رنگ بھی لال لال ہوتا ہے۔ اور وہ اسقدر خوشنما ہوتا ہے۔ کہ گویا ایک چراغ روشن ہے تو مطلب

شعر یہ ہوا کہ میرے تصور میں شراب کا لال لال رنگ اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ اور وہ لال لال رنگ گلاب کے پھول کی سرخی کی لہر بنکر میرے خیال کو گویا چراغاں بنا رہی ہے۔

(۳۱۴) شراب کی لہر نشو و نما چاہتی ہے۔ (یعنی سمندر کی لہر کی طرح) مگر چونکہ جام مے میں محدود جگہ ہوتی ہے۔ وہ نشے کے پردے میں بالنے کی صورت اختیار کر کے دماغ میں جا پہنچتی ہے۔ اور وہاں دماغ کے تماشے میں محو ہے۔ یعنے شرابی کے دماغ میں طرح طرح کے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔

(۳۱۵) طوفان بر پا کرنے والا۔ چھا جانے والا۔ طوفانی کیفیتِ فصل۔ یہاں مراد فصل بہار کی مسرت افزا کیفیتوں پر غالب۔ سبزۂ نوخیز۔ نئی نئی پودے نئے نئے پودوں کی لہر یعنی ان کے ہوا میں لہرانے سے لیکر موجِ شراب یعنی اس کے نباتات سے کشیدہ ہونے اور پھر جام شراب میں لہریں مارنے تک (یہ دونو حالتیں) یکساں طور پر یعنی ایک ہی عالم میں فصلِ بہار کی تمام (مسرت افزا) کیفیتوں پر چھائی ہوئی ہیں۔ یعنی ادھر باغ کا سبزہ لہرا رہا ہے۔ ادھر شراب کا دور چل رہا ہے۔ اور یہی کیفیت تمام فصل بہار پر غالب ہے۔

(۳۱۶) موسم گل۔ بہار کا موسم۔ ہنگامۂ ہستی۔ زندگی کی تمام مختلف کیفیتیں۔ یا حالتیں۔ شرحِ ہنگامۂ ہستی۔ زندگی کی مختلف حالتوں کی شرح کرنے والی۔ شہپرِ قطرہ بہ دریا۔ قطرہ کو دریا کی طرف لے جا کے اس میں ملا دینے کا موجب ہونا۔ موجِ شراب۔ یہاں مراد شراب کا نشہ۔

زہے (خوشا) موسم گل۔ (یعنی بہار کا عالم) جو کہ انسان کی زندگی کی صدہا مختلف کیفیتوں کی شرح ہے یعنی اس موسم میں ہم صدہا قسم کی کیفیتوں سے (جنکا پیشتر کچھ علم نہیں ہوتا) لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گویا موسم بہار ان کی شرح کرتا ہے۔ اسی طرح خوشا شراب کی موج یا اس کا نشہ (جس کے باعث انسان کے دل پر صدہا

قسم کے حالات گذرتے ہیں ۔) گویا یہ ایک قطرہ کو دریا میں ملانے کی کوشش کرتی ہے یعنی انسان شراب پی کر (باوجود اپنی محدود و بساط کے) طرح طرح کی کیفیتوں سے سرور حاصل کرتا ہے ۔ لہذا یہ ایک قطرہ کو دریا میں جا ملاتی ہے ۔ اس شعر میں موسم گل جو چند روزہ ہوتا ہے اس کو موج شراب سے کہ وہ بھی محض تھوڑی سی مدت کے لئے سرور پہنچاتی ہے ۔ مقابلہ کرکے دکھایا ہے ۔ کہ یہ دونو چیزیں محدود ہستی رکھتی ہیں ۔ مگر ان کے نتائج یا حلقۂ اثر بہت وسیع ہوتا ہے ۔

(۳۱۷) اے اسد جلوۂ گل دیکھکر یعنی موسم گل میں گلاب کے سرخ پھولوں کی خوشنما رنگت کو دیکھکر میرے تو گویا ہوش اُڑ جاتے ہیں ۔ یعنی میں اپنے بس میں نہیں رہتا ۔ (اور شراب پینے کی خواہش کرتا ہوں ۔) کیونکہ پھر وہ وقت آیا کہ شراب کی موج بال کشا ہو ۔ (اپنے پر کھول کے اُٹھے) یعنی شراب کا دور چلے ۔

غزل

افسوس کہ دیدان کا کیا رزق فلک نے ۳۱۸ جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا ۳۱۹ خالی مجھے دکھلاکے بوقتِ سفر انگشت

۳۲۰ لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

---

(۳۱۸) دیدان ۔ کیڑے ۔ درخورِ عقدِ گہر انگشت ۔ یعنی وہ انگلی جو لعل و گوہر پہنائے جانے کے قابل تھی ۔ افسوس کہ جن لوگوں کی انگلی لعل و گوہر پہنائے جانے کے قابل تھی ۔ اُن کو آسمان نے کیڑوں کا رزق بنا دیا ۔ یعنی وہ لوگ مر گئے ۔ تو ان کی انگلیاں قبر میں کیڑوں کی خوراک بن گئیں ۔ حالانکہ وہ جیتے تھے تو انہی انگلیوں میں لعل و گوہر پہنا کرتے تھے ۔

بعض نسخوں میں دیدان کی بجائے دندان لکھا ہے ۔ اس صورت میں یہ معنی

ہیں کہ جن لوگوں کی انگلیاں لعل و گوہر سے عقد حاصل کرنے یعنی ان کو پہننے کے قابل تھیں ۔ افسوس کہ (انقلاب زمانہ نے) ان کو دانتوں کا رزق بنا دیا ۔ یعنی وہ لوگ انگشت بدنداں ہیں ۔ اور حسرت سے اُنگلیاں اپنے دانتوں میں چباتے رہتے ہیں ۔

(۳۱۹) سفر کے وقت نشانی کے طور پہ چھلا وغیرہ کوئی چیز دی جاتی ہے تاکہ مسافر کی یادگار رہے ۔ شاعر یہاں لکھتا ہے ۔ کہ تو مجھ سے رخصت ہوا ۔ اور تیرا چھلے کا نہ دینا یعنی اپنی خالی انگلی دکھاکے (یا شوخی سے انگوٹھا دکھاکے) چلدینا میرے لئے یہی تیری نشانی کافی ہے ۔ گویا چلتے وقت تو نے مجھ سے وہ سلوک بھی نہ کیا جو ایک معمولی دوست کسی دوست سے کیا کرتا ہے ۔

(۳۲۰) اے اسد میں اپنے دل کی جلن سے گرم گرم شعر لکھتا ہوں ۔ تاکہ میرے حرف (حرف زدن یا شاعری) پر کوئی انگلی نہ رکھ سکے ۔ گویا اعتراض نہ کر سکے ۔ اور اگر کرے یعنی ان گرم حرفوں پر انگلی رکھے ۔ تو اس کی انگلی ہی جل جائے ۔ مراد یہ کہ وہ منہ کی کھائے ۔ سخن گرم سے مراد اعلیٰ ۔ بہت پُر اثر اشعار ہیں ۔

غزل

۳۲۱ رہا گر کوئی تا قیامت سلامت پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
۳۲۲ جگر کو مرے عشقِ خونابہ مشرب لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت
۳۲۳ علی الرغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں مبارک مبارک سلامت سلامت

۳۲۴ نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

---

۳۲۵ مُنہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

(۳۲۱) حضرتِ سلامت۔ کسی سے خطاب کرتے وقت مؤدبانہ لہجہ میں عموماً حضرتِ سلامت کہا کرتے ہیں۔ یعنی آپ بخیر و عافیت زندہ ہیں۔ حضرت سلامت اگر کوئی شخص روزِ قیامت تک بھی زندہ رہے یعنی جس وقت تک یہ ساری دنیا زندہ رہے گی تو پھر بھی ایک روز مرنا ہوگا۔ یعنی روزِ قیامت کو تو صرف مردے ہی زمین سے اٹھیں گے۔ لہذا اس سے قبل کسی نہ کسی روز ضرور مر کر ہی اگلے جہان میں جانا ہوگا مراد یہ کہ موت سب کے لئے لازمی ہے۔

(۳۲۲) خونناب مشرب۔ جس کا مشرب یا دستور خون کا بے دریغ بہانا ہو۔ یعنی جگر (جس سے ہر وقت خون جاری رہتا ہے۔) گو عشق بایک خط لکھتے وقت خداوند نعمت سلامت لکھ کر خطاب کیا کرتا ہے۔ اور خداوند نعمت اس لئے لکھتا ہے کہ گویا عشق میرے جگر ہی کے خون سے پرورش پاتا ہے۔ (خداوند نعمت بمعنی خورش دینے والا)

(۳۲۳) علی الرغم۔ کسی کی توقع کے خلاف مطلب یہ ہے دشمن کی توقع کے خلاف وفا کا شہید ہو گیا ہوں۔ یعنی رقیب مجھے کہا کرتا تھا کہ میں وفا کر کے شہید نہیں ہوں گا۔ یعنی وفا کرنا اسقدر مشکل ہے۔ کہ میں اس کو نباہ ہی نہیں سکوں گا۔ مگر چونکہ میں نے ایسا کر دکھایا ہے۔ تو رقیب کو طنز سے بہ تکرار کہتا ہے۔ مبارک مبارک یعنی تیرا وہ کہنا تجھے مبارک (جو درحقیقت نامبارک مراد ہے) اور سلامت۔ سلامت (یعنی اے رقیب تو ایسا کہنے والا زندہ رہے۔ جس سے مراد یہ کہ تو جلد ہی جہنم واصل ہو جا) علی الرغم۔ علی۔ اوپر۔ رغم۔ خاک میں آلودہ ہونا۔ یعنی کسی کے جھٹلانے سے جب وہ ذلیل و خوار ہو جائے۔ تو اس کا خاک آلودہ ہونا

(۳۲۴) سرو برگ۔ ساز و سامان۔ وسائل۔ ادراک۔ سمجھ۔ ادراکِ معنی: حقیقت کا بخوبی سمجھنا۔ تماشا۔ ظاہری حالت کا دیکھنا۔ نیرنگ۔ ایسی کوئی کیفیت جو دل میں حیرانی یا تعجب پیدا کرے۔ نیرنگ صورت محض ظاہری صورت سے دل کے حیران کرنے والی کیفیت۔

اگر مجھے ایسے وسائل حاصل نہیں ہیں۔ کہ ادراکِ حقیقت کر سکوں۔ یعنی یہ بات معلوم کر سکوں۔ کہ دنیا کیا چیز ہے۔ تو اس کی ظاہری تعجب انگیز کیفیتوں کا تماشہ ہی سہی۔ یعنے اگر حقیقت شناس نہیں ہوں تو بھی صورت کا تماشائی ہی سہی۔

(۳۲۵) اے غالب لوگ میرے محبوب کو کس وقت میرے بستر کے سرہانے یعنی بالیں پر لائے۔ جبکہ میں قریب نزع تھا۔ اور میں اپنی آنکھیں اپنے محبوب کو دیکھنے کے لئے کھولنے کو تھا۔ کہ اسی وقت یہ مُند گئیں۔ یعنے میں مرنے لگا۔

غزل

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست ۳۲۶ دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر ۳۲۷ کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجئے ۳۲۸ صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے ۳۲۹ کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے ۳۳۰ دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں ۳۳۱ بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک ۳۳۲ مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ ۳۳۳ سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ۳۳۴ ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے ۳۳۵ یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست
۳۳۶ یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالب ز بس تکرارِ دوست

(۳۲۶) بازارِ دوست۔ بازار وہ جگہ ہوتی ہے کہ جہاں سب لوگ کچھ نہ کچھ خریدنے کو جاتے ہیں بازارِ دوست۔ دوست کا حسن و جمال اور اس سے ہر شخص کا اسے دیکھ کر مسرت حاصل کرنا۔ دودِ شمعِ کشتہ بجھے ہوئے چراغ کا دھواں۔ جب دیئے کو بجھانے

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ ۳۴۰ تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

۳۳۹ اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

لو ہم مریضِ عشق کے بیماردار ہیں ۳۴۰ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

(۳۳۷) آج گلشن میں برنگِ دگر (یعنے ایک اور طرح کا) بندوبست ہو رہا ہے چنانچہ فاختہ کا طوقِ گردن (اس کی گردن پر کا گول اور سیاہ نشان) گلشن کے دروازے پر حلقۂ بیرونِ در (یعنی دروازے کے باہر کا زنجیر) بن گیا ہے۔ (اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے) مطلب یہ کہ قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ درِ باغ ہو گیا۔ یہ ایک عجیب قسم کا انتظام ہے اور اسی کی طرف مصرعۂ اول میں اشارہ اشارہ کیا گیا ہے۔ عام الفاظ میں اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ قمری کا طوقِ گردن۔ شعرا کے نزدیک اس کی محبت کی علامت ہے۔ (یعنی اس کے گلے میں محبت کا طوق ہے۔ (جیسا کہ کہا کرتے ہیں اس کی گردن میں لعنت کا طوق) اب وہ باغ کے اندر اڑتے پھرنے کی بجائے۔ باغ کے باہر دروازے سے بند دی گئی ہے۔ (کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در کیسے بنتا) لہٰذا گلشن سے عشق و محبت کو خارج کر دیا گیا ہے۔ اور یہ ایک بالکل نئی بات ہے اسی لئے کہتا ہے ؎

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج

(۳۳۸) اثر۔ یہاں مراد زخم کا نشان (دیکھو غیاث اللغات)۔ آج تارِ نفس (میری سانس کا دھاگہ یعنی خود نفس) کمندِ شکارِ اثر ہے یعنے (دل کے) نشانِ زخم کو شکار کرنے کے لئے گویا ایک کمند کا کام دے رہا ہے۔ اسی لئے اس زخم کی بدولت ہر فغاں کے ساتھ ایک ٹکڑا دل کا بھی باہر نکل آتا ہے۔

(۳۳۹) اے عافیت (سلامتیٔ جان) اب تو ہم سے کنارہ کش ہو۔ اور اے بندوبست (روک تھام یا انتظام) تو بھی جا کہیں اور طرف چلا جا کیونکہ اب تمہاری

کچھ ضرورت نہیں رہی اور ہمارے رونے کا طوفان مکان کے در و دیوار کے درپے ہے۔ کہ اس کو گرا کے چھوڑے گا۔

(۳۴۰) لو یعنے فرض کر لو کہ ہم مریضِ عشق کی تیمارداری کرنے والے ہیں اور مسیحا سے اس کا علاج کرا رہے ہیں۔ اگر اس صورت میں بھی بیمارِ عشق اچھا نہ ہوا۔ تو پھر مسیحا کا کیا علاج یعنی اس کو کیا سزا دی جائے گی۔ مراد یہ ہے کہ مریضِ عشق کو مسیحا بھی تندرست و توانا نہیں بنا سکتا۔ حالانکہ مسیحا یعنی حضرتِ مسیح مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔

غزل

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ ۳۴۱ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ ۳۴۲ برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل ۳۴۳ کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس ۳۴۴ بکوریٔ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز ۳۴۵ نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

۳۴۶ مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ نہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

(۳۴۱) انجمنِ آرزو۔ ایک ایسی محفل کہ جس میں امیدیں بستی ہیں۔ کہتا ہے نا امید ہو یعنے امیدوں کی محفل سے نفس (یا اپنے آپ) کو باہر نہ کھینچ اگر (اگر اس وقت) تجھے شراب حاصل نہیں ہے۔ تو ساغرِ شراب کا انتظار کر۔ (غرض ہمیشہ شراب کی تمنا رکھو)

(۳۴۲) آئینہ سے یہاں مراد آئینۂ دل ہے۔ اور گرمی بمعنے سرگرمی یا شوق۔ دوست کے دیدار یا اس کی دید کی تلاش کی کوشش میں جو میں کمال سرگرمی سے کام لے رہا ہوں اس کا کچھ پوچھ نہ لے ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے پاؤں میں کیا خود دل میں بھی کانٹے پڑ

گئے ہیں۔ اور) تو برنگِ خار (جس طرح کانٹا نکالتے ہیں) میرے آئینۂ دل سے جوہر کو نکال لے یعنے وہ میرے دل کے کانٹے وہاں پر شکل جوہر بن گئے ہیں۔ (جیسے کہ آئینے میں کانٹوں سے نظر آیا کرتے ہیں)۔

(۳۴۳) اپنے دل سے باتیں کرتا ہوا کہتا ہے کہ اے دل۔ تو نے دوست کے انتظار کو (جسکے سبب بستر پر بیکار پڑا رہتا ہے) اپنے آرام کرنے کا ایک بہانہ ٹھیرا لیا ہے (اور دوست کی تلاش کو گھر سے نہیں نکلتا) تجھے یہ کس نے اشارہ کیا تھا۔ یعنے کس نے ترغیب دلائی تھی۔ کہ (اس طرح بیکار پڑا رہے اور) اپنے بستر کے ناز یا احسان کھینچا کرے۔ مطلب یہ کہ اٹھ اور دوست کی تلاش کر۔ جب دل سے اس قسم کا کوئی خطاب کیا جائے تو گویا وہ خود ہی کو ہوا کرتا ہے۔

(۳۴۴) باغ میں بادہ خوری ہو رہی ہے۔ اور ایسے موقع پر کہتا ہے کہ تیری طرف بحسرت نگراں نرگس ہے؟ یعنی وہ حسرت کے ساتھ (یا تجھ سے رشک کھا کے) تیری طرف دیکھ رہی ہے۔ (کہ اسے جام شراب کیوں نہیں دیا جاتا) مگر تو ایک ایسے رقیب (مراد نرگس) کے دل اور آنکھ کے اندھا ہونے کے باعث ساغر کھینچ یعنے خوب شراب پی۔ نرگس ان باتوں کو کچھ سمجھ نہیں سکتی۔ یعنے اس کا دل اور آنکھ دونوں اندھے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے کہ معشوق کو باغ میں شراب خوری کی تحریک دلاتا ہے۔ اور کہتا ہے تو وہاں شراب پینے سے کچھ شرم نہ کر کیونکہ باغ میں صرف نرگس کا پھول دل و چشم رکھتا ہے مگر اس کے دل و چشم بینا نہیں ہیں۔ لہٰذا تو ان کے گویا اندھا پن کا فایدہ اٹھا۔ اور خوب شراب پی۔

(۳۴۵) ودیعت۔ امانت۔ ودیعتِ ناز۔ ناز کی امانت۔ نیام پردۂ زخم جگر۔ نیام ایک خول یا غلاف یا پردہ ہوتا ہے۔ کہ جس میں تلوار یا خنجر کو رکھا کرتے ہیں یہاں زخم جگر کے پردے کو نیام فرض کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں ودیعت ناز کو خنجر تصور کیا گیا ہے۔ اور حق ودیعت ناز۔ دوست کا نیم غمزہ کہ مثل خنجر ہے اور عاشق کے پاس امانت ہے۔

تیرے خنجر ناز کو (جب کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوا تو) میں نے اپنے پردۂ زخم جگر کے نیام میں جگہ دی (اور اس کو بطور امانت وہاں رکھا) اب اس امانت رکھنے کا یا ودیعتِ ناز کا حق یوں ادا کر کہ نیم غمزہ دکھا (یعنی اپنی آنکھ اور ابرو سے ادا دکھلا دے) تاکہ تو پناہ وہ خنجر ناز (جو پردۂ زخم کے نیام میں ہے) نکال لے۔ خلاصہ مطلب یہ کہ ناز تیرا (خنجر تھا) جو جگر میں گڑ گیا۔ اور وہاں وہ تیری امانت پڑا رہا۔ اب تو اسے دیکھ لے تو جو زخم جگر میں پہنچا ہے۔ اس کی تلافی مافات ہو جائے۔

(۳۴۶) صہبا۔ شراب۔ پیرو۔ سفرہ۔ دسترخوان پر۔ سمندر۔ ایک کیڑا ہے جو ہمیشہ آگ میں رہا کرتا ہے۔ میرے پیالۂ شراب میں آتش پنہاں (یعنے پینے کے بعد گرم تاثیر رکھنے والی) شراب موجود ہے۔ اس لئے میرے دسترخوان پر بھی سمندر کے دل کے کباب بنا کر لگا دو گویا جیسی شراب گرم ہے کباب بھی ویسے ہی گرم تاثیر رکھنے والے ہونے چاہئیں۔

غزل

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ۳۴۷ بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ۳۴۸ ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے ۳۴۹ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خون ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنے ۳۵۰ ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

درخور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا ۳۵۱ نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہل جنوں کیلئے آغوش وداع ۳۵۲ چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ۳۵۳ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی ۳۵۴ کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

۳۵۵ آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

(۳۴۷) غمزہ - آنکھوں سے اشارہ کرنا۔ کہتا ہے میرے بعد۔ یعنی جب میں مر گیا۔ تو حُسن یعنے اس دوست کا حسن جو غمزہ کی کشاکش میں تھا۔ یعنی غمزہ اس کو عاشق کے قتل کی تحریک دلاکر ایک قسم کی کشمکش اس سے (یعنے حُسن سے) رکھتا تھا کہ تو ضرور عاشق کو قتل کر۔ اب میرے مرنے کے بعد غمزے کی وہ کشاکش جاتی رہی اور اس سے حسن دوست کو بھی مخلصی نصیب ہوئی۔ بارے اب وہ اہل جفا (یہاں مراد حسن اور غمزۂ دوست) میرے مرنے سے گویا آرام میں ہو گئے ہیں۔

(۳۴۸) اب شیفتگی (عاشقی) کے اعلےٰ مرتبے کے قابل ہی کوئی شخص نہیں رہا کیونکہ میرے مرنے سے ناز و ادائے دوست کی معزولی ہو گئی۔ یعنے اس نے کسی اور پر ناز کرنا ہی ترک کر دیا۔

(۳۴۹) شمع جب بجھتی ہے تو گویا وہ مر جاتی ہے پھر اس سے دھواں اٹھتا ہے (تو وہ بوجہ اپنے سیاہ لباس کے گویا اس پر ماتمی لباس پہن کے ماتم کرتا ہے) اسیطرح میرے مرنے کے بعد میرا شعلۂ عشق (میرے وجود سے) بھڑک کر اٹھا۔ اور میرے ماتم میں سیاہ پوش ہو گیا۔

(۳۵۰) احوالِ بتاں - یعنی معشوقوں کے حال پہ میرا دل قبر میں خون ہوا جاتا ہے۔ کہ ان کے ناخن (جو میرے خون سے تر رہتے تھے) اب میرے بعد حنا کے محتاج ہو گئے یعنے مجھے ان کی اس تکلیف کا بیحد رنج ہے۔

(۳۵۱) درخور - قابل + عرض - پھیلنا + درخورِ عرض - پھیلنے کے لائق + جوہر کرشمہ + جوہر بیداد - ایسا جوہر یا کرشمہ کہ جس سے ظلم صادر ہو۔ نگہ ناز - ناز کے ساتھ دیکھنے والی نظر جو بڑی مؤثر ہوتی ہے۔ اور اگر ایسی نظر اس آنکھ سے نکلے کہ جس پر سُرمہ لگا ہو تو وہ گویا بہت زیادہ مؤثر یا قاتل ہوا کرتی ہے کہ جس کے بیداد یا ظلم کے ہاتھ سے عشاق فریادی ہوا کرتے ہیں۔ مطلب شعر۔ میرے بعد اس کی آنکھ میں سُرمہ نہیں لگا۔ (بوجہ ماتم پرسی کے) تو گویا اس کی نگہ ناز سُرمے سے خفا ہے یعنے سرمہ الگ اور اس کی نگہ ناز الگ ہے لہٰذا وہ جوہر بیداد یعنی ظلم کا کرشمہ یا جوہر جس سے مراد یہاں سُرمہ ہے

(کیونکہ سرمہ بھی ایک کرشمہ یا جوہر تھی کی ایسی چیز ہوتی ہے اور جس آنکھ میں سرمہ لگا ہو گویا وہ بڑا ظلم یا بیداد کرنے والی ہوا کرتی ہے) اب اس کو درخورِ عرض یعنے اپنے پھیلاؤ کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ مطلب یہ کہ نگاہ ناز جب اس سے الگ تھلگ ہے۔ تو سرمہ اس میں جاکے مل نہیں سکتا۔ تاکہ بذریعہ نظر ہر طرف پھیل سکے (سُرمے سے خفا۔ سرمہ نہیں لگایا بوجہ مرگ)

(۳۵۲) میرے بعد جنوں یعنی جنونِ عشق - اہل جنوں (یا عشاق) کے لئے آغوشِ وداع ہوگا۔ یعنی وہ ان سے بغل گیر ہو کے اور آخری ملاقات کر کے پھر جدا ہو جائیں گے۔ اسی طرح دیکھنا کہ چاک یعنے چاک گریباں (وہ کھلی ہوئی جگہ جو گریبان کے سامنے کرتے کو گردن میں سے گزارنے کیلئے ہوا کرتی ہے) گریبان سے جدا ہوتا ہے گویا نہ جنون رہیگا نہ اہل جنون اور نہ چاک نہ چاک گریباں کرینگے وہ بوجہ دیوانگی پھاڑ سکیں گے۔ حاصل شعر یہ کہ جنونِ عشق میرے ہی دم کے ساتھ وابستہ ہے بعد کو کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔

(۳۵۳) حریف - مدِ مقابل + مئے مرد افگن - آدمی کو گرا دینے والی شراب (اصلاً) تو جہ دلانا + عشق جو ایک ایسی مے ہے یعنی خاص نشہ ہے کہ مرد افگن ہے یعنی اس کے سامنے کسی آدمی کی کیا مجال کہ ٹھہر سکے (یہ سب کو چاروں شانے چت گرا دیتا ہے) اس کا حریف کون ہوتا ہے یعنی "کون اس کا مدِ مقابل بنے گا" (وہ ذرا ہمارے سامنے آئے) میرے مرنے کے بعد یہ صلا لبِ ساقی سے مکرّر ملی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ساقی معشوق میرا جانشین انتخاب کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ یہ صلا اس نے مکرر دی ہے۔ تو گویا کوئی حوصلہ نہیں رکھتا کہ میرے بعد میری جگہ پر اس کا عاشق بن سکے اور میرے برابر بشاشت عشق برداشت کر سکے۔

دوسرے معنی :- میرے مرنے کے بعد لب ساقی سے مکرّر یہ صلا آئی ہے کہ اب مئے مرد افگن عشق کا حریف کون ہوتا ہے؟ پہلے بطور سوال اور پھر جب اس کا جواب نہیں ملا۔ تو وہ آپ ہی کہتا ہے کہ بھلا کون ایسا دل گردہ رکھتا ہے کہ عشق کا حریف ہو یعنے کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق یعنے کوئی نہیں۔

(۳۵۴) میں اس غم میں مرتا ہوں یعنے یہ غم مجھے بہت ستا رہا ہے کہ میرے بعد دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو کہ مہر و وفا کی رسم حسب دستور ادا کرے گا یعنی میرے بعد

جو بہر و دنا کا خاتمہ ہو جائیگا۔ تو پھر ان کا نباہنے والا تو گجا۔ ان کے حال پر ماتم کرنے والا بھی یہاں کوئی نہیں ہوگا۔

(۳۵۵) سیلاب بلا۔ مصیبتوں کا طوفان۔ اے غالب میرے مرنے کے بعد جب میرا گھر ہی باقی نہیں رہیگا۔ تو یہ سیلاب بلا (مصیبتوں کا طوفان) پھر کس کے گھر جائے گا۔ یعنے ایسے طوفانِ عشق کی مدارت کون کرے گا لہذا مجھ کو حضرتِ عشق کی بیکسی پر سخت رونا آتا ہے۔

غزل

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار ۳۵۶ نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ ۳۵۷ کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار
نہیں ہے سایہ کہ سنکر نویدِ مقدمِ یار ۳۵۸ گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ ۳۵۹ کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ ۳۶۰ کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے ۳۶۱ کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے ۳۶۲ ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی ۳۶۳ ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب ۳۶۴ کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں ۳۶۵
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

---

(۳۵۶) بلا سے۔ جیسے کہتے ہیں۔ ہماری بلا سے یعنے اس سے کیا تعلق۔ یہ جو یہ گھر کے در و دیوار جو میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان سے مجھے کچھ واسطہ نہیں رہ کچھ ہیں ہوا کریں۔ پر میرے کام صرف اسی قدر آتے ہیں۔ کہ میری نگاہ شوق جب دوست کے

ان) در و دیوار سے ٹکراتی ہے۔ تو ان سے رک جاتی ہے۔ اور یہ رکاوٹ مجھے اور شوق دلاتی ہے کہ دوست کے در و دیوار کو اور زیادہ ذرا اڑ کے دیکھوں تو گویا یہ در و دیوار میری نگاہ شوق کو بال و پر کا کام دیتے ہیں۔

(۳۵۷) وفورِ اشک۔ بکثرت گریہ وزاری کرنا۔ وفورِ اشک نے میرے کاشانہ (گھر) کا یہ حال کیا۔ کہ میری دیوار در بن گئی۔ یعنے دیواروں سے اینٹیں نکل کر دروازہ کی صورت بن گئیں۔ اور دروازہ دیوار بن گیا۔ یعنی اس کے اندر غبار مٹی (جو گھر کی ویرانی سے جمع ہوا تھا) بھر کر گویا در کی دیوار بن گئی۔

(۳۵۸) دیوار کا سایہ دیوار سے چند قدم آگے تک پھیلا ہوتا ہے۔ اسی خیال سے کہتا ہے۔ کہ مقدمِ یار (دوست کے آنے کی) نوید (خوشخبری) سنکر میرے در و دیوار چند قدم آگے (اس کی پیشوائی کو) چلے گئے ہیں۔ لہذا جو سایہ ان سے زمین پر پڑتا ہے۔ یہ سایہ نہیں ہے بلکہ میرے در و دیوار ہی ہیں۔ جو دوست کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

(۳۵۹) مئے جلوہ۔ دوست کے جلوہ یا دیدار کی شراب۔ دوست کو خطاب کر کے کہتا ہے۔ کہ تیرے مئے جلوہ کی ارزانی کس قدر ہوئی ہے۔ یعنے تو نے اپنا دیدار لٹا ارزان کر رکھا ہے۔ کہ تیری گلی میں ہر ایک گھر کے در و دیوار تک اسی جلوۂ دیدار کی شراب سے مست ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ تو ایک معشوق ہرجائی ہے ہر گھر میں جاتا ہے اور سب تیرے عشق میں متوالے ہو رہے ہیں۔ (مئے جلوہ کی ارزانی۔ صرف محبوب ہرجائی ہی کی صفت ہو سکتی ہے)۔

(۳۶۰) سرِ سودائے انتظار۔ کسی کے انتظار میں کہیں بیٹھنے کا جنون۔ متاعِ نظر۔ دیکھنے کی جنس۔ دکانِ متاعِ نظر۔ ایسی دکان جہاں دیکھنے کی جنس لگا دی گئی ہو یعنی گھر میں کوئی ایسا مقام (مثلاً کھڑکی یا جھروکہ) جہاں بیٹھ کر آنے جانے کو دیکھا جا سکے دوست سے کہتا ہے اگر ہماری طرح تجھ کو کسی کے انتظار میں بیٹھنے کا شوق ہے تو آ کہ میرے گھر کے در و دیوار دکانِ متاعِ نظر ہیں۔ یعنی تو ان میں بیٹھ کر کسی کا انتظار کر سکتا اور آتے جانے کو دیکھ سکتا ہے۔ یا تاک جھانک لگا سکتا ہے۔ مثال شعر

یہ کہ محبوب کو اپنے مکان کی کھڑکی میں بیٹھ کر دوسروں کے دیکھنے دکھانے کی تحریک دلاتا ہے۔

(۳۴۱) ہجوم گریہ کا سامان کیا۔ یعنی رونے دھونے کے لئے مستعد ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ جب دل پر کوئی سخت صدمہ گزرا ہو۔ تو انسان اپنے مکان کے کسی کونے یا گوشے میں علیحدہ بیٹھ کر خوب روتا اور آنسو بہاتا ہے یہ گویا ہجوم گریہ کا سامان کرنا ہے۔

جب کبھی میں نے اپنے بے حد و حساب رونے کا سامان کیا ہے۔ تو میرے گھر کے در و دیوار میرے پاؤں پر گر پڑے کہ ایسا نہ کرنا تاکہ طوفان گریہ سے یہ مکان ہی گر نہ جائے۔

گو مصنف نے اس مضمون کو ایک ایسے طریق سے نظم کیا ہے کہ جیسے بات چیت میں کہتے ہیں کہ کب میں نے تم کو کوئی نصیحت کی اور تم میرے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔

(۳۴۲) ہمسایہ۔ یہاں یہ لفظ ہم سایہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی یہ کہ دوست ایسی جگہ آ رہا ہے کہ سورج کا سایہ پڑتا ہے تو ہمارے اور اس کے دونوں کے مکان اسی ایک سایہ سے یکساں طور پر ڈھک جاتے ہیں۔ گویا "ہم سایہ" بن کے رہنے لگا۔

وہ میرا ہم سایہ بن کے رہا۔ یعنے ہم سائے میں تو جب میرے گھر کی در و دیوار کا سایہ اس کے در و دیوار پر پڑا۔ تو میں یہ سمجھا۔ کہ میرے در و دیوار اس کے در و دیوار پر فدا ہو گئے۔ یعنی میں تو اس پر عاشق تھا ہی اب میرا گھر بھی بوجہ ہمسائیگی کے اس کے گھر پر قربان ہو گیا۔ اردو میں جہاں یہ کہتے ہیں کہ وہ میرے ہمسائے میں رہتے ہیں تو اس سے یہی مراد ہوا کرتی ہے کہ وہ "میرے قریب" ہی رہتے ہیں جس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دیوار سے دیوار ہی رہائش ہو۔ مگر یہاں غالب نے لفظ معنے لئے ہیں سو کوئی بازاری زبان استعمال نہیں کی۔ لہذا یہ نازک مفہوم اوپر واضح کر دیا گیا ہے۔

(۳۴۳) تیرے بغیر ہمیں اپنے گھر کی آبادی خارگزرتی ہے۔ لہذا اب ہمیشہ ہم اپنے در و دیوار یعنے گھر کو دیکھ کر روتے ہیں کہ افسوس تو اس میں کبھی آ کر رہا تھا اور ہمارے گھر کی بھی آبادی یعنی رونق ہوئی تھی۔

(۳۴۴) سیلاب یا طوفان کے خیر مقدم سے جو عیش یعنی مسرت مجھ کو حاصل ہوتی ہے اس کی ناشکری یا کوہت کا کچھ حال نہ پوچھو کہ میرے تو گھر کے تمام در و دیوار تک اسی مسرت سے کہ طوفان آب آ گیا ناچ رہے ہیں۔ (عاشق کو خانہ بربادی سے جو خوشی ہوا کرتی ہے اس کے متعلق ایسے اور شعر بھی پہلے لکھے جا چکے ہیں)۔

(۳۴۵) فارسی میں ایک مثل ہے "دیوار ہم گوش دارد" اسی بنا پر یہ شعر نظم کیا گیا ہے کہتا ہے۔ غالب تو یہ بات کسی سے نہ کہہ کہ زمانہ یعنے دنیا میں راز محبت کے بارے میں کوئی کسی کا حریف نہیں ہے۔ یعنی تیرے بالمقابل تیری محبت کا کوئی راز دان نہیں ہے۔ مگر ہاں ایک در و دیوار یعنے دیوار ہم گوش دارد۔ ممکن ہے کسی نے تیری راز محبت کی باتیں پس دیوار سن لی ہوں۔ اور وہ اس امر میں تیرا حریف بن گیا ہو۔ یعنے تیرے دوست کا عاشق بن گیا ہو۔

غزل

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر ۳۴۶ جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن ۳۴۷ جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں ۳۴۸ لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم ۳۴۹ سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا ۳۵۰ چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ۳۵۱ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۳۵۲ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات ۳۵۳ سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

۳۷۴ غالب گر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

(۳۶۶) تیری یہ عام شکایت ہے کہ تو میرے گھر میں اس لئے نہیں آتا کہ تجھے میرا گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ میں نے تیرے کہے بغیر (تیری بلا اجازت) اپنا گھر ترے گھر کے دروازے ہی پر بنا لیا ہے۔ کیا اب بھی تو میرا گھر کہے بغیر یعنی کسی کے مجھے اس کا پتہ بتلائے بغیر نہیں جان لے گا۔ مطلب یہ کہ اب پتے نہ جاننے کا وہ جھگڑا ہی گیا۔ کیا اب بھی کوئی عذر ہے کہ تو مجھ سے نہ ملے۔

(۳۶۷) جب مجھ میں (ضعف کے سبب) طاقت سخن نہ رہی یعنی کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہا۔ تو وہ کہنے لگے کہ میں کسی کے دل کی بات اس کے کہے بغیر یعنی اس کے بتائے بغیر کیسے جان سکتا ہوں (یہ ایک معشوقانہ ستم ظریفی ہے کہ اب عاشق نہ بول سکے گا نہ اس کے دل کا حال نہ سننے کی کوئی شکایت ہوگی)۔

(۳۶۸) اب اس شخص سے مجھے واسطہ پڑا ہے کہ جس کا نام ساری دنیا میں کوئی ستمگر یا ظالم کہے بغیر نہیں لیتا۔ (گویا عشق کی مشکلات سے سخت پریشانی ہو رہی ہے)۔

(۳۶۹) ہمارے جی ہی میں کوئی بات ایسی نہیں ہے۔ کہ جس کو ہم کہیں۔ ورنہ ہم کہنے سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ گویا اس میں ہمارا سر جائے یا رہے۔ ہم وہ اپنے دل کی بات کہہ دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا کرتے۔

(۳۷۰) میں اس بت کافر (ظالم یا عہد کر کے پھر جانے والے) کا پوجنا یعنی اس کا عشق کبھی ترک نہیں کروں گا۔ چھوڑ دینا مجھ کو کافر کہے یا کافر بتائے بغیر نہ چھوڑے۔

(۳۷۱) عشاق اپنی بات چیت میں راز عشق عموماً چھپایا کرتے ہیں۔ اسی لئے مصنف کہتا ہے۔ کہ جہاں گفتگو میں معشوق کے ناز و غمزہ کا بیان مقصود ہو۔ وہاں عشاق کا دشنہ و خنجر کہے بغیر کام نہیں چلتا۔ یعنی دشنہ (خنجر) اور خنجر دونوں ناز و غمزہ سے مشابہ ہیں۔ لہذا ان کا ذکر کر کے سب راز عشق چھپایا جاتا ہے۔ ورنہ صاف صاف ناز و

غمزہ کا کہیں تو معلوم ہو کہ وہ کسی پر عاشق ہیں تو بڑی سخت مشکلات پیدا ہوں لہذا عشق میں استعاروں ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔

(۳۷۲) مشاہدۂ حق۔ یعنی ایک بات کی حقیقت معلوم کر کے جب کوئی نتیجہ برآمد کیا گیا ہو۔ تو اس کو مشاہدۂ حق کہتے ہیں۔ مگر یہاں مصنف مشاہدۂ حق سے مراد وہ امور رکھتا ہے۔ جو کہ خدا کے عشق میں اہل تصوف تو ہمیشہ کیا کرتے ہیں۔ جیسے خدا سے مر کر ملنے کو واصل بحق ہونا یعنی وصال حق نصیب ہونا تصور کرتے ہیں۔ اور خدا کے عشق کی محویت کو جام بیخودی سے نسبت دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح بادۂ توحید وغیرہ وغیرہ۔ مطلب شعر اگرچہ مشاہدۂ حق یعنی حق و تصوف کی گفتگو بھی ہو تو بادہ و ساغر جیسے استعارہ کہے یا ان کے کہے بغیر کام نہیں چلتا۔ لہذا بات خواہ کوئی ہو اکثر بغیر تمثیل کے عام فہم ہو ہی نہیں سکتی۔ دراصل یہاں شاعر نے اہل مذہب کو جتایا ہے۔ کہ وہ جس بادہ و ساغر کو اتنا برا بتاتے ہیں۔ وہ بھی تو اپنی گفتگو میں عموماً انہی الفاظ سے کام لیا کرتے ہیں۔

(۳۷۳) میں اگر کان سے بہرا ہوں (تو اس میں میرا کچھ قصور نہیں ہے بلکہ میری حالت قابل رحم ہے) آپ کو مجھ پر دونا التفات (مہربانی) کرنا چاہیئے وہ یہ کہ بات کو دو مرتبہ کہیں کیونکہ میں بہرا ہونے کی وجہ سے ہر بات مکرر سن کے اسے سمجھا کرتا ہوں۔ (مرزا غالب بڑھاپے میں کچھ اونچا سننے لگے تھے۔ اسی امر کی طرف اشارہ ہے اردوئے معلےٰ میں اپنی اس حالت کو مرزا نے بیان بھی کیا ہے)۔

(۳۷۴) اے غالب تو حضور میں یعنی بادشاہ دہلی (بہادر شاہ ظفر) کی بارگاہ میں بار بار عرض حال نہ کر۔ کیونکہ جو تیرا (شکستہ) حال ہے وہ ان پر کہے بغیر ہی روشن ہے۔

غزل

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر ۳۷۵ جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے ۳۷۶ سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا ۳۷۷ رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پُرجوش رشک سے ۲۷۸ مرتا ہوں اسکے ساتھ میں تلوار دیکھکر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق ۲۷۹ لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھکر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ۲۸۰ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ ۲۸۱ لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال ۲۸۲ رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ۲۸۳ جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھکر
کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے ۲۸۴ طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر ۲۸۵ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

۲۸۶ سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

(۳۷۵) طاقتِ دیدار - یہاں کسی کا بارعب حسن دیکھکر مرعوب نہ ہونا یعنے حوصلہ یا اس قسم کی مدافعت سے کام لینا ۔

میں دوست کے رخسار کی تاب (جھلک یا تابش) دیکھکر اس سے جل کیوں نہ گیا (تاکہ یوں زندہ رہ کر عشق کے یہ صدمے نہ اٹھانے پڑتے) لہٰذا میں اب اپنی وہ طاقتِ دیدار (یعنی معشوق کو دیکھکر اس سے مرعوب ہونے والے حوصلے یا طاقت کو اپنے وجود میں پاکر جلتا ہوں - یا اس سے پیچ و تاب کھاتا ہوں (گویا چاہتا ہوں کہ یہ حالت نہ ہوتی) ۔

اس شعر میں حضرت موسےٰ پر بھی طنز کی ہے - کہ وہ کوہ طور پر خدا کا دیدار دیکھکر جل کیوں نہ گئے - حالانکہ ان کے عوض وہ برقِ نظارہ کوہ طور نے لیوں کی - اور آپ بچ گئے - لہٰذا وہ ایک عاشقِ صادق کی طرح دوست کے دیدار میں فنا نہ ہوئے - کیونکہ عشقِ صادق مقتضی ہوتا ہے کہ عاشق اپنے معشوق ہی کے ہاتھ سے کسی نہ کسی طرح شہید ہو جائے ۔

(۳۷۶) اہلِ جہاں (دنیا) کے آگ (مجھے اپنے آگ برسانے والے نالوں میں سرگرم

پاکر آتش پرست کہتے ہیں (کیونکہ ایسا کام جو آگ سے متعلق ہو آتش پرست ہی کیا کرتے ہیں) ۔

(۳۷۷) تم جو بے سبب آزردہ ہو یعنی کوئی تصور کرے یا نہ کرے (یہاں مراد تمہارا کوئی عاشق بنے یا نہ بنے) تم اس کو ضرور تکلیف پہنچاتے ہو - میں اس کو دیکھ کر رکتا ہوں یعنے سوچتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو - تمہارے اس رویے سے کہ تم نے جفا یعنی جفائے عشق کو ایسا عام کر دیا ہے - تو اب عشق کی کیا آبرو رہی (جو صرف خاص خاص لوگوں کا حصہ ہوتا ہے) مراد یہ کہ دوست کو چاہیے کہ وہ صرف اپنے عاشقِ صادق ہی پر جفا کیا کرے نہ کہ ہر کس و ناکس پر جو محض بوالہوس ہوا کرتے ہیں اور اس سے حضرتِ عشق کی عزت جاتی رہتی ہے ۔

(۳۷۸) وہ بڑے جوش سے میرے قتل کرنے کو آتا ہے اور چونکہ وہ خود ہی ایسا ایک قاتل ہے - کہ جس کی نظیر نہیں ملتی - مجھے اس کے ہاتھ میں (اپنے قتل کے لئے) تلوار دیکھ کر بڑا رشک آتا ہے - کہ اس کے ہاتھ میں وہ تلوار اس غرض کے لئے کیوں ہے (حالانکہ میں تو یوں ہی کی وجہ سے قتل ہو جاتا - تلوار کو اس کی رفاقت کی کیا ضرورت تھی) لہٰذا اب میں اس رشک سے گویا مر رہا ہوں - کہ آہ - میں اس کے اپنے ہاتھ سے یعنی اسکو دیکھ کر مروں نہ کہ تلوار کے وار سے ۔

(۳۷۹) تیری چال جو خود ہی مستانہ ہے اور اس کے لئے تجھے شراب پلانے کی حاجت نہیں - تو جب ادھر سے گذرا تو لاکھوں (اس مستانہ چال سے) شہید ہو گئے - لیکن لوگوں نے خیال کیا کہ تو نے شراب پی تھی - اور اس شراب ہی کے باعث تیری چال ایسی مستانہ بن گئی تھی کہ جس سے ایک خلقت کا خون ہو گیا - لہٰذا خونِ خلق یا رعد یا لوگوں کے خون) کا ثبوت گردنِ مینا یا دہ - شراب یا صراحی کی گردن) پر ہم پہنچاتے رہے اور وہ واجب القتل تصور کی گئی ہے - اس واقعہ کو دیکھ کر اب موجِ مے (شراب کے پیالے میں پڑی ہوئی شراب کی لہر بھی بظاہر حال) تیری مستانہ چال سے کانپ اٹھتی ہے - کہ کہیں وہ بھی گردنِ مینا (صراحی کی گردن جس سے شراب انڈیلتے ہیں) کی طرح ملزم قرار دی جائے - کہ وہ خونِ خلق کرتی ہے - حالانکہ قصور تیری رفتار کا ہے ۔

(۳۸۰) ہم کو رقت آزار یعنی دوست کے ہاتھ سے ظلم سہنے کا اور زیادہ مشتاق پاکر دوست نے ظلم کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ واحسرتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ مطلب یہ کہ وہ ہم پر بدستور ظلم کرتا رہتا۔

(۳۸۱) متاع سخن۔ اشعار کا سرمایہ۔ عیار طبع۔ یہاں مراد وہ شخص جو قابل ہو یا شاعری کے اعلیٰ معیار سے واقفیت رکھتا ہو۔ بک جاتے ہیں۔ ہم آپ متاع کے ساتھ یہاں مراد ہم جب کسی کو اپنے اشعار سناتے ہیں۔ اور اپنا سرمایۂ سخن صرف ایک داد کی قیمت پر اس کے ہاتھ پر بیچ ڈالتے ہیں۔ تو اپنے متاع سخن کے ساتھ خود بھی بک جاتے ہیں (یعنی اس شخص کے ہو جاتے یا یہ احسان اس کا برداشت کرتے ہیں) بشرطیکہ وہ عیار طبع یا ایسا قابل آدمی ہو کہ جسے سخن شناس کہنا چاہیے۔ اور وہ شعر و شاعری سے واقف ہو۔

(۳۸۲) چونکہ شعرا بتخانہ کو کعبہ پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ زنار کو تسبیح پر فوقیت دلایا کرتے ہیں۔ اسی لئے مصنف بھی لکھتا ہے کہ زنار کو باندھ اور صد دانوں کی (اسلامی) تسبیح توڑ ڈال۔ کیونکہ رہرو (یہاں رہرو عشق مراد ہے) رستے کو ہموار پاکر بیٹھتا اس کو ہموار ہی کرکے چلا کرتا ہے (چونکہ تسبیح کے دانے ابھرے ہوتے ہیں اور زنار میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تو گویا زنار ہی ایک ہموار راستہ ہے جس پر ایک عاشق کو چلنا چاہیے)۔

(۳۸۳) شعرا اپنے پاؤں کے آبلے۔ اگر جنگل کے کانٹوں کے لگنے سے زخمی ہو جائیں تو ایسی حالت کو اپنے حق میں بہت بہتر بتلایا کرتے ہیں۔ اور ان آبلوں کا علاج پھر مرہم پٹی وغیرہ سے نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ جنگل کے کانٹے چبھو کر ان سے پیپ نکال کے اچھا کر لیا کرتے ہیں۔ مطلب شعر۔ میں پاؤں کے آبلے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ کہ ان کو کیونکر اچھا کروں گا۔ اب یہ دیکھ کر راہ کوئے دوست بہت پرخار ہے۔ میرا دل خوش ہو گیا ہے۔ کہ وہاں کانٹے میرے آبلوں میں چبھ کر وہ اچھے ہو جائیں گے۔

(۳۸۴) اس شعر میں دوست کی بدگمانی کا حال بہت مبالغے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے یعنی رائی کا پربت بنایا گیا ہے۔ مطلب شعر۔ وہ دوست مجھ سے کس قدر بدگمان ہے کہ میری ہر بات کی کچھ نہ کچھ غلط توجیہ کرکے وہ اور زیادہ مجھ سے کشیدہ خاطر ہو جاتا ہے مثلاً

ایسا کہ جب میرے آئینے میں ایک تھوڑا سا زنگار موجود پایا (جو عموماً آئینوں میں ذرا نمی لگنے سے پیدا ہو جاتا ہے) تو محض اپنی بدگمانی سے اس نے یہ سمجھا کہ کوئی طوطا میرے آئینے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہاں وہ عکس فگن ہے۔ اور اس کو چھوڑ کر طوطے سے محبت کرنے لگا ہوں۔

(۳۸۵) اس شعر میں خدا کی طرف خطاب کرکے شاعر اس کو بھی گویا "معاملہ ناشناس" ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ایک انتہا درجے کی شاعرانہ شوخی ہے۔ چنانچہ غالب اسی طرح ایک اور موقع پر بھی خدا کو متہم کرنے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً ؎

زندگی اپنی اسی طرح جو گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کہتا ہے۔ برق تجلی (یعنی خدا کے نور کی بجلی) ہم پر گرنی چاہیے تھی نہ کہ کوہ طور پر (جو ظاہر ہی ہے کہ ایک غیر ذی روح چیز تھی جس کو ایسی الٰہیانہ راز کی باتوں سے کیا تعلق) صاف ہے۔ شراب جب پلائی جاتی ہے۔ تو مقدار شراب ایک قدح خوار یعنی شرابی کا ظرف (یہاں مراد اس کے شراب پینے کے حوصلے کو) دیکھ کر مقرر کی جاتی ہے۔ اب کوہ طور کا یہ ظرف نہ تھا۔ کہ وہ خدا کے زبردست جلوے کے برداشت کرنے کی طاقت رکھتا۔ چنانچہ وہ اس سے جل کر بالکل خاک سیاہ ہو گیا تو پھر خدا نے ایسا کام ہی کیوں کیا"۔

(۳۸۶) غالب شوریدہ حال کا (یعنی دیوانہ جس کے مغز میں فتور و شر سمایا ہو) اس کا سر پھوڑنا تیرے گھر کی دیوار دیکھ کر مجھ کو یاد آ گیا کہ وہ اس کے ساتھ اپنا سر پھوڑا کرتا تھا۔

غزل

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر ۳۸۷ — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ۳۸۸ — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زمانے سے ۳۸۹ — کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے ۳۹۰ بہم گر صلح کرتے پارہا ئے دل نمکداں پر
نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا ۳۹۱ کہ پشت چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا ۳۹۲ کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا ۳۹۳ قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

۳۹۴ نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(۳۸۷) زحمتِ مہرِ درخشاں۔ بہت چمکنے والے سورج یا حدت آفتاب سے زحمت یا گزند پہنچنا۔ جیسے شبنم پر سورج کی تیز روشنی پڑکر اس کو پگھلا دیتی یا زحمت پہنچاتی ہے۔ چونکہ میں وہ قطرۂ شبنم ہوں کہ جنگل کے کسی کانٹے کی نوک پر ہو۔ لہٰذا میرا دل سورج کی تیز گرمی کی زحمت سے بہت لرزتا ہے کہ وہ جب مجھ پر پڑے گی تو میں فنا ہو جاؤں گا۔ حاصل شعر یہ کہ معشوق ایک نظر بھر کر مجھے دیکھے گا تو میں قتل ہو کے رہ جاؤں گا اس لئے دوست کی آمد سے میں لرزتا رہتا ہوں۔ جیسے کہ قطرۂ شبنم آفتاب کی تشریف آوری کی زحمت سے۔

(۳۸۸) حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے عشقیہ قصوں میں یہ تین باتیں عموماً درج ہوا کرتی ہیں کہ (۱) حضرت یوسفؑ اس قدر حسین تھے کہ جس مکان یا جگہ پر بیٹھتے تھے وہ مقام بقعۂ نور بن جاتا تھا۔ (۲) حضرت یوسفؑ ملک مصر میں جو زلیخا کا وطن تھا ایک کوٹھڑی میں تنہا قید کرکے رکھے گئے تھے۔ (۳) حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسف کی جدائی میں اس قدر روئے تھے کہ آپ کی آنکھوں کی سیاہی آنسوؤں کی کثرت سے دھل کر جاتی رہی تھی۔ اور آنکھیں بالکل سفید ہو گئی تھیں۔
اس شعر میں یہی تین روایتیں تلمیح کی گئی ہیں۔ مطلب شعر سفیدی پھیرنا مراد کمرے میں سفیدی پھیرنا۔ یوسف نے یہاں (یعنی اپنے قید خانے میں) بھی خانہ آرائی لئے اپنے مقام نشست کو بقعۂ نور بنانے کی عادت نہ چھوڑی۔ چنانچہ دیکھو تو اپنے ہی زنداں کی

سفیدی کو اور دیکھو حضرت یعقوب کے سفید شدہ دیدہ کی اس سفیدی کو جو ہر وقت بوجہ انتظار آپ ہی کی طرف لگی رہتی تھی آپ نے جمع کر لیا تھا۔ اور گویا اسی مرد مساماں سے آپ کے قید خانہ کی کوٹھڑی میں سفیدی پھیری گئی تھی۔"

(۳۸۹) لفظ تعلیم۔ وہ تعلیم یا تجربہ جس میں انسان کی ہستی کا انجام فنا یا نیستی ہو۔ درس بیخودی۔ مدہوشی کا درس۔ لا م الف لکھنا۔ لکھا ہے کہ جب مجنوں اور لیلےٰ دونوں ایک مدرسے میں پڑھا کرتے تھے۔ تو مجنوں بجائے تختی لکھنے کے لیلےٰ کو دکھانے کیلئے مدرسے کی دیواروں پر ل۔ ا لکھا کرتا تھا یعنے لا جس کا مطلب فنا ہوتا ہے یا عشق لیلےٰ میں گم کرلینے کے لفظ کے جزو اعظم بھی یہی دو حرف ہیں۔ یعنے لام اور الف۔ دیوار دبستاں۔ مدرسے کی دیواریں۔ شاعر اپنے آپ کو مجنوں کے برابر عاشق ثابت کرنے کے لئے کہتا ہے کہ میرا عشق بھی اسی قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ جبکہ مجنوں عرب میں لیلےٰ پر عاشق ہوا تھا۔ مطلب شعر مدہوشی و بیخودی عشق کے مدرسے میں میں بھی اسی زمانے سے فنا تعلیم ہوں یعنی لا کی تعلیم پا رہا ہوں یا عشق میں سر دھر لٹا اور خانہ برباد ہو رہا ہوں۔ جبکہ مجنوں اپنے مدرسے کی دیواروں پر حروف لام الف (لا) لکھا کرتا تھا۔ حاصل یہ کہ میں لڑکپن ہی سے عاشق چلا آتا ہوں۔

(۳۹۰) شعر از خم دل پر نمک چھڑکتے یا اس کو نمکدان میں رکھ کر درد دل کی لذت حاصل کرنے سے بہت خوش ہوا کرتے ہیں۔ اسی غرض سے کہتا ہے کہ اگر میرے دل کے ٹکڑے (لخت دل) آپس میں صلح کرکے نمکدان میں گلا سڑنا پسند کرلیتے تو میں ان کے لئے مرہم پٹی کی فکر میں دلگار رہتا اور اس سے مجھے فراغت نصیب ہو جاتی۔ پارہ ہائے دل کا صلح نہ کرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اس قدر ریزہ ریزہ ہو کے متفرق و پریشان ہو چکے ہیں۔ کہ اب ان کو ایک جگہ بھی جمع ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ایک نمکدان میں باہم وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

(۳۹۱) اقلیم الفت۔ محبت کا ملک یا حسن و عشق کی مملکت۔ طومار ناز۔ ناز و انداز کا دفتر۔ پشت چشم۔ فارسی محاورہ ہے جس کا مطلب آنکھ پھیر لینا۔ متوجہ نہ ہونا یا غافل

کرنا۔ عنوان کسی تحریر کی ابتدا - پیشانی ۔

حسن و عشق کی مملکت میں ناز و انداز کا کوئی دفتر ایسا نہیں ہے کہ جس کے سر ورق کا غلط دلفریب عنوان یا پیشانی پر پشت چشم (یعنی اغماض بے توجہی) کی مہر ثبت نہ کی گئی ہو۔ حاصل شعر یہ کہ حسن و عشق میں معشوق یا نازنین ہر اس معاملے میں قصداً اپنے عاشق کی طرف سے بے توجہی کیا کرتا ہے، کہ جس کو الفت یا محبت سے کچھ لگاؤ ہو۔

(۳۹۲) اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ عاشق گویا اپنے محبوب کے پاس باغ میں بیٹھا ہوا اپنا فرقت کا زمانہ یاد کر رہا ہے اور کہتا ہے: "مجھے آسمان پر یہ شفق آلود بادل دیکھ کر یہ یاد آ گیا کہ جس طرح یہ شفق - آگ جیسی لال لال اور بکثرت موجود ہے، تیری فرقت میں اسی طرح میرے گلستاں پر آگ برسا کرتی تھی۔ یعنی میرے لئے ایام فرقت جہنم کا نمونہ تھے۔

(۳۹۳) شعرا اپنی معدومی یا فنا کے متعلق عموماً مبالغہ کیا کرتے ہیں۔ اس شعر میں مصنف پہلے آپ کو قبر میں پڑنے کے بعد اس قدر معدوم خیال کرتا ہے کہ گویا چند ذرے خاک کے باقی رہ گئے ہیں جن پر ایک تو ہوا قیامت کا کام کرتی ہے۔

یہاں ان دو باتوں کو معانی شعر پر مقدم سمجھنا چاہیے۔ ایک تو عاشق کا اپنے معشوق کے ناز سے قتل ہو کر دفن ہو جانا۔ دوسرے اپنے معشوق سے اس کے دل پر شوقِ ناز کا اس قدر گہرا اثر پڑنا کہ تا قیامت اس اثر کا دل سے کبھی زائل نہ ہونا بلکہ قبر میں بھی اسی طرح قائم اور تازہ رہنا۔ انہی ہر دو امور کو اس شعر میں نظم کیا ہے۔

مطلب اس کے شہید ناز قبر میں پڑے پڑے اب ایک مشت خاک ہو کر رہ گئے ہیں۔ کہ جن پر ہوائے تند (سخت آندھی) گویا قیامت کا کام کرتی ہے۔ یعنی اڑا اڑا کر اور زیادہ مٹائے دیتی ہے۔ بلکہ مٹا ہی دیا ہے اور وہ مشتِ خاک اب ذرے ذرے ہو کر اڑنے لگی ہے اور ان ذروں کی حالت سے خوب واضح ہوتا ہے کہ اب ان میں اس شوق ناز کے سوا کہ جس کی بدولت عشاق شہید ہوئے تھے۔ اور کیا باقی رہ گیا ہوگا۔ پہلے ان کا وجود تو گویا معدوم ہی ہو چکا ہے۔ لیکن ہاں ان میں ایک وہ بے پرواز کی طاقت ابھی باقی ہے جو مذکورہ بالا شوقِ ناز کو ہوا میں اڑائے لئے پھرتی ہے۔"

(۳۹۴) شدت کی۔ یعنی سختی کی۔ یہاں مراد نصیحت کرنے میں زیادہ تند کلامی سے کام لیا۔ اپنے دل سے کہتا ہے۔ اے غالب اگر ناصح نے وعظ و پند میں کچھ سخت و سست کہا یعنی تند کلامی سے کام لیا۔ تو اب انصاف یہی ہے۔ کہ ہم اس سے لڑنے کی نہ ٹھانیں۔ کیونکہ ہمارا زور بھی تو آخر اسی طرح کسی پر چلتا ہے یعنی اپنے گریبان پر چلتا ہے کہ ہم جب چاہتے ہیں۔ اس پر شدت کرتے ہیں یعنی اس کو بہت زور کے ساتھ پھاڑ کے پرزے پرزے کر ڈالتے ہیں۔ اس شعر میں "آخر" کا لفظ مذکورہ بالا معنے کی صاف تخصیص کرتا ہے یعنی اگر ناصح نے ہم پر سختی کی تو کیا ہوا آخر ہم بھی تو ایک اسی طرح کی سختی اپنے گریبان پر کیا کرتے ہیں۔ لیکن شارحین غالب نے اس معمولی شعر کے معنے بیان کرنے میں بھی ایک دوسرے کی تقلید کر کے لکھا ہے کہ اے غالب! ناصح کی سخت کلامی پر اس سے لڑنے کی نہ ٹھان۔ اگر اس نے ہم پر کچھ سختی کی تو کیا ہوا اس کے جواب میں ہم اس سختی کے ساتھ اپنا گریباں پھاڑ ڈالیں گے۔ دراصل اس شعر میں مصنف عاشق کو ناصح کا کسی طرح مقابلہ کرنے کی تحریک نہیں دیتا۔ بلکہ اس سے منع کرنے کی تائید کرتا ہے اور انصاف کرنے پر زور دیتا ہے۔

غزل

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور ۳۹۵ کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات ۳۹۶ دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند ۳۹۷ ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے ۳۹۸ لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں ۳۹۹ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور
ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا ۴۰۰ ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے ۴۰۱ جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا ۴۰۲ ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

لیتا ہوں اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین ۴۰۴ کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے ۴۰۴ رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے ۴۰۵
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

(۳۹۵) چونکہ ان کے ہر ایک اشارے یا کنائے کا وہ نشاں یا خاص مقصد نہیں ہوتا کہ جس کو ہم خیال کرتے ہیں۔ بلکہ ہمیشہ کچھ اور ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ تو وہ اگر (صریحاً) ہم سے محبت بھی کریں۔ تو (اپنی بدگمانی کی وجہ سے) ہم اسے محبت نہیں بلکہ کچھ اور ہی خیال کر لیتے ہیں۔ مطلب شعر یہ کہ جو شخص بدگمان یا شکی ہو۔ وہ ایک اچھی بات کو بھی بعض اوقات بالکل بری سمجھ لیتا ہے۔

(۳۹۶) معشوق کے ہاں اپنی ناشنوائی کے متعلق فریاد کرتے ہوئے کہتا ہے۔ یارب وہ میری بات (سنکر) نہ تو اسے کبھی سمجھے ہیں (کیونکہ اگر سمجھتے تو میری بات کا جواب کیوں نہ دیتے) اور نہ اسے (آئندہ) کبھی سمجھیں گے (کیونکہ ان کی یہ نیت ہی نہیں ہے) لہٰذا ان کا یہ (لاپرواہی یا بدنیتی) ملی بدل دے یعنی ان کو اور دل دیدے اگر چہ مجھ کو اور زبان دینے کی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی یہ بے توجہی کوئی میری زبان کی خرابی کی وجہ نہیں ہے۔ خود ان کی نیت ہی مجھ سے صاف نہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ آئندہ وہ محبت کے بہانے سے میرے ساتھ عداوت کریں۔

(۳۹۷) ابرو۔ بھویں۔ جو شعرا کے نزدیک کمان سے مشابہ ہوتی ہیں چنانچہ وہ کمان ابرو کہا کرتے ہیں۔ بے تیر مقرر۔ یعنی اس کو ضرور تیر مقرر کیا گیا ہے یعنی وہ تیر ہے۔ محبوب کی نگہ ناز کو (جو تیر کی مانند ہوا کرتی ہے) بھلا بھوؤں سے کیا تعلق (یعنی نظر کا بھوؤں سے کیا واسطہ) مانا کہ نگاہ و ناز ایک تیر ضرور ہے مگر اس تیر کی کمان کمان ابرو نہیں ہے بلکہ وہ کوئی اور ہی کمان ہے کہ جس سے تیر نگاہ و ناز نکلا کرتا ہے (یعنی وہ کمان معشوق کی چشم ناز ہے)۔

(۳۹۸) شہروں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان میں وسیع ترین بازار ہوا کرتے ہیں۔ کہ جن سے ہر شخص جو وہاں رہتا ہے کبھی نہ کبھی ضرور گزرتا ہے اسی خیال کو مد نظر رکھ کے کہتا ہے۔ کہ تم جب شہر میں ہو (اور ہر روز صد ہا لوگوں کے دل و جان تمہاری مٹھی میں رہتے ہیں۔ چنانچہ تم ہمارے دل و جان بھی اسی طرح لے چکے ہو) تو ہمیں کیا غم جب کبھی اٹھیں گے (یعنی اپنے گھر سے اٹھ کے بازار میں جائیں گے) تو وہاں تم سے (اس وقت جبکہ تم کسی بازار سے سیر کرتے یا لوگوں کے دل و جان لیتے ہوئے گزرو گے) ہم اپنے لئے کوئی اور دل و جان لے آئیں گے (گویا اسی طرح تم سے دل و جان لے آئیں گے گویا اسی طرح تم سے دل جان لے لیکے تمہیں پر فدا کرتے رہیں گے مراد یہ کہ ہزار جان سے ہم تم پر قربان ہوا کریں گے۔

(۳۹۹) سنگدست ہونا۔ کسی کام میں بہت ہوشیار ہونا۔ بت شکنی۔ یہاں مراد ایسی باتیں جو عشق الٰہی سے مانع ہوں ان کا قلع و قمع کر دینا۔ کیونکہ مذہب اسلام میں اول اول بت شکنی اسی غرض سے کی گئی تھی۔ ہم ہیں۔ یعنی جب تک ہم بحیثیت انسان کے یہاں زندہ ہیں۔ یہ مانا کہ ہم نے ان باتوں کا جو عشق الٰہی سے مانع آتی تھیں اپنی ہوشیاری سے قلع و قمع کر دیا ہے لیکن یہ ابھی درجہ بت شکنی ہے (جیسے کہ اسلام میں سب سے اول بت شکنی ہی کفار عرب میں آنحضرت کے ہاتھ سے عمل میں آئی تھی) اور ہم اس ابتدائی فرض سے گویا فارغ ہو گئے ہیں۔ مگر ابھی ہم بحیثیت انسان کے اس دنیا میں موجود ہیں تو ہمارے لئے ایک بت شکنی کیا ایسے اور بھی صد ہا امور اس راہ (یعنی راہ زیست میں) جو سنگ راہ ہیں یا ہمارے رستے میں مثل پتھروں کی ہماری مشکلات کا باعث ہیں کہ جن کا دور کرنا انسان پر گویا فرض اور واجب ہے یعنی مذہب کے علاوہ معاشرت کا حصول ایک دوسرے سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا وغیرہ وغیرہ۔

(۴۰۰) میرا خون جگر جوش یا اضطراب کی حالت میں ہے۔ کاش کہ خوننابہ یعنی خالص خون رونے والی میری اور کئی آنکھیں ہوتی۔ کہ خوب دل کھول کے روتا کیونکہ دفور خون اس قدر ہے کہ میری یہ محض دو آنکھیں اس کو کفایت نہیں کر سکیں۔

(۴۰۱) ہر چند میرا سر اڑ جائے (مجھے کچھ پروا نہیں) میں تو ان کی اس آواز پر مرتا ہوں کہ وہ میرے جلاد سے (جبکہ وہ مجھے قتل کر رہا ہو) یہ کہے جائیں کہ ''ہاں اور'' یعنے اور بھی خنجر یا تلوار کا وار مجھ پر کرے ۔

(۴۰۲) داغ نہاں - سینے کے اندر پوشیدہ زخم کا داغ ۔ میں اپنے سینے کے اندر کا ایک پوشیدہ داغ ہر روز نیا دکھاتا ہوں - (اور وہ داغ اسقدر بوجہ سوزش دل چمکتا ہے کہ اس کو دیکھکر لوگوں کو خورشید جہاں تاب کا دھوکا ہوتا ہے ۔ (چونکہ آفتاب ہر روز نکلتا ہے اس کے مقابلے میں داغ دل کا نکلنا بھی ہر روز بتایا گیا ہے) ۔

(۴۰۳) اس شعر کو یوں نثر کرکے اس کے معنے پر غور کرو ۔ مطلب صاف سمجھ میں آجائے گا ۔ ''اگر دل تمہیں نہ دیتا کیوں کر دم چین لیتا ۔ جو نہ مرتا (تو) کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا'' ۔ حاصل شعر یہ کہ عشق میں آرام کہاں ۔ جب تک مریں آہ و فغاں ہی کرتے رہینگے ۔

(۴۰۴) راہ نہ پانا - کسی طرف کو نکل جانے کا موقع یا رستہ نہ آنا ۔ نالے چڑھ جانا - ندیا نالے کا پانی چڑھ جانا - طوفانی ہونا ۔ جب نالے یا ندی کا پانی کسی طرف کو نکل جانے کا موقع نہیں پاتا - تو وہ نالا چڑھ جاتا ہے (اسیطرح) میری طبیعت جب کچھ رک جاتی ہے تو اس میں اور زیادہ روانی پیدا ہو جاتی ہے - یعنی کچھ دنوں شعر نہ کہوں تو اس رکاوٹ کے بعد طبع رواں اور زیادہ زور پکڑتی ہے ۔

(۴۰۵) دنیا میں اور بھی بہت اچھے اچھے شاعر ہیں مگر کہتے ہیں کہ غالب کا انداز بیان یعنی طرز ادائے مطالب کچھ اور ہی طرح کا ہے یعنی ایسا نرالا ہے کہ کسی کا نہیں ہے (وہ کیا ؟ بہت مشکل گو اور دقیق و بلیغ ہے) ۔

غزل

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر ۴۰۶ تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

۴۰۷ نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

(۴۰۶) صفائے حیرت آئینہ کو آب برجا ماندہ سے نسبت دے کر کہتا ہے کہ آب برجا ماندہ کا رنگ آخر تغیر پاتا ہے یعنے جو پانی ایک ہی جگہ ٹھہرا ہے تو اس پر کائی جم کر رنگ اس کا آخر بدل جاتا ہے یعنے سبزی مائل ہو جاتا ہے ۔ اب صفائے حیرت آئینہ اسیطرح آب برجا ماندہ کے مشابہ ہے کیونکہ آئینہ جو پانی کی طرح صاف و شفاف ہوتا ہے جب اس کو حیرت سے متماثل کیا گیا تو گویا وہ بھی بحالت سکون ٹھیرے ہوئے پانی کی سطح کے سے خواص رکھنے لگا - یعنی اس میں عموماً موسم برسات میں کچھ زنگ لگ کر سامان زنگ پیدا ہو جاتا ہے ۔ حاصل شعر یہ کہ اکثر صفائی میں کثافت از خود پیدا ہو جاتی ہے - جیسے کہ ٹھہرے ہوئے پانی کی صاف سطح پر کائی اور صاف و شفاف آئینے میں زنگ یا زنگار نمودار ہو جاتا ہے ۔

(۴۰۷) جام زمرد - غالباً ایک ایسا ساغر شراب مراد ہے کہ جس کا رنگ نیلم کا سا ہو - یا جس پر نیلم جیسا قیمتی پتھر لگایا گیا ہو ۔ داغ پلنگ ۔ چیتے کے جسم پر خوشنما داغ ہوا کرتے ہیں - جن میں بعض اوقات نیلگوں چتیاں بھی مشاہدہ کی گئی ہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ جام زمرد کی شکل شاید ایسی ہوتی ہوگی کہ کسی رنگدار شیشے پر نیلم اور دوسرے ہیروں کی خوشنما ٹکڑیاں لگا کر وہ چیتے کے داغوں کے متماثل بن جاتی ہوگی ۔ وحشت سے یہاں مراد پریشانی ہے ۔

عیش و عشرت اور جاہ و منصب کے (دلخوش کن) ساز و سامان نے بھی میری اس وحشت یا پریشانی کی تدبیر کی یعنے علاج نہ کیا (جو مجھ کو اس دنیا سے حاصل ہے) بلکہ جام زمرد (ایسا خوشنما ساغر شراب) بھی میرے لئے چیتے کے داغ یا اس کے جسم کی چتیوں کی طرح وحشت خیز ہو گیا ۔ (کیونکہ چیتا بظاہر اگرچہ بہت خوشنما جانور ہے مگر اس کی قربت بڑی وحشتناک ہوتی ہے جس سے دل پر خوف اور فوری دہشت چھا جاتی ہے) غالباً یہ شعر فارسی سے ماخوذ ہے خلاصہ

ندہ وحشت این بزم عشرت نتوان رست
ہرچند چراغانش کنی پشت پلنگ است

یعنی اس بزم یا دنیا کی بدولت دل کو جو پریشانی سی حاصل ہوتی ہے اس میں ہم کوئی مزے کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اگر اس بزم دنیا میں کوئی شخص چراغاں بھی کیا کرے (بغرض حصول مسرت) تو اس کی مثال ایسی ہی ہوگی کہ جیسے چیتے کی پشت (پر کی چتیاں) جو ایک سبب وحشت ہے۔

غزل

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی ۴۰۸ گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی ۴۰۹ ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے ۴۱۰ متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے ۴۱۱ شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا ۴۱۲ فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے ۴۱۳
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

---

(۴۰۸) عشاق عموماً یہ چاہتے ہیں کہ وہ دیوانے ہوں اور جو اسباب دیوانگی ہیں مثلاً گریبان چاک ہونا۔ ننگا ہونا وغیرہ وغیرہ یہ ان کو ضرور حاصل ہوں تاکہ ان کا جنون اور بڑھے۔ اسی مناسبت سے کہتا ہے۔ میں نے دیوانگی میں اپنا گریبان چاک کیا۔ تو عریانی نصیب ہوئی۔ بھلا یہ عریانی نہ ہوتی..... تو میرے جنون کی دستگیری یعنے اس کی امداد کون کرتا (مراد یہ کہ میں جب ننگا منگا ہوا تو سب نے مجھے دیوانہ جانا) لہذا وہ گریبان جس کو میں چاک کر چکا ہوں اس کا میری گردن پر حق ہو گیا ہے یعنے اس نے مجھ پر ایک گونہ احسان کیا ہے۔

(۴۰۹) برنگ۔ مثل یا مانند۔ کاغذ آتش زدہ۔ وہ کاغذ جو آگ لگ کر ایسا ہلکا ہو جاتا ہے کہ ہوا عموماً اس کو اڑا لے جاتی ہے۔ نیرنگ بیتابی بیقراری

کی نیرنگی یا بیقراری کا کئی کئی صورتیں بدلنا۔ بالِ یک تپیدن۔ یہاں تپیدن سے مراد وہ تڑپنا یا تڑپ ہے جو کاغذ آتش زدہ میں ہوا کرتی ہے اور بالِ یک تپیدن پر مراد کاغذ آتش زدہ کی تڑپ کی ایک ایک پرواز پر۔ یعنی جو اڑ کر جس قدر اونچا جاتا ہے۔ اس بلندی پر۔ ہزار آئینہ۔ ہزاروں مرتبہ۔

کہتا ہے میری بیقراریِ دل جو کئی کئی صورتیں بدلتی ہے یعنے نیرنگ بیتابی کاغذ آتش زدہ کی طرح (یا اس کی وضع اختیار کرکے) اپنے تڑپنے کی ایک ایک پرواز پر (مراد کاغذ آتش زدہ کے وہ ہزارہا پرزے جو ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔ اس کے ایک ایک پرزے کے اوپر جبکہ وہ ہوا میں اڑتا ہو) ہزاروں مرتبہ میرے دل کو باندھے ہے (صاف ظاہر ہے کہ اس صورت میں جبکہ کاغذ آتش زدہ کے لاکھوں پرزے ہوا میں اڑتے ہوں اور ہر پرزے پر دلِ عاشق کو ہزارہا مرتبہ باندھ دیا گیا ہو تو اس کے دل کی پریشانی کیا کیا صورتیں نہ اختیار کرے گی۔

(۴۱۰) ہم آسمان پر اپنی اس عیش کے لئے جو رفت و گزشت ہو چکی ہے۔ (یہاں مراد جس کو آسمان ہم سے چھین چکا ہے) کیا کیا تقاضا کرتے ہیں یعنے اس سے سخت تکرار کرتے ہیں۔ کہ ہم کو وہ واپس دیدے۔ گویا ایک متاع بردہ یا وہ مال و متاع جو ہم سے کوئی چور چرا کرلے گیا ہے۔ ہم اس کو رہزن پر اپنا زر قرض سمجھ رہے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ وہ قرض کسی طرح وصول ہو جائے۔ جو غیر ممکن ہے

(۴۱۱) بے سبب رنج آزما۔ بغیر کسی سبب کے لوگوں کو رنج پہنچاکے ان کی آزمائش کرنے والا۔ شعاع مہر۔ آفتاب کی کرن۔ چشم روزن۔ مکان کی کھڑکی۔ ہم ہیں اور وہ بے سبب لوگوں کو دکھ دینے والا۔ دشمن۔ یعنی وہ اسکے مکان میں سورج کی کرن پڑے تو تہمت لگاتا ہے۔ کہ کسی کی نگاہ اس کے مکان کی کھڑکی کی طرف پڑی ہے۔

(۴۱۲) فروغِ طالعِ خاشاک ۔ گھاس پھونس کو جلاتے ہیں ۔ تو شعلہ اٹھتا ہے ۔ گویا وہ اس کی قسمت کا فروغ یا چمکنا ہے ۔ اگر تو اپنی حقیقت کا مشتاق ہے ۔ یعنی اپنی اصل حقیقت دیکھنا چاہتا ہے ۔ تو اپنے آپ کو فنا کے حوالے کر دے ۔ یعنی خودی کو ترک کر دے ۔ جیسے گھاس پھونس کی قسمت جب چمکتی ہے ۔ جبکہ موقوف گلخن ہو ۔ یعنی اس کو بھٹی میں جلانے کے واسطے وقف رکھا جائے ۔

(۴۱۳) اسدؔ بسمل انداز کا بسمل ہے ۔ یہ اپنے قاتل سے کہتا ہے کہ تو مشق ناز کئے جا ۔ (یہ مشق ناز کرنا ہی گویا قتل کرنا ہے ۔ اور اس خوف سے کہ یہ خون بے گناہ ہے ۔ اور اس جہان میں تجھے قاتل ٹھیرا کر سزا دی جائے گی اور اگلے جہان میں بھی تو جواب دہ ہوگا ۔ ہرگز نہ ڈر کیونکہ) یہ خون دو عالم یعنی دونوں جہانوں کی طرف سے تجھ پہ خون کا الزام ہونا ، میری گردن پر یعنی وہ دونوں سزائیں میں تیرے لئے بھگت لوں گا ۔

۴۱۴ تکلف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر
کشاکش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں

(۴۱۴) میں تیرے ستم ایک مصلحت سے برداشت کر رہا ہوں ۔ وہ مصلحت یہ ہے ۔ کہ خوباں (بہت سے حسین) تیرے عاشق ہیں ۔ اور عاشقوں میں رقابت ہونا ایک لازمی امر ہے ۔ لہذا ان عشاق میں سے تو کسی کے ساتھ محبت پیدا کر لیگا ۔ (اور تو مجھ سے کنارہ کش ہو جائیگا ۔) تو کوئی نہ کوئی حسین جو تیرے اس آخرالذکر عاشق کا رقیب ہوگا ، مجھ سے " تکلف برطرف " یعنی آخرالامر مل جائیگا ۔

دوسرے معنی ۔ یہ کہ بہت سے حسین تیرے عاشق ہیں ۔ جن میں سے

تو کسی کو ناپسند کریگا ۔ تو وہ یہ دیکھکر کہ تو میرا معشوق ہے ۔ تیری دشمنی یعنے رقابت کی وجہ سے آخرکار میرے ساتھ آ ملیگا ۔ تو گویا مجھ کو تجھ سا حسین مل جائیگا ۔ جو کہ اس امر میں تیرا رقیب ہوگا ۔

غزل

۴۱۵ لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
۴۱۶ مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا — ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
۴۱۷ آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
۴۱۸ جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
۴۱۹ ہاں اے فلک پیر جوان تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
۴۲۰ تم ماہ شب چاردہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
۴۲۱ تم کون سے تھے ایسے کھرے داد وستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
۴۲۲ مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
۴۲۳ گذری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش — کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

۴۲۴ ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

(۴۱۵) زین العابدین متخلص بہ عارف ۔ مرزا غالب کے ایک عزیز تھے وہ جب مرگئے تو مرزا نے یہ غزل نوحہ کے طور پر لکھی تھی ۔ یہ بدرجۂ غایت دردناک غزل ہے ۔

شاعر عارف سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ۔ تمہیں لازم تھا کہ (ابھی نہ مرتے اور) کچھ دنوں اور یعنی تھوڑی مدت تک میرا رستہ دیکھتے ۔ گویا میرے مرنے کا انتظار کرتے ۔ اور مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے چلتے ۔ اب چونکہ تم تنہا چلے گئے ہو

یعنی خود ہی مرے اور مجھے ساتھ نہ لیا۔ تو ایسا کیوں کیا؟ تو اچھا اب کچھ دن اور تنہا قبر میں رہو اور پھر ہم بھی تم سے ملیں گے یعنی مر کر۔

(۴۱۶) تیرے در پر ابھی کچھ مدت اور ناصیہ فرسا ہوں۔ یعنی تیرے گھر کی دہلیز کے پتھر پر (فرطِ غم سے) کچھ دنوں اور بطورِ ماتم اپنا سر مارا کروں گا۔ اگر اس سے تیرا پتھر نہ گھسنے لگا (جس کے گھسانے کے لئے بہت زیادہ مدت درکار ہوگی) تاہم اس تھوڑے سے ماتم پرسی کے عرصہ میں میرا سر تو (اس پتھر سے ٹکرانے ٹکرانے) ضرور مٹ جائے گا۔

(۴۱۷) چونکہ عارف بہت بڑی عمر پا کے نہیں مرے تھے۔ بلکہ جوان مر گئے تھے کہتا ہے کل ہی تو تم آئے تھے۔ (یعنی اس مہمان سرائے دنیا میں) اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں۔ یعنی مر جاؤں۔ یہ مانا کہ یہاں ہمیشہ کوئی نہیں رہتا۔ اچھا تو تھوڑے دنوں اور زندہ رہتے۔

(۴۱۸) تم جاتے ہوئے (بزبانِ حال) کہتے ہو کہ اب قیامت کو ملیں گے۔ (کیونکہ اسلام میں یہ عقیدہ ہے۔ کہ سب مرنے والے قیامت کو جمع ہوں گے) کیا خوب! ابھی قیامت کا کوئی اور دن ہے جو آنے والا ہے ہمارے لئے تو یہی آج کا دن قیامت کا دن ہے۔ کہ تو ہمارا عزیز جواں مرگی وفات پا گیا۔

(۴۱۹) عارف کی میت سے باتیں کرتے کرتے اب مصنف آسمان کی طرف مخاطب ہو کے کہتا ہے۔ ہاں اے فلکِ پیر (یعنی تو اس قدر بوڑھا ہونے کے تا حال زندہ ہے) ہنوز عارف جوان تھا۔ تیرا کیا بگڑتا۔ اگر وہ چند سے جیتا رہتا۔ اور اس دنیا سے نہ جاتا۔

(۴۲۰) پھر عارف سے مخاطب ہو کے کہتا ہے۔ تم میرے گھر میں ماہِ شب یازدہم یعنی چودھویں رات کے چاند تھے۔ یعنی میرا گھر تمہارے ہی دم سے روشن تھا۔ (فی الحقیقت مرزا بے اولاد تھے۔ اور عارف ہی سے گھر میں بڑی

(۴۲۰) پھر عارف سے مخاطب ہو کے کہتا ہے۔ تم میرے گھر میں ماہِ شبِ چہاردہم یعنی چودھویں رات کے چاند تھے یعنی میرا گھر تمہارے ہی دم سے روشن تھا (فی الحقیقت مرزا بے اولاد تھے۔ اور عارف ہی سے گھر میں بڑی رونق
تھی) پھر جب چودھویں کا چاند بھی کچھ دنوں پر اپر قائم رہتا ہے۔ اور گھٹتے گھٹتے کئی دنوں میں ہلال بن کے غائب ہوتا ہے۔ تو تم (یعنی عارف) کیوں ایسے دفعۃً مر گئے۔ اور میرے گھر کا وہ نقشہ یعنی وہ رونق کچھ دنوں اور قائم نہ رہی۔

(۴۲۱) داد و ستد لین۔ دین داد و ستد کے کھرے یعنی لین دین میں کسی طرح کسر نہ کھانے والے۔ چونکہ داد و ستد سے یہاں جان کا لینا دینا مراد ہے۔ تو اس معاملے میں کوئی بھی کھرا نہیں ہو سکتا۔ جب خدا چاہے جان دے کے پیدا کر سکتا ہے۔ کوئی یہ تقاضا نہیں کر سکتا کہ مجھے کچھ دنوں پہلے کیوں جان نہ دے دی۔ یا ملک الموت جب جان لینے کو آتا ہے۔ تو کوئی مرنے والا یہ عذر نہیں کر سکتا کہ ابھی تو وہ میری جان نہ لے۔ تو اسی خیال سے شاعر عارف سے کہتا ہے۔ کہ تم جان کے لین دین کے معاملے میں کونسے ایسے کھرے تھے (یعنی یہ بات تمہارے اختیار ہی سے باہر تھی) تو پھر اس پر تقاضا ہی کیا کر سکتے تھے۔ کہ ملک الموت (تمہاری جان لینے کو) کچھ دنوں اور ٹھہر سے جھگڑتا رہتا (گویا اِدھر وہ آیا۔ اور اُدھر اپنی جان تم نے اس کے حوالے کر دی)۔

(۲۲۲) سہی کا لفظ بعض اوقات فرض کرنے کے موقع پر مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً تم نواب سہی یعنی فرض کیا۔ کہ تم نواب ہو۔ اس شعر میں تیر سے مراد غالب کا ایک شاگرد رشید ہے۔ فرض کیا کہ مجھ سے تمہیں نفرت تھی۔ اسلئے دنیا سے چلے گئے۔ اور بالفرض تیر سے لڑائی تھی۔ (اس کو بھی چھوڑا) مگر کیا اپنے بچوں یعنی اولاد کا تماشہ (ان کی کھیل کود دیکھ کر مثل والدین کے لطف اٹھانا) بھی تمہیں منظور نہ تھا۔ کہ انہیں چھوڑ کر مر گئے۔ تمہیں انہی کی خاطر ابھی کچھ مدت اور جینا چاہیئے تھا۔

(۲۲۳) اے جوانمرگ عارف جس طرح تیری اتنی عمر گذر گئی تھی۔ واہ خوشی کے ساتھ یا ناخوشی سے اب اسی طرح اللہ کچھ دن بھی جیتا رہتا (کہ ہمیں اپنے جوانا موت مرنے کا صدمہ نہ دیتا)

(۲۲۴) (گو۔ تم نادان ہو۔ یعنی ایک خاص راز سے واقف نہیں ہو۔ جو کچھ کہتے ہو۔ مگر "غالب (عارف ایسے عزیز کے مرنے کے بعد) اب کیوں جیتے ہیں۔ دراصل وہ راز جو تم سے چھپا ہے۔ یہ ہے کہ) میری قسمت میں ابھی مرنے کی تمنا (یعنی جوانمرگ عارف کے صدمے سے اپنے مرجانے کی آرزو کرنا) کچھ مدت کے لئے اور باقی و قائم ہے۔

غزل

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر ۲۲۵ ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز
ہے ناز مفلساں زر از دست رفتہ پر ۲۲۶ ہوں گلفروش شوخیِ داغ کہن ہنوز
میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں ۲۲۷ خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز

(۲۲۵) صبح و مہر۔ آفتاب صبح کو نکلتا ہے تو وہ گویا صبح کا گریبان چاک کر کے تمام دن چمکتا رہتا ہے۔ اور یہ اس کی مصروفیت ہے۔ داغ عشق۔ یہ بھی شعرا کے نزدیک مثل آفتاب کے گرم اور روشن ہوا کرتا ہے۔ جیب کفن جیب کفن پہنتے ہیں۔ (یعنی ایک ٹکڑا کفن کے کپڑے کا مردے کے گریبان وغیرہ بنانے میں صرف ہوتا ہے۔ یہی جیب کفن ہے جو سینے پر ہوتا ہے۔ اسی سے گویا داغ عشق ڈھنپا ہوتا ہے۔

مجھے تو فارغ نہ سمجھ (کہ مر کے خلاصی پا گیا) بلکہ جس طرح آفتاب صبح کا گریباں چاک کر کے تمام دن روشنی کرنے میں مصروف رہتا ہے میرا داغ عشق بھی (جو سینے میں ہے) جیب کفن کی زینت بنا ہوا ہے۔ یعنی وہاں سے گورستان میں روشنی کر رہا ہے۔

(۲۲۶) قاعدہ ہے۔ کہ انسان غریب ہو جائے۔ تو وہ اپنی گذشتہ دولت و ثروت مندی پر فخر کیا کرتا ہے۔ اسی طرح کہتا ہے۔ جس طرح مفلسوں کو زر از دست رفتہ یعنی اپنے ضائع شدہ مال پر فخر و ناز ہوا کرتا ہے۔ میں بھی اپنے داغ کہن یا کسی پرانے زخم کی (جو اب اچھا ہو چکا ہے) شوخی یعنی خون آلودگی کے سبب اس کا گویا گلفروش ہوں۔ مطلب یہ کہ ان پر بڑا گھمنڈ کرتا ہوں۔ کہ عشق میں میں نے بھی ایسے زبردست صدمے اٹھائے داغ کھائے تھے۔

(۲۲۷) جگر کی نسبت مشہور ہے۔ کہ اس میں خون کا اجتماع ہوتا ہے لہذا میخانہ جگر۔ جگر میں خون کا ذخیرہ مراد ہے یا شراب خون کا میخانہ۔ زمانۂ قدیم میں شراب بھی بظاہر خون ہی کی طرح لال رنگ کی ہوا کرتی تھی۔ خمیازہ کھینچنا۔ انگڑائیاں لینا یعنی کسی بات کی خواہش میں جمائیوں بھرنا +

میرے جگر کے ذخیرۂ خون میں خاک بھی نہیں رہی ہے یعنی سب خون جگر سے نکل گیا۔ اور وہ بت بیداد فن (ظالم معشوق) ابھی جمائیاں لے رہا ہے۔

یعنی میرے اور خون کا خواہشمند ہے (یہ کہاں سے لاؤں) +

غزل

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز ۲۲۸؎ دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
نہ ہو بہرزہ بیابان نوردِ وہمِ وجود ۲۲۹؎ ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں ۲۳۰؎ کہ دیجئے آئینۂ انتظار کو پرداز
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست ۲۳۱؎ گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

۲۳۲؎ نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنون غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

(۲۲۸؎) فسونِ نیاز۔ عام طور پر کوئی مقصد پیشِ نظر ہو تو اہلِ ہند پیروں فقیروں کو اللہ کے نام پر نذر و نیاز دیا کرتے ہیں۔ اور فسون جادو کو کہتے ہیں۔ تو فسونِ نیاز کے معنی نذر و نیاز کا جادو ہوا۔ عمرِ خضر۔ یہ بہت لمبی بتائی جاتی ہے +

مایوسی سے فریاد کرکے کہتا ہے کہ اے خدا۔ اگر میری نذر و نیاز کا (جس پر میں اس قدر صرف کر چکا ہوں) جادو حریفِ مطلبِ مشکل نہیں۔ یعنی وہ نذر کا جادو میری امید کی مشکل کا حریف نہیں بنا۔ یا اس کا حل کرنے والا نہیں ہوا تو (بطور طنز کہتا ہے۔ اچھا) یہ دعا تو قبول کر۔ کہ خضر کی عمر دراز ہو یعنی وہ تو سنا ہے۔ کہ ابھی جیتا ہے اور اس کی عمر پہلے بھی بہت زیادہ تھی اور ابھی اور بھی دراز ہوگی۔ مگر جب میری یہ دعا تو سنے گا۔ تو شاید اس کے برعکس تو اس کو بھی یعنی عمرِ خضر کو بھی ضرور کوتاہ کر دے گا۔ یادگارِ غالب میں مولینا حالی نے اس شعر کا مفہوم یہ لکھا ہے۔ کہ مصنف کہتا ہے۔ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز نے کچھ کام نہ دیا۔ ناچار اب یہی دعا مانگیں گے۔ کہ الٰہی خضر کی عمر

دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں گے۔ جو پہلے ہی دی جا چکی ہے +

اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ جب انسان امید کے بر آنے کے لئے سخت کوشش کرتا ہو۔ اور وہ امید بر نہ آئے تو اس کا وہ چیز طلب کرنا جو پہلے ہی حاصل ہے اس کو اس سے فائدہ کیا ہوگا۔ خصوصاً عاشق جو ایسی دعا مانگتا ہو اس کو کیا تعلق کہ خضر کی عمر دراز ہو۔ میرا تو خیال یہ ہے۔ کہ شاعر خدا پر طعن کرتا ہے کہ جب تو ہماری مفید مطلب دعائیں قبول نہیں کرتا تو کیا اب ایسی دعائیں مانگا کریں۔ کہ جن سے ہمارا کچھ مقصد نہ بر آئے جیسا کہ عمرِ خضر دراز ہو۔ اور پھر ممکن ہے کہ ہماری ضد سے تو ایسی قبول کی ہوئی دعا سے بھی بوجہ ہمارے خاص طور پر استدعا کرنے کے اپنا منہ پھیر لے +

تیسرے معنی:۔ کہتا ہے کہ فسونِ نیاز بھی جب ہماری مشکل کا حل نہ کر سکا۔ تو یا رب دعا قبول ہو۔ کہ عمرِ خضر دراز ہو۔ کہ وہی اب ہماری مشکل کو جو عمرِ خضر چاہتی ہے۔ حل کرے گا۔ (عموماً مشہور ہے کہ خواجہ خضر جہاں بیٹھتے تھے یا جس طرف سے گذرتے تھے۔ سبزہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اسی لئے خضر کے معنی سبز کے ہیں۔ یعنی ان کے قدم کی برکت سے لوگوں کی تمنائیں سر سبز ہوتی تھیں۔ تو اب عاشق کی مشکل خواجہ خضر ہی حل کریں گے۔ اور وہ بھی اتنے عرصے کے بعد کہ جب خدا ان کی عمر میں اور درازی کر دے گا +

(۲۲۹؎) نہ ہو بہرزہ۔ یعنی بیہودہ کاموں میں تضیعِ اوقات نہ کر۔ مثلاً بیابان نوردِ وہمِ وجود ہونا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمہ اوست پر عقیدہ نہ رکھ کے یہ خیال کرنا کہ خدا کے سوا بھی یہاں کسی چیز کا وجود ہے۔ تو ایسے وہمِ وجود کے بیابان میں گامزن ہونے سے باز آ۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تیرے تصور میں ابھی نشیب و فراز کے خیالات بھرے پڑے ہیں (نشیب سے مراد دنیا اور فراز آسمان) حالانکہ یہ کچھ بھی ذاتی وجود نہیں رکھتے اور سب کچھ وہی ذات پاک ہے حاصلِ شعر یہ کہ اصول ہمہ اوست کا پابند رہ +

(۲۳۰) اگر یہ شعر یوں ہو —

وصال جلوہ تماشا ہے پہ دماغ کہاں
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

تو شارحینِ غالب کے معنی جو کھینچ کھانچ کر لگائے گئے ہیں۔ درست ہیں
کہ وصالِ دوست بہت سے جلوے دکھلانے والی چیز ہے مگر ہمارے دماغ کو یہ
طاقت برداشت کہاں کہ آئینۂ انتظار کو پرواز دیجے یعنی انتظار کریں۔
مگر نسخۂ حمیدیہ میں یہ شعر یوں تحریر ہے —

وصال جلوہ تماشا ہے پھر دماغ کہاں
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز؟

تاہم ممکن ہے کہ کتابت کی غلطی ہو اور یہ شعر اس طرح ہو —

خیال۔ جلوہ تماشا ہے۔ پہ دماغ کہاں
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

آخر الذکر شعر کے معنی یہ ہوئے کہ خیال۔ ہمیں معشوق کے جلوے کا
تماشا دکھا سکتا ہے یعنی وہ تخیلِ معشوق ہی کے جلوے کا نظارہ بن سکتا ہے
لیکن ہمارے دماغ میں اب طاقت کہاں (بوجہ ضعفِ دماغ کے) کہ آئینۂ
انتظار یعنی ایسا آئینہ جس میں انتظار رہتا ہو۔ مراد دل کو اتنی پرواز یا طاقت
پرواز کہاں حاصل۔ کہ وہ جلوۂ یار جیسے اعلیٰ تصور تک پہنچ سکے۔

(۲۳۱) خاک ہوئے پر یعنی مر کر بھی اس کے جلوۂ ناز (ناز و انداز کے
دیکھنے) کی خواہش نہ گئی۔ چنانچہ (وہ آفتاب کی طرح جلوہ ناز دکھاتا تھا تو اب)
عاشق کا قبر میں ایک ایک ذرہ آفتاب پرست بن گیا ہے۔

(۲۳۲) خاک انداز۔ کوڑا کرکٹ ڈالنے کا برتن۔ اے غالب جنون
کے بیابان کی وسعت کا حال کیا پوچھتا ہے۔ وہاں تو یہ آسمان کا کاسہ (پیالہ)
بھی ایک خاک انداز کے برابر ہے۔ یعنی اس کے سامنے اس قدر چھوٹا سا ہے

مراد یہ ہے کہ عالم جنون آسمان سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سر تا سرِ خاک ۲۳۳ گذرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت ۲۳۴ نقشِ پا میں ہے تبِ گرمیِ رفتار ہنوز

---

(۲۳۳) سعیِ کرم بخشش کرنے میں محنت اور کوشش کرنا۔ سر تا سر
خاک۔ زمین کے اس سرے سے اس سرے تک۔
عملِ بخشش میں محنت اور کوشش سے کام لینے کی یہ مثال دیکھ کہ اگرچہ
ابرِ گہربار ہے۔ یعنی جب وہ برستا ہے۔ تو اس کا پانی سیپیوں میں جا کر گوہر
بن جاتا ہے۔ تاہم وہ اپنے پاؤں کے چھالوں کے باوجود کہ محنت سے پڑتے ہیں بغرضِ کرم
اک زمین سے دوسری زمین تک اڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ (آبلہ پا
یہاں مراد قطرۂ ابر اور محنت سے آبلے پڑنا)

(۲۳۴) یک قلم۔ سر بسر۔ ابھی میرے پاؤں کے نقش میں چلنے سے جو
گرمی پیدا ہوئی ہے۔ اس کی تپ یا حرارت سے صفحۂ دشت یعنی جنگل کی سطح
سر بسر کاغذِ آتش زدہ (جلا ہوا کاغذ) بن گئی ہے۔

غزل

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز ۲۳۵ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے ۲۳۶ ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالب ۲۳۷
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

---

(۲۳۵) میں اس بت سے اپنی جان کیونکر عزیز رکھوں یعنی اس پیجان

کس لئے قربان نہ کروں کہ وہ بُت میرا ایمان ہے (یعنی اس قدر وہ مجھے پیارا ہے)۔ لہذا کیا وہ ایمان مجھے اس قدر عزیز نہیں۔ کہ جس پر اپنی جان قربان نہ کروں (ایک عام اور دو مثل ہے کہ ایمان کے آگے جان بھی کوئی چیز نہیں)۔

(۲۳۶) تیرے تیر کی نوک مجھے بہت عزیز ہے وہ دل میں چبھ کر باہر تو نکل آئی۔ لیکن ابھی دل سے نہیں نکلی۔ یعنی دل میں اس کی یاد تا ہنوز تازہ ہے)۔

(۲۳۷) اے غالب گو واقعہ ایسا سخت ہے (جس کے لئے جان دے دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مثلاً نوجوان بیٹے کی وفات یا آبرو کا خاک میں مل جانا وغیرہ) مگر آخر جان عزیز ہے (جس کا [illegible]) لہذا تاب لائے یعنی صبر ہی کرنے سے بنے گی۔

غزل

نے گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۲۳۸ میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل ۲۳۹ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
لافِ تمکین فریبِ سادہ دلی ۲۴۰ ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد ۲۴۱ ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے ۲۴۲ ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خون ۲۴۳ جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ یک قلم انگیز ۲۴۴ اے ترا ظلم سر بسر انداز
قطعہ تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ۲۴۵ ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا ۲۴۶ میں غریب اور تو غریب نواز
۲۴۷ اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

(۲۳۸) گُلِ نغمہ۔ گلبانگ۔ یعنی خوشخبری کی صدا۔ پردۂ ساز۔ باجوں کے اوپر کا پردہ کہ اس کو اٹھا کر باجہ بجاتے ہیں۔ شکست کی آواز۔ کسی چیز کے ٹوٹنے سے جو آواز نکلے۔ مثلاً چینی کا کوئی برتن ٹوٹے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ حل شعر نہ میں صدائے گلبانگ ہوں نہ پردۂ ساز (جس کے اٹھانے سے باجا بجنے لگتا ہے) بلکہ میں تو اپنی شکست ہی کی آواز ہوں۔ مطلب یہ کہ میں وجہ مسرت نہیں ہوں بلکہ ایک سببِ غم ہوں۔

(۲۳۹) معشوق اپنے بالوں کی آرائش کرتے وقت زلفوں کو خم دے کر اپنے رخسار کسی قدر ان بالوں سے چھپا لیا کرتا ہے۔ یہ مڑے ہوئے بال خم کاکل کہلاتے ہیں تو ہے اور تیرا خم کاکل کی آرائش کرنا (یعنی تو اپنے بناؤ سنگار ہی میں محو رہتا ہے۔ اور ہماری طرف سے لاپرواہ) ادھر میں ہوں اور دور دراز کے اندیشے اور فکر کہ اب تو اپنا بناؤ سنگار کر کے کہاں کہاں جائے گا۔ رقیب تجھ پر کس کس طرح قربان ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ دور کی فکریں مجھے لاحق رہتی ہیں)۔

(۲۴۰) اب ہم ہیں اور سینے میں وہ عشق کے سینہ گداز راز جو بوجہ سینہ گداز ہونے کے (یعنی سینے کو پگھلانے والے ہونے کے) کبھی چھپے نہیں رہ سکتے لہذا ہماری یہ لاف زنی کہ ہم بڑے ضابطہ آدمی ہیں اور یہ راز کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔ یہ محض لافِ تمکین (ضبط کا جھوٹا اظہار) ہے اور اس کا باعث فریبِ سادہ دلی ہے یعنی ہم اپنے حال سے بے خبر ہیں۔ کہ ہمارے راز سینہ گداز ہیں اور یہی سادہ دلی یا سادگی جو ہم میں ہے۔ اسی کی وجہ سے ہمیں یہ دھوکا ہوا ہے۔ کہ ہم اپنے آپ کو بڑا ضابطہ شخص سمجھے ہوئے ہیں۔

(۲۴۱) میں صیاد کی محبت کا گرفتار ہوں۔ اور مجھ میں قوتِ پرواز یعنی اڑنے

کی طاقت بھی باقی ہے (اگر چاہوں تو اٹھ سکتا ہوں) مگر نہیں اٹھتا

(۸۴۲) اب تو اس ستم گر کے ناز و انداز کی حسرت کھینچ رہا ہوں۔ یعنی وہ مجھے اپنا ناز و انداز نہیں دکھاتا۔ اور یہ حسرت میرے دل میں باقی ہے۔ کاش وہ دن بھی آئے کہ اس ظالم معشوق سے بجائے اس حسرتِ ناز کے اس کے ناز ہی کھینچوں یا اس کے ناز اٹھاؤں۔ گویا فراق وصال میں تبدیل ہو جائے۔

(۸۴۳) گلباری۔ پھولوں کو لے کر ایک دوسرے کی طرف پھینکنا میرے دل میں کوئی ایسا قطرۂ خون نہیں ہے۔ کہ جس کے ساتھ میری پلکوں کے بالوں نے گلبازی نہ کی ہو یعنی دل کا خون آنکھوں کی طرف بوجہ گریہ و زاری کے آیا اسے پھر ایک ایک قطرہ پلکوں کے بالوں نے اٹھا کر اس سے گلباری کی یعنی اسے زمین پر گرا دیا۔

(۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶) یہ تینوں شعر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک قطعہ بند ہیں۔

انگیز مصدر انگیختن (ابھارنا) ہے فارسی میں اس کے مختلف معنی ہیں (۱) بر شورانیدن سرشوری پر مائل کرنا مثلاً سر گرم انگیز تودہ یا بد فتنہ سے چند (۲) شہوانی خیالات کا ابھارنا مثلاً نسبت از بوسہ بہ انگیز تو است۔ مگر اردو میں انگیزنا۔ جیسے سہنا، ظرف جس کی جانب سے تیر نگاہ تیز جائے۔ اس لئے دل میرا ہی سا ہو تو اسے انگیز جائے

کہتا ہے اے معشوق تیرا غمزہ فوراً انگیز کرنے والا یعنی شہوانی یا سرشورانہ خیالات ابھارنے والا ہے۔ پھر اس کے ساتھ تو ظالم بھی ہے اور خونریز (ظلم تمام منزلہ ذکر کرنے والا یعنی عاشق پر حملہ آور ہونے والا۔ یا اسے مار گرانے والا ہے۔ مختصر معنی یہ کہ تو فوری امید دلانے والا نیز سخت مایوس کر دینے والا معشوق ہے۔

(۸۴۵) میرے پاس تو خود بخود آگیا تجھے مبارک ہو۔ لے اب میں تیرے سامنے سجدے میں گر پڑتا ہوں۔ یعنی پرسش سجدہ جبینِ نیاز (نیازمندی کی پیشانی کے سجدے کا زمین پر پڑنا)

(۸۴۶) تو یہاں آیا۔ اور میرا حال پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا۔ کیونکہ میں غریب ہوں اور تو غریب نواز

(۸۴۷) اسد اللہ خاں۔ مرزا غالب کا نام اس شعر میں بجائے تخلص اسد کے ان کا پورا نام ہی بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسد اللہ خاں (آج) تمام ہو گیا یعنی وفات پا گیا (اب یہ خبر سن کر ہی سب کہیں گے) آہ وہ رند شاہد باز (رندی باز) دنیا سے اٹھ گیا (گویا اپنی حقارت کرتا ہے کہ افسوس میں ایسا گنہ گار آدمی ہوں)

غزل

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے ۸۴۸ دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا ۸۴۹ جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے ۸۵۰ خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے ۸۵۱ دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل ۸۵۲ نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے ۸۵۳ خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

۸۵۴ مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

(۸۴۸) شکاری لوگ کسی پالتو جانور کو پنجرے میں بند کر کے اس جگہ کہ جہاں جال بچھایا گیا ہو۔ رکھ دیتے ہیں اور جنگل کے آزاد جانور بڑے شوق سے وہاں اس قیدی جانور کی آواز سن کے آتے ہیں اس طرح قفس اور خالی یعنی جال میں پھنس جاتے ہیں اسی لئے کہتا ہے :-

اے میرے ذوقِ اسیری تجھے خوشخبری ہو کہ مرغِ گرفتار کے پنجرے

کے پاس یہ ایک خالی جال بھی بچھا ہوا ہے۔ تو چل اور اس میں جا کے شوق سے پھنس جا۔ کوئی مزاحم نہیں ہوگا)

(۴۹) جگرِ تشنۂ آزار۔ میرا جگر دکھوں کا بھوکا ہے۔ یعنی جتنا دکھ اسے ملے یہ پسند کرتا ہے۔

ہم نے ہر کانٹے کی نوک (چبھ) کے پاس (جا کر اور اس کی نوک کو اپنے جگر میں گڑو کر ہر جگہ) ایک خون کی ندی بہائی۔ مگر پھر بھی ہمارے دکھوں یا تکلیفوں کے خواہشمند جگر کی تسلی نہ ہوئی۔

دوسرے معنی:۔ ہم نے ہر کانٹے کی چبھن سے اپنے پاؤں کو لہولہان کیا مگر ہمارا جگر جو کشتۂ آزار تھا۔ ہمارا خون اس طرح ہر خار کے پاس بطور ندی بہتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوا۔

(۵۰) اگر [illegible] بیمار عاشق کے پاس آئے۔ کہ حالت نزع ہے۔ اور اس نے تمہیں دیکھنے کو اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ تو وہ [illegible] لیکن یعنی وہ مرگیا اور تمہارا دیدار نہ کرسکا۔

(۵۱) کسی جانور کو کند چھری سے ذبح کرتے ہیں۔ تو اس کی جان رک رک کے نکلتی ہے۔ کہتا ہے کہ مجھ کو بھی معشوق ایک کند خنجر سے حلال کر رہا ہے اور میں رک رک کے مر رہا ہوں۔ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ اگر کہیں غمخوار کی ایسی تیز زبان کے عوض ایک تیز خنجر ہوتا۔ تاکہ وہ جلدی میرا خاتمہ کر دیتا۔ اور مجھے اتنی تکلیف نہ پہنچتی۔

(۵۲) سے حضرت دل شیر کے منہ میں جا کر بیٹھ جائیے۔ مگر ان دل آزار خوباں (معشوقوں) کے پاس جا کر کھڑے نہ ہوجیے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز

(۵۳) کیا سبزہ جب نمو کرتا ہے تو وہ روز بروز اپنی جگہ سے کچھ آگے کو

سرک جاتا ہے جیسے بیل نمو کرتی یعنی بڑھتی ہے۔ تو درخت کی چوٹی تک پہنچ جاتی ہے۔ مطلب تیرے جیسے پیارے معشوق کو دیکھ کر خود چمن بھی آگے بڑھ کر تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ نمو کرتا ہے۔ اور اس کے نمو سے چمن بھر کا ہر پھول آپ سے آپ تیری پگڑی کے اندر کے ایک گوشے تک پہنچ جاتا ہے۔ گویا تجھ کو باغ کے پھول توڑ کر پگڑی میں لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ خود ہی شوقِ محبت سے جھک کر تیرے پاس آجاتا ہے۔

(۵۴) یہ شعر نثر میں اس طرح ہے: "غالب وحشی سر پھوڑ کے مرگیا۔ اس کا وہ تیری دیوار کے پاس آکر بیٹھنا یہ ہے"۔ یعنی وہ کیوں بیٹھا کرتا تھا۔ اگر نہ بیٹھتا تو اسے تیری دیوار کے ساتھ سر ٹکرانے کی ترغیب ہی نہ ہوتی۔

ز بسکہ گرمیِ جوہر طراوتِ سبزۂ خط سے (۵۵) لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق (۵۶) نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

---

(۵۵) صیقلی آئینے میں ایک لمبا خط سا ہوتا ہے جو سبزی مائل ہوا کرتا ہے اس کو جوہرِ آئینہ کہتے ہیں یا سبزۂ خط۔ دوست کے رخساروں پر کا سبزہ روئے نگار دوست کا بھرا ہوا چہرہ۔ آگ محبوب کا رخسار۔

دوست جب آئینے میں اپنا منہ دیکھتا ہے۔ تو ممکن ہے کہ خانۂ آئینہ میں اس کا آگ جیسا چہرہ آگ لگا دے۔ اگر اس کے آئینے کا خس نما (گھاس پھونس جیسا) جوہر دوست کے سبزۂ خط سے تری نہ اخذ کیا کرے (چونکہ آئینے میں ایک زمینی طراوت یانی بھری رہتی ہے۔ لہذا اس دوست کے آگ جیسے رخسار سے وہ آئینہ جل نہیں اٹھتا)

(۵۶) مطلب جس قدر معشوق زیادہ آگ جیسا ہو کے عاشق کو اپنی صورت دکھاتا ہے وہ اس شعلہ روئی ہی سے جل کر نیست و نابود ہو جاتا ہے

اس کا ثبوت یہ کہ شمع کے پاؤں سے کا نٹا یعنی اس کی بتی جیسی نکلتی ہے
کہ وہ چوٹی سے لے کر اپنے خاتمے تک شعلۂ آتش میں جل کے بھسم ہو جاتی ہے

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع ۵۷ چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

(۵۷) آفتاب شام کے وقت غروب ہو کے ہمیں دکھائی نہیں دیتا مگر غروب سے تھوڑی مدت پہلے آسمان پر ایک سفیدی سی ہو اکرتی ہے جسے تارِ شعاعِ شمس کہتے ہیں۔ شاعر نے اسی کو سورج کے آسمان سے چلے جانے کا ایک رستہ قرار دے کے جادۂ راہِ خور۔ یعنی سورج کے رستہ چلنے کی پگڈنڈی کہا ہے۔ آغوشِ وداع۔ جب کسی کو رخصت کرتے ہیں۔ تو پہلے اس سے بغلگیر ہو لیا جاتا ہے۔ وہی آغوشِ وداع ہے جس سے یہاں استعارہ کیا گیا ہے۔
آسمان سے وقتِ شام سورج جب رخصت ہونے لگتا ہے تو ایک تارِ شعاع (آسمان پر کچھ سفیدی سی) اس کے لئے راہ چلنے کی پگڈنڈی کا کام دیتی ہے۔ اور چونکہ سورج کا وقتِ وداع ہوتا ہے۔ آسمان ماہِ نو (ہلال) کو نمودار کر کے گویا یہ اپنی آغوشِ وداع کھول دیتا ہے کہ اس کو دیکھتے ہی آفتاب فوراً سفر کر جاتا ہے۔ چونکہ ماہِ نو یا ہلال کی شکل انسان کی بغل ہی کی طرح گول سی یا اندر سے خالی بیضوی سی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے آغوشِ وداع کا استعارہ کیا گیا ہے۔

غزل

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع ۵۸ ہوئی ہے آتشِ گُل آبِ زندگانیٔ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی ۵۹ یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام ۶۰ بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

غم اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ ۶۱ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے ۶۲ بجلوہ ریزیٔ باد و بپرفشانیٔ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ ۶۳ شگفتگی ہے شہیدِ گُلِ خزانیٔ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو ۶۴ نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

(۵۸) رُخِ نگار۔ معشوق کا آگ جیسا چہرہ۔ آتش مراد آتشِ گُل رخسارِ معشوق ہمارے معشوق کے آگ جیسا رخسار سے (بوجہ رقابت و حسد) شمع ہمیشہ جلتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس کے سوزِ جاودانی (یعنی شمع کے ہمیشہ جلا کرنے) کا یہی باعث ہے پس آتشِ گُل رخسارِ معشوق شمع کے حق میں آبِ زندگانی (آبِ حیات) کا کام کر رہی ہے۔ دکھ شمع اس سے ہمیشہ بوجہ حسد جلتی رہتی ہے تو اس کو بدامی زندگی حاصل ہو گئی ہے۔

(۵۹) زبانِ اہلِ زباں میں یعنی جو اشخاص ٹکسالی زبان رکھتے ہیں۔ ان کے محاورہ میں مرگِ خاموشی یعنی چپ رہنا ہی گویا مرجانا ہے۔ زبانیٔ شمع۔ شمع کی زبان سے یا اس کے ظاہر حال سے۔
جو اشخاص اہلِ زبان ہیں۔ ان کے محاورے میں خاموشی یعنی ان کا چپ رہنا ہی ان کی موت ہے یا ان کی موت گویا ان کی زبان کا مرجانا ہے۔ مطلب یہ کہ زبان کی زندگی اہلِ زبان ہی کی روزانہ بات چیت سے ہے) یہ بات شمع کی زبانی یا اس کے ظاہر حال سے صاف واضح ہوتی ہے۔ کہ اگر شمع کی زبان نہ جلے یعنی کام نہ کرے۔ تو وہ شمع مردہ ہو جائے۔ پس شمع کی زندگی دیا اس کی رونق کا باعث یہی ہے۔ کہ اس کی زبان جلتی رہے۔ مصنف اس شعر میں اہلِ زبان کو سلسلۂ شعر گوئی جاری رکھنے کی تحریک کرتا ہے۔

(۶۰) جو لوگ ہمہ اوست کے قائل ہیں وہ چاہتے ہیں۔ کہ اس غلیظ ظاہری وجود سے بالکل خلاصی پا کے یعنی مر کے واصل بحق ہو جائیں۔ مثلاً شاعر کہتا ہے۔ کہ

جس طرح اہلِ فنا (صوفی لوگ یہ) چاہتے ہیں۔ کہ فنا فی اللہ ہو جائیں۔ شمع کی فسانہ خوانی بھی (مراد اس کا رات بھر جلنا اور اپنی زبان سے جو کام وہ کرتی رہتی ہے لکھوشش فسانہ خوانی کے کرتا) صرف با بیانِ شعلہ ہے کہ جس میں وہ اپنا قصہ تمام کرتی ہے یعنی شعلہ (جو شمع کی فنا کا باعث ہے۔ کیونکہ وہ جس قدر جل کر کے شعلہ یا روشنی پیدا کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ فنا بھی ہوتی جاتی ہے وہ۔ اس کا ایسا یا حکم کرنے والا ہے۔ کہ ایسا کیا کرے۔ اسی طرح اہلِ فنا بھی۔ فنا فی اللہ کی غرض سے اپنے آپ کو جلاتے اور فنا کرتے رہتے ہیں +

(۲۶۱) اے شعلہ تیرے لرزنے سے شمع کی ناتوانی صاف ظاہر ہوتی ہے (یعنی شمع جب خوب جل کے بجھنے کو ہوتی ہے۔ تو اس کی لو اتنی کمزور پڑ جاتی ہے کہ ایک ذرا سی ہوا تنزلزل پیدا کر دیتی ہے یعنی اس کے شعلے کا لرزنا ہے) پس یہ اس کی ناتوانی لیٹا ہر اس لئے ہے کہ اس کو پرواز کا غم ہے کہ وہ بجھ گئی تو غریب پروانہ کہاں جلے گا +

(۲۶۲) بجلوہ ریزیٔ باد۔ یہاں بہ قسم کا فائدہ دیتا ہے مراد ہوا کی جلوہ ریزی یا اس کے چلنے کی قسم اور بہ پرفشانیٔ شمع۔ شمع کے پرفشاں ہونے یا اس کے لرزنے کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ کہ تیرا ایک خیال بھی میرے دل میں آجائے تو میری روح اہتزاز کرنے (جنبش کھانے یا وجد کرنے) لگتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح ہوا کے ایک جھونکے سے شمع لرز جاتی ہے۔ اور اس میں حالت سکون نہیں رہتی تو اس کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ کہ تیرے خیال سے میری روح بھی وجد کرنے لگتی ہے :

(۲۶۳) غمِ عشق سے سینے میں جو داغ پڑا ہے۔ اس کی گشاط (خوشی) کی بہار کا کچھ حال نہ پوچھ۔ کہ شگفتگی (فصل بہار میں شگوفوں کا پھوٹنا) یا بہار اس گلِ خزانی پہ قربان ہوتی ہے کہ جو گلِ شمع کی خزاں یا آخر وقت میں اس سے نمودار ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ شمع جل کے جو گل اس میں پیدا ہوتا

ہے۔ عاشق کا داغِ غم اس پر سبقت رکھتا ہے +

(۲۶۴) شمع بجھ کر یار کے سرہانے یا اس کے قریب دیکھ کے (حسد سے) جلتی ہے۔ لہٰذا میرے دل پر شمع کی اس بدگمانی یا ایک بڑے غبار کا داغ کیوں نہ ہو وہ بدگمانی یا بڑا خیال جو شمع کو جلاتا ہے یہ ہے کہ میں دوست کے قریب ہوں اور یہ بھی ایک گونہ تقریب وصال ہے +

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش ۲۶۵ مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے ۲۶۶ اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

(۲۶۵) ذوق کا ایک شعر ہے ؎

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

یعنی کمال پر افسوس ہے کہ اس نے ہم کو اس قدر آشفتہ حال کر دیا ہے +
اسی طرح غالب کہتا ہے ؎

مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

یعنی اے اختیار یا ضبطِ عشق تجھ پر افسوس ہے کہ ہم تیری بدولت اب ہم اسقدر مجبور ہو گئے ہیں۔ کہ ہم رقیب یا دشمن کا کھٹکا جو ہر وقت ہمارا سوہانِ روح بنا رہتا تھا۔ اب اس کو بھی مطلق ہم پر اثر نہیں ہوتا (وداعِ ہوش سے یہاں مراد بیہوش ہونا نہیں بلکہ کہتا ہے کہ کسی خاص بیم یا خوف سے جو ہر شخص کو متاثر کر سکتا ہے۔ ہم اس سے بھی اب حواس باختہ نہیں ہوتے اور ہمارے ہوش سلامت رہتے ہیں) شاعر اس جگہ ضبطِ عشق کی انتہائی حالت کو گویا اڑا رہا ہے۔ کہ اس میں رقیبوں کا ڈر بھی جاتا رہتا ہے۔ کہ جو ایک عاشق کے لئے لازم امر ہے۔ تاکہ وہ ان سے دھوکا نہ کھائے +

دوسرے معنی :- یہ کہ ہم یہ معنی - عرب وداعِ ہوش نہ کرنا اس کا مطلب یہاں ضبطِ ہوش کئے بیٹھے رہنا ہے - اختیار یہ ضبط یا ضبط ہوش وحواس ۔

اے ضبطِ ہوش (یا اختیار) تجھ پر افسوس ہے کہ اب ہم یہاں تک مجبور ہو گئے کہ رقیب دوست کے پاس بیٹھا ہے ۔ اور ہم یہ حالت دیکھ کر بھی تحمل ضبط کئے بیٹھے ہیں۔ ہما اس رنجیدہ بات سے بھی حواس باختہ نہیں ہو جاتے اور ہمارا یہ ضبطِ نفس احمقانہ ہے۔ کہ رقیب کا رعب ہم پر چھا گیا ہے۔ حالانکہ عاشقِ صادق کو کیا رقیب کا کیا ڈر۔ وہ اپنے جذبۂ عشق کے سامنے اغیار کی ہستی کو خیال ہی میں نہیں لایا کرتا اور وہ اپنے دوست کے پاس کسی غیر شخص کو دیکھ کے وداعِ ہوش کیا کرتا ہے اور دیوانہ وار اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے ۔

تیسرے معنی :- یہ کہ ہم ضبطِ ہوش اس لئے کئے ہوئے ہیں۔ یعنی دوست کو دیکھ کر گھبراتے یا وداعِ ہوش نہیں کرتے کہ دشمن طعن سے کہے گا کہ بس اسی ضبطِ نفس پر دعویٰ عاشقی کیا تھا ۔

(۴۶۶) عشاق اپنے جلدی قتل کئے جانے یا فنا ہونے کی ہمیشہ تمنا کیا کرتے ہیں۔ تاکہ مصائبِ عشق سے فوراً خلاصی ہو۔ اسی لئے کہتا ہے ۔ اے نفس یا آہ تیرہ بار تیری اس ناتمامی یا ادھورا کام کرنے پر ہمارا دل سخت جلتا ہے۔ کہ ہم تیرے ہاتھوں کباب رہے یا فوراً ہی کیوں نہ جل گئے۔ (اور آہ کی ناتمامی سے مراد یہ کہ بہت دور کی آہ نہ کھینچ سکی۔ بوجہ عاشق کی کمزوری یا خوف وغیرہ کے) ۔

غزل

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک	۴۶۷	کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل	۴۶۸	ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک
مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو	۴۶۹	نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج	۴۷۰	گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ	۴۷۱	یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے	۴۷۲	دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد	۴۷۳	زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

۴۷۴ یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

(۴۶۷) چونکہ عشاق اپنے درد و غم کو اچھا سمجھا کرتے ہیں۔ مصنف کہتا ہے کہ وہ بے پرواہ لڑکے جو مجھ کو دیوانہ سمجھ کر پتھر مارا کرتے ہیں (تاکہ مجھ کو تکلیف پہنچے) انہیں کیا خبر کہ اگر وہ میرے زخموں پر نمک چھڑک دیتے تو اس سے بھی مجھ کو ان کے پتھروں سے کچھ زیادہ ایذا پہنچتی (مگر چونکہ ایسا نہیں ہوا) آہ کیا مزا ہوتا (یعنی میری خوش قسمتی ہوتی) اگر ان لڑکوں کے پھینکے ہوئے پتھروں میں نمک بھی ہوتا (اور وہ میرے زخموں پر یوں چھڑک دیا جاتا تو مجھے ایذا ہوتی)۔ زخم پر نمک چھڑک دیں تو سخت تکلیف ہوا کرتی ہے ۔ تاہم اس سے زخم اچھا بھی ہو جایا کرتا ہے ۔ تو اس شعر کا مفہوم یہ ہوگا ۔ کہ کاش لڑکے نمک میرے زخموں پر چھڑک دیتے تو اس سے درد بھی ہوتا ۔ اور میں اچھا بھی ہو جاتا ۔ گویا میرے دونوں مقصد پورے ہو جاتے ۔

(۴۶۸) ذوقؔ ایک جگہ کہتا ہے ؎

زخمِ دل پر کیوں مرے مرہم کا استعمال ہے
سلک گر مہنگا ہے تو کیا لون کا بھی کال ہے

غالبؔ کہتا ہے ۔ چونکہ میرے زخمِ دل کو دوست کے کوچے کی گرد

(خاک) سامانِ ناز ہے۔ یعنی وہ فخر کرتا ہے۔ کہ اس سے وہ جلدی اچھا ہو جائیگا (اسی لئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے)، ورنہ اگر اس کا ایسا خیال نہ ہوتا۔ تو زخم بھرنے کے لئے دنیا میں بکثرت نمک پیدا ہوتا ہے یہی بکھر پڑا جاتا ہ

(۴۶۹) مجھ کو نالۂ بلبل کا درد ارزانی رہے۔ یعنی میں بلبل کی طرح رووں اور اس سے مجھے درد نالہ بکثرت لاحق ہو۔ اور تو پھول کی طرح ہنسے اور تجھ کو خندۂ گل کا نمک مبارک ہو (یہاں نمک سے مراد لطف ولذت ہے) گویا ایک پھول کی ہنسی یا اس کا کھلنا جو لطف ولذت پہنچاتا ہے۔ وہ میرے درد کے مقابل تجھ کو نصیب ہو۔ نمک خندہ سے بھی لطف ولذت خندہ مراد ہوتی ہے ؛

(۴۷۰) شورِ جولاں گھوڑا دوڑانے کا شور۔ بزخم موجۂ دریا۔ یعنی موجِ دریا ساحل سے ٹکرائی تو اس میں گویا گھاؤ پیدا ہو گیا ؛

آج سمندر کے کنارے پہ کس شہسوار کے گھوڑے سے شورِ جولاں پیدا ہوا تھا (چونکہ شور کے معنی نمک بھی ہے۔ اسی کی رعایت سے کہتا ہے) کہ اس شورِ جولاں کی طرف سمندر کی لہر شوق سے لپکی اور ساحل سمندر سے ٹکرائی اور اس میں گھاؤ پڑ گیا۔ اب اس گھاؤ میں ساحل بحر کی مٹی بطور نمک کے کام دے رہی ہے ؛ یہاں دریا سے مراد بحر یا سمندر ہے۔ حاصلِ شعر یہ کہ اس شہسوار کے ناز سے بحر بھی مستفید ہوا ؛

(۴۷۱) زخم جگر کی داد دیتا ہے۔ مراد یہ کہ میں اپنے زخم جگر کے درد میں سخت مبتلا ہوں۔ لیکن صبر کر کے یہ تکلیفیں اٹھا رہا ہوں۔ تو وہ میرے زخم جگر کی داد یوں دیتا ہے۔ یعنی اس طرح میری حوصلہ افزائی کرتا ہے ؛

محض طعن سے کہتا ہے۔ کہ واہ واہ وہ میرے زخم جگر کی اچھی داد دے رہا ہے کہ (بجائے مرہم پٹی کرنے کے اور الٹا) جہاں کہیں وہ نمک دیکھتا ہے۔ تو مجھے یاد کیا کرتا ہے (کہ اگر میں اس کے پاس ہوں۔ تو وہ فوراً میرے زخموں پر نمک پاشی کرے تاکہ مجھے سخت زور کا درد ہو۔ واہ یہ اچھی داد ہے) ؛

(۴۷۲) عاشق کے تن بدن کو زخمی کر کے تیزا یہ چل دینا جیف ہے۔ یعنی تجھ پہ افسوس ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کیونکہ (ابھی تو نے صرف میرے تن کو یعنی ظاہری جسم کو زخمی کیا ہے۔ حالانکہ میرا دل بھی زخم کی طلب کرتا ہے۔ یعنی تو میرے سینے کو چیر کر دل پہ بھی چرکا لگا دے اور اس طرح جو تن بدن زخمی کیا ہے۔ وہ اعضا بھی چاہتے ہیں۔ کہ تو اپنے ہاتھ سے ان پر نمک پاشی کرے واسطے تجھ کو یہ سب کام کر کے مجھ سے رخصت ہونا چاہئے) ؛

(۴۷۳) توفیر درد۔ درد کا وافر ہونا۔ یہاں مراد بیشتر سے کچھ زیادہ درد ہونا۔ میں اپنے درد کی زیادتی کے لئے کسی غیر شخص کا احسان مند نہیں ہونا چاہتا کہ وہ کچھ اور نمک دے کے میرے زخم دل پہ چھڑک دے۔ تو اس سے میرا درد دونا ہو جائے۔ بلکہ پہلے ہی سے میرے زخم میں (میرے ستانے کو) اتنا نمک چھڑکا گیا ہے کہ زخم سرتاپا نمک ہی نمک بن گیا ہے۔ جس طرح قاتل کا خندہ اس قدر زیادہ ہے۔ کہ اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتا گویا میرے زخم میں نمک کی بہتات اور قاتل میں مجھے قتل کر کے ہنسنے کی کثرت دونوں یکساں اور متماثل ہیں ؛

(۴۷۴) عورتوں کا ایک مسئلہ ہے۔ کہ نمک کا انتہا ادب کرنا چاہئے کہ کسی کے ہاتھ سے اگر یہ زمین پر گر جائے تو اس کو سزا کے طور پر اسے

اپنی پلکوں سے اٹھانا چاہیے۔ اسی تلمیح پر شعر ہذا کی بنیاد ہے۔
اے غالب تجھ کو وہ دن یاد ہیں۔ کہ وجد ذوق میں مجھے زخموں پر نمک پاشی کرنے کا اتنا شوق تھا کہ اگر کبھی زخم سے نمک زمین پر گر پڑتا تھا۔ تو میں (غالب) اس کو اپنی پلکوں کے ذریعہ زمین سے اٹھا لیا کرتا تھا۔ اور پھر اس کو اپنے زخم پر چھڑک دیتا تھا (حاصلِ شعر یہ کہ اب وہ حالت نہیں رہی ہے۔ کیونکہ وہ وجد نمک پاشی جلتا رہا ہے) مراد اب زخم دل اچھا ہو گیا ہے

غزل

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک ۴۷۵ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ۴۷۶ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب ۴۷۷ دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ۴۷۸ خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ۴۷۹ میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل ۴۸۰ گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج ۴۸۱
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(۴۷۵) فارسی میں ایک محاورہ ہے "سرِ زلف شدن" جس کا لفظی ترجمہ ہے۔ "زلف کے سر ہونا" اور اس فارسی محاورے کا عام مفہوم استغنا یا لاپرواہی ہے۔ چونکہ محاوروں کے معنی کسی دلیل یا حجت کے تابع نہیں ہوا کرتے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس محاورے کے یہ معنی کیوں لئے گئے۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہے۔ کہ اس کا مطلب استغنا یا کسی امر

میں لاپرواہی کرنا ہے۔ چونکہ اول تو کسی غیر زبان کے محاورے کا اپنی زبان میں ترجمہ ہی نہیں کرنا چاہیے۔ کہ اکثر اس سے مضمون عبارت کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوم اگر ترجمہ کیا بھی جائے۔ تو ایسا ہونا چاہیے۔ کہ قریب الفہم ہو۔ لیکن چونکہ غالب نے اپنے کلام میں فارسی جملات و محاورات کے لفظی ترجمے بکثرت کئے ہیں۔ اور اس کی چنداں پرواہ نہیں کی کہ وہ اردو والوں کی سمجھ میں بھی آئیں گے یا نہیں۔ اس شعر کو آزاد و حالی تک ہرگز نہ سمجھ سکے۔ کہ اس کا مطلب کیا ہے [1]
اب یہ اس جگہ حل کیا جاتا ہے۔

کہتا ہے تیرا عاشق اگرچہ چاہتا ہے۔ کہ اس کی آہ فریاد تجھ پر کچھ اثر کرے لیکن (بوجہ تیری حد درجے کی لاپرواہی اور استغنا کے) اس اثر میں اس کو ایک عمر چاہیے۔ یعنی ایک عرصۂ دراز درکار ہوگا۔ لہذا تیرے اس زلف کے سر ہونے تک یعنی عرصۂ استغنا تک کون جیتا رہے گا۔ مراد یہ کہ تیرا عاشق اس قدر طول طویل مدت تک جی ہی نہیں سکتا۔ کہ جتنا تو اس کو (بوجہ استغنا کے) انتظار دلانا چاہتا ہے۔ صاف طور پر اس شعر کا مفہوم فقط یہ ہے۔ کہ ہماری آہ کو مؤثر ہونے کیلئے ایک عمر یعنی بہت عرصہ درکار ہے۔ اور یہ اس لئے کہ حسب معمول ہر معشوق عاشق سے استغنا برتتا ہے۔ اور بہ حیثیت معشوق ہونے کے نیز، تم ہم سے استغنا برتتے ہو۔ جو صاف ظاہر ہے۔ کہ بہت ہی زیادہ عرصے تک رہنے والا استغنا ہے تو تمہارے اس سر زلف ہونے یعنی استغنا سے کام لینے تک بھلا کون جیتا رہیگا۔ (یعنی کوئی [2] اس قدر طویل عرصے تک زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ کہ پہلے تو اپنے استغنا کو ترک کرے اور پھر تو اس کی طرف متوجہ ہو۔

([1] بحوالہ مکتوبات آزاد صفحہ ۲۲۸)

(۴۷۶) دامِ ہر موج میں. ہر ایک لہر جو دریا میں اٹھتے اس میں + حلقۂ صد کامِ نہنگ بسینکڑوں مگرمچھوں کے گلوں کے حلقے + دیکھیں کیا گذرے ہے. یعنی اس پر کیا کیا واقعات گذرتے ہیں +

قطرۂ آب جو پہلے ابر سے بذریعہ بارش زمین پر گرتا ہے. تو اس میں بیسیوں واقعات اس پہ گزر جاتے ہیں. پھر دریا میں یا جھیل یا کسی ندی میں مارا مارا پھرا کرتا ہے. پھر کبھی سمندر میں بہہ کے مگرمچھوں کے حلق میں چلا جاتا ہے. پھر سمندر ہی میں مگرمچھ کو حلق سے نکلکر بذریعہ بخار ابر بن جاتا ہے. اور قطرۂ باراں بن کے سیپ میں داخل ہوتا ہے. تو وہاں ایک گوہر بن جاتا ہے. لہٰذا شاعر کہتا ہے. کہ قطرۂ آب کے لئے سمندر میں کی ہر ایک لہر کے جال میں صدہا نہنگوں کے منہ کھلے ہوتے ہیں. کیا جانے گوہر بننے تک اس پر کیا کیا واقعات گزریں. مراد یہ کہ کمال حاصل کرنے کے لئے ہزارہا تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں +

(۴۷۷) عاشقی صبر طلب ہے. یعنی اس میں جتہ مارنے کی ضرورت ہے. مگر دل میں تمنا بیتاب ہو رہی ہے. اور ہم چاہتے ہیں. کہ یہ بھی جلد تر پوری ہو تو خونِ جگر ہونے تک یعنی عاشقی میں جتہ مارنے تک اس دل کا یعنی دلی تمنا کا کیا رنگ کریں یعنی اس کے بر لانے کی کیا تدبیر کریں ظاہر ہے. کہ ایک عاشق ایسی کشمکش میں بے بس ہوتا ہے. اور اس سے کچھ بھی نہیں بن پڑتا +

(۴۷۸) ہم نے مانا کہ جب تمکو ہمارے حال کی خبر ہوگی تو تم زیادہ غفلت نہیں کرو گے. اور ہماری جلد خبر لو گے. لیکن تم اس قدر غفلت شعار یا مستغنی المزاج ہو. کہ تمہارے خبر ہونے تک خود ہم ہی خاک ہو جائیں گے. یعنی مر جائیں گے +

(۴۷۹) پرتوِ خور. سورج کا عکس مراد دھوپ + فنا کی تعلیم. فنا کا علم پہنچانا. مراد نیست و نابود کر کے معدومی کا تجربہ کرانا +

دھوپ سے شبنم کو فنا کی تعلیم پہنچتی ہے. یعنی ایک ذرا دھوپ لگتی ہے. تو شبنم فوراً معدوم ہو جاتی ہے. اسی طرح (وہ معشوق خورشید رو ایک آفتاب ہے. اور میں مثل شبنم کے لہٰذا) اس کی ایک نظرِ عنایت کے ہونے تک میں بھی یہاں قائم ہوں. یعنی جب تک وہ مجھے ایک عنایت کی نظر سے (یا خوب آنکھیں گڑو کے) نہ دیکھ لے میں زندہ ہوں + اور جب اس نے ذرا دیکھ لیا تو میں شبنم کی طرح فوراً اُچھل جاؤنگی +

(۴۸۰) یک نظر بیش نہیں. یعنی محض ایک نگاہ کے وقفے تک یا بہت ہی کم مدت + فرصتِ ہستی. زندگی کے قیام کا عرصہ + گرمیِ بزم. محفل کی رونق + رقصِ شرر. شرارے کی چمک + جو بہت ہی قلیل مدت تک رہتی ہے +

اے غافل. زندگی کے قیام کی مدت. ایک نگاہ کے وقفے سے کچھ زیادہ نہیں ہے. گویا اس محفل کی رونق صرف ایک شرارے کے چمکنے تک ہے. یعنی جتنی قلیل مدت ایک شرارہ چمکتا ہے +

(۴۸۱) اے اسد. غمِ ہستی کا علاج یعنی زندگی کبھی ہاتھ سے جائے اور ہمیشہ قائم رہے اس غم کا علاج بجز موت کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا. کیونکہ (زندگی بھی ایک شمع ہے اور) شمع ہر رنگ میں صبح ہونے تک یا اس کے بجھنے کے وقت تک ضرور جلتی رہتی ہے. لہٰذا ہماری یہ شمع حیات تادمِ مرگ غمِ ہستی سے ضرور جلا کرے گی +

یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ | ۴۸۲ | اگر مجکو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ

۴۸۳ آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(۴۸۲) اجابت ۔ دعا کا قبول ہونا ۔ دل بے مدعا ۔ وہ دل جس میں کوئی آرزو نہ ہو ✤

اگر تجھ کو یقین ہے ۔ کہ تیری دعا قبول ہو جائے گی تو آئندہ کوئی دعا نہ مانگا کر ۔ مراد یہ کہ ——————— "ایک ایسا دل جس میں کبھی کوئی آرزو ہی نہ ہو آ کر ۔ وہ خدا سے مانگ لے" تو نہ تیری کوئی آرزو دل میں ہو گی نہ تجھ کو آئندہ دعا مانگنی پڑے گی ✤

(۴۸۳) اے خدا تو مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ ۔ کیونکہ جب تو ایسا کرتا ہے ۔ تو مجھ کو اپنے دل کی حسرت کے داغوں کا وہ شمار یاد آتا ہے ۔ کہ کتنے ہی ارمان تھے ۔ جو دل ہی دل میں رہ گئے اور وہ پورے نہ ہو سکے ✤ مراد یہ کہ میں تو ابھی اور بھی گناہ کرنا چاہتا تھا جواب یاد آ گئے تو افسوس ہوتا ہے ✤

غزل

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل	۴۸۴	بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف	۴۸۵	ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا	۴۸۶	اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو	۴۸۷	رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار	۴۸۸	میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے	۴۸۹	مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی	۴۹۰	خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک	۴۹۱	بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
غالبؔ مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو	۴۹۲	جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

(۴۸۴) بلبل پھول کے ساتھ وفا برتنے میں اپنی جان کیسی ہلاک کرتی ہے ۔ مگر اس کے کاروبار وفا پر جب کوئی پھول کھلتا ہے ۔ یعنی خنداں ہوتا ہے تو وہ گویا ہنس دیتا ہے ۔ جیسے دیوانے آدمی پر عام لوگ ہنسا کرتے ہیں ✤

(۴۸۵) ہوائے گل چونکہ نسیم پھولوں کی خوشبو کو لیکر باغ میں پھیلاتی ہے ۔ اس لئے یہ ہوائے گل ہے ✤

اب ہوائے گل یا نسیم کے جال کی زنجیریاں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں یعنی نسیم اب کسی قید و بند میں نہیں رہی ۔ لہذا وہ ہر طرف اڑتی پھرتی ہے تمکو آزادی اس کی مبارک ہو ۔ یعنی اس کا لطف باعث خوشنودیٔ مزاج ہو ✤

(۴۸۶) موجِ رنگ ۔ یہاں مراد پھولوں کا موسم بہار میں لہلہا کر اپنی عیش و عشرت کا چند روزہ اظہار کرنا ✤ دھوکے میں مر گیا ۔ یعنی پھول اپنی عیش و بہار ہی پر مفتون رہا ۔ اور یہ نہ سوچا کہ آخر خزاں آئے گی یا گلچین اس کو توڑے گا ✤

باغ میں جو پھول تھا وہ اپنے موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا یعنی انجام سے بے خبر رہا ۔ مگر جب وہ اپنی بہار ہی میں اپنے لال لال رنگ میں مست تھا ۔ اس کو پودے سے توڑ لیا گیا ۔ یعنی اس کا خون کیا گیا ۔ تو اس کی حالت پر افسوس ہے ۔ یعنی اے وائے نالۂ لب خونیں نوائے گل مراد پھول کے خونیں نوا (نوا کا مطلب ساز و سامان خونی نوا ۔ خونی ساز و سامان یعنی خون کے ایسے سرخ) لب (لبِ گل، یا پنکھڑیوں) پر افسوس ہے ✤

(۴۸۷) اس حریف (رقیب یا دوست) بدمست کا حال کیسا خوش ہوتا ہے کہ جس کا سر اس گل (معشوق) کے پاؤں تلے ہو۔ جیسے کہ پھول کا سایہ پھول کے پاؤں کے نیچے ہوا کرتا ہے۔ گویا معشوق کی قربت پھول کی قربت ہے۔

(۴۸۸) بہار نسیم گل کو تیرے لئے ایجاد کرتی ہے۔ کہ تو اس سے خوشبو سونگھے مگر چونکہ وہ ایک تیرے جیسے پھول سے ٹکرا کے خوشبو لاتی ہے۔ وہ میری رقیب بن گئی ہے۔ نفس عطر سائے گل۔ مراد نسیم بہار۔

(۴۸۹) میرے مینا (شراب کے شیشے) میں شراب نہیں اور دل میں ہوائے گل یعنی باغ میں جا کر پھولوں سے لطف اٹھانے کی خواہش نہیں ہے (جو کہ موسم بہار تقاضا کرتی ہے) لہٰذا میں ان دونوں چیزوں کی طرف سے محروم ہو کر فصل بہار سے شرمندہ رہتا ہوں یعنی اس کا مزا حاصل نہیں کر سکتا۔

(۴۹۰) حسن غیور۔ غیرت وار حسن یعنی جو نہیں چاہتا کہ اس کی کوئی برابری کرے۔ سطوت۔ رعب۔

تیرے غیرت وار حسن کے جلوے کے رعب کے باعث میری نگاہ میں پھولوں کی کسی ادا کا رنگ یعنی اس کی کسی طرح کی کوئی ادا (مثلاً پھول کا کھلنا۔ خوشی اولی کے ساتھ لہلہانا وغیرہ) میری نگاہ میں خون ہے۔ یعنی اس کے دیکھنے سے بوجہ غیرت میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔

(۴۹۱) گل در قفائے گل۔ ایک پھول کے پیچھے دوسرا یکے بعد دیگرے۔ پھولوں کا دستور ہے۔ کہ جب ایک کھلتا ہے۔ تو دوسرا بھی اس کے بعد کھلتا ہے۔ پھر تیسرا چوتھا وغیرہ۔
مطلب یقیناً تیرے ہی جلوے سے (جبکہ تو باغ میں کبھی جلوہ آرا ہوا تھا) آج تک پھول دھوکا کھا کے (کہ تو ہی آ گیا) باغ میں یکے بعد

دیگرے کھلا کرتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسی شوق سے ایک کے پیچھے دوسرا بے اختیار دوڑ رہا ہے۔

(۴۹۲) خیال۔ یہاں مراد یاد۔ گل جیب قبائے گل۔ گل۔ سامان آرائش زیبائش۔ جیب قبائے گل۔ جیبوں کی قبا وہ سطح گل جو پنکھڑیوں کے اوپر ہوا کرتی ہے۔ گویا پھول کا چوغہ تو گل جیب قبا سے مراد پھول کے چوغے کی جیب کی زیبائش۔
غالب میں اس سے بغل گیری کی آرزو رکھتا ہوں کہ جس کی یاد پھول کے چوغے کی زیبائش ہے۔ یعنی پھول بھی اس کی یاد اپنی زینت و زیبائش خیال کرتا ہے۔
حاصل شعر۔ یہاں دوست کے حسن اور اس کی محبوبیت کا کنایتہً بیان کیا ہے۔ اور اپنی آرزو کا اظہار۔

غزل

۴۹۳ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
۴۹۴ محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال — ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بتخانہ ہم
۴۹۵ باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں — ہیں چراغان شبستان دل پروانہ ہم
۴۹۶ ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترک جستجو — ہیں وبال تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم
۴۹۷ دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

(۴۹۳) برق سے روشن کرنا۔ بجلی کی ایک لہر چمک کر روشنی پہنچانا۔

آزاد طبع لوگوں کو ایک دم بھر سے زیادہ عرصہ کوئی غم نہیں ہوتا ہم
کہ آزاد ہیں۔ گویا بجلی سے (جو فقط ایک لحظہ کوند کر بس ہو جاتی ہے) اپنے
ماتم خانے کی شمع کو جلاتے ہیں + مراد یہ کہ تاریک گھر میں بجلی کوند کر
صرف ایک لمحہ روشنی پہنچاتی ہے۔ زیادہ دیر تک نہیں۔ اسی طرح
ہم آزادوں کی مدت غم فقط ایک لمحہ ہوتی ہے +

(۴۹۴) گنجفہ یہ تاش کے پتوں کی طرح اوراق یعنی پتوں سے کھیلا جاتا
ہے + ورق گردانی۔ پتوں کا الٹ پلٹ کرنا۔ یہاں مراد پتے بازی +
گنجفہ باز خیال۔ یہاں خیال کو پتے باز فرض کیا ہے + نیرنگ یک بت
خانہ۔ بت خانہ یعنی اس دنیا کی نیرنگی و انقلاب + ہمارے خیال کا
پتے باز اس لئے محفلوں کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ کہ ہم نیرنگی و انقلاب
دنیا کے ایک بڑے پتے باز ہیں + یعنی ہوشیار اور تجربہ کار +

(۴۹۵) باوجود اس کے کہ ہم بھی ایک علیحدہ دنیا رکھتے ہیں۔ مگر ہنگامہ
پیدائی نہیں یعنی شور و ہنگامہ پیدا نہیں کیا کرتے۔ گویا ہم پروانے کے دل
کے شبستان کی چراغاں ہیں۔ مطلب یہ کہ جیسے پروانہ اپنا کام خاموشی
سے کرتا ہے۔ ہم بھی اس دوست کے تصور میں چپ چاپ زندگی بسر کیا
کرتے ہیں +

(۴۹۶) ہمارا یہ کوشش کا ترک کرنا۔ ضعف ہمت کے باعث
ہے۔ لہٰذا ہم ہمت مردانہ کے تکیہ گاہ کے لئے وبال (ثابت ہوئے)
ہیں۔ یعنی ہمت مردانہ پہ بھروسہ کریں تو اسی کو زوال آجاتا ہے۔ پس
ہماری یہ کم ہمتی قناعت سے نہیں ہے۔ بلکہ طبیعت ہی سست
واقع ہوئی ہے +

(۴۹۷) اے اسد ہمارا پُر خون سینہ (جس میں غم کے سبب
زخم ہو گئے اور ان سے خون سینے میں بھر گیا ہے) اب ایسا ہے۔

کہ ہم اس کو ایک قید خانہ جانتے ہیں۔ جس میں ہماری لاکھوں
تمنائیں عمر بھر کیلئے قیدی ہیں +

۴۹۸ بنالہ حاصل دلبستگی فراہم کر
متاع خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

۴۹۹	مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور	رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
۵۰۰	وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا	رکھ لیجو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

(۴۹۸) زنجیر کی کڑیاں اندر سے خالی ہوتی ہیں۔ اس لئے
متاع خانۂ زنجیر جز صدا معلوم۔ یعنی سب کو معلوم ہے۔ کہ جو
زنجیر کے گھر کا مال و متاع ہوا کرتا ہے۔ یعنی کچھ بھی نہیں۔ مگر زنجیر کو
ہلائیں تو اس سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنے
آپ کو نصیحت کرتا ہے۔ کہ تو بھی زنجیر کی طرح تہیدست ہے۔ لہٰذا
نالہ یا رونے دھونے کا شور برپا کرکے اسی سے اپنی دلبستگی (
دل کے خوش کرنے کا ساز و سامان) جمع کر + مطلب یہ کہ تہیدستوں
کے نصیبوں میں مال و متاع کہاں۔ کہ اس سے دل خوش کریں۔ وہ
اپنے رونے کے شور سے اپنا دل بہلایا کریں +

(۴۹۹) میں غریب و بیکس تھا مجھے پردیس میں خدا نے مارا گویا
میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ یعنی اگر وطن میں مرتا اور اس لئے کہ میرا
کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ کوئی میرے جنازے پر نہ آتا۔ تو اس میں میری
عزت ہی کیا ہوتی۔ مگر مسافرت میں تو کوئی جانتا بھی نہیں۔ کہ کون مرا
پہیلیوں میرا پردہ ڈھکا رہا

(۵۰۰) اس کی زلف کے کنڈل کے بال میری گھات میں ہیں

(میں دعوے کیا کرتا ہوں کہ کسی پر عاشق نہیں ہوا کرتا) اے خدا میرے اس دعویٔ آزادگی کی شرم رکھ لینا۔ یعنی مجھ کو اس کی زلف کا اسیر نہ بنانا +

لوں دام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے	۵۰۱	غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

(۵۰۱) میں اپنے سوئے ہوئے نصیب سے ایک خوابِ خوش قرض تو لے لوں مگر غالب یہ ڈر ہے۔ کہ اس قرض کو پھر ادا کیسے کروں گا (کیونکہ نیند تو ایک رات کیلئے بھی نہیں آتی) +

غزل

وہ فراق اور وہ وصال کہاں	۵۰۲	وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے	۵۰۳	ذوقِ نظارۂ وصال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا	۵۰۴	شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے	۵۰۵	اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا	۵۰۶	دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق	۵۰۷	واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں	۵۰۸	میں کہاں اور یہ وبال کہاں

۵۰۹ مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

(۵۰۲) وہ فراق اور وصال اب نہیں رہے نہ وہ شب و روز و ماہ و سال + شاعر یعنی جوانی کا عالم اور فراق و وصال کی یاد کر کے یہ غزل لکھتا ہے +

(۵۰۳) کاروبارِ شوق۔ عشق کے کاروبار + ذوقِ نظارۂ جمال۔ دوست کے حسن دیکھنے کا شوق۔ مطلب ظاہر ہے +

(۵۰۴) دل تو دل اب وہ دماغ بھی نہ رہا۔ یعنی بڑھاپے میں دل وہ نہیں ہوتا۔ جو کہ جوانی میں۔ مگر دماغ تو اکثر یکساں رہتا ہے۔ لیکن یہ بھی اب وہ نہیں رہا۔ کیونکہ دوست کے خط و خال کے سبب جو دیوانگی تھی۔ اس کا شور و فتنہ بوجہ ضعفِ دماغ کے ہم سے نہیں ہو سکتا +

(۵۰۵) یہ ایک شخص (مراد معشوقِ رعنا) کے تصور (خیال یا عشق) کے باعث ہمارے خیال میں رعنائی یعنی خوبصورتی تھی گویا حسنِ تخیل جوانی میں اسی دوست کے باعث تھا +

(۵۰۶) اب لہو رونا (جیسے کہ جوانی میں تھا پیری میں) آسان نہیں رہا کیونکہ دل میں رونے کی طاقت اور جگر میں وہ حالت قائم نہیں رہی جو جب کہ جگر میں خون۔ لہو رونے کیلئے بافراط تھا +

(۵۰۷) عشق کو قمار خانہ اس لئے یہاں فرض کیا ہے۔ کہ جس طرح قمار خانے میں روپیہ ہار دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی دل اور جگر کی طاقتیں سب کھونی پڑتی ہیں۔ لہذا کہتا ہے ہم سے یہ قمار خانۂ عشق اب اس لئے چھوٹا کہ وہاں اگر جاویں تو گرہ میں مال نہیں ہے۔ یعنی وہاں حسن و عشق کرنے کے لئے دل۔ جگر۔ دماغ وغیرہ کی سب طاقتیں چاہئیں۔ جو بیش قیمت ہیں۔ جیسا کہ نقد اور ایسا مال ہمارے پاس نہیں رہا ہے۔

(۵۰۸) دنیا کے فکروں میں مبتلا ہوں۔ پس میں کہاں اور اس پیری میں) حسن و عشق کا وبال کہاں۔ میں تو اس لائق نہیں رہا +

(۵۰۹) اب تو بدن کی طاقتیں مضمحل (کمزور) ہو گئیں اور عناصر میں آتش و آب و باد و خاک جن سے انسان بنا ہے۔ ان میں اعتدال

ہی نہیں رہا۔ کبھی آگ زیادہ یعنی حرارت جسم۔ کبھی آب و باد۔ مثلاً نزلہ وغیرہ ۔

غزل

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں	۵۱۰	ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے	۵۱۱	کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو	۵۱۲	جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے	۵۱۳	اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود	۵۱۴	قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے	۵۱۵	خار راہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا	۵۱۶	آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھئے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ	۵۱۷	اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

۵۱۸ وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں ۔

(۵۱۰) دوست نے ہم سے وفا کی تو غیر اس کو (اپنے حق میں) جفا کہتے ہیں۔ اچھا ان کو ایسا کہنے دیجئے دستور چلا آیا ہے کہ اچھوں ہی کو لوگ برا کہا کرتے ہیں ۔

(۵۱۱) آج ہم اپنے دل کا پریشان حال ان سے کہنے تو جاتے ہیں۔ پر دیکھئے وہ ہم سے کیا کہیں گے ۔ یعنی کیسا سلوک کریں گے ۔

(۵۱۲) یہ لوگ اگلے وقتوں کے ہیں۔ یعنی سیدھے سادے ہیں جو مے نوشی یا ناچ رنگ ہوتا دیکھتے ہیں۔ تو سمجھتے ہیں۔ کہ یہ غم غلط

کرنے کا ساز و سامان ہے۔ مگر وہ لوگ تہ کو نہیں پہنچے ان سے لڑنا نہیں چاہئے۔ کیونکہ مے و نغمہ اندوہ ربا نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا انجام آخر کو غم و رنج اور دنیا بھر کی رسوائی ہے ۔

(۵۱۳) میری غشی کی حالت میں تو نالہ مجھ سے دور ہوتا ہے۔ (کیونکہ بیہوشی میں انسان سے کوئی آواز نہیں نکل سکتی) مگر جب غشی نہیں ہوتی۔ تو فراغت و فرصت میں میرا نالہ میرے دل میں آجاتا ہے۔ تو یہی تو نالہ کی رسائی ہے۔ ورنہ اور کونسا نالہ رسا ہوگا (یہ محض طنز سے کہتا ہے۔ حالانکہ نالۂ رسا وہ جو عاشق کے دل سے نکل فریاد باہر نکلے۔ اور دوست تک یا آسمان پر پہنچ جائے)

(۵۱۴) قبلہ۔ قبلۂ اول تو خدا کو کہتے ہیں۔ قبلۂ ثانی خانہ کعبہ کو کہ جس کو عوام اسلام خدا کا گھر خیال کرتے ہیں۔ مگر دراصل وہ اینٹوں اور پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ یہ خدا کا گھر کیسے ہوا۔ ہاں وہاں جا کر توحید کی تاریخ نظر سے پھر جاتی ہے۔ کہ کس طرح ابراہیم علیہ السلام نے وہاں خدا کو سجدہ کرنے کی تعلیم اول اول دی تھی تو وہ قبلۂ اول کی طرف ہدایت کرنے والا مقام یعنی محض قبلہ نما ہے ۔ یہی مضمون اس شعر کا ہے ۔ کہتا ہے۔ اپنا مسجود (یعنی جس کو ہم سجدہ کرتے ہیں وہ ہمارا قبلہ) تو سرحد ادراک سے بھی پرے ہے۔ یعنی وہاں تک ہمارے محسوسات بھی نہیں پہنچ سکتے (مراد خدا۔ جو ہمارے حواس سے باہر ہے) لہذا اہل نظر (جن کی نظر حقیقت کی طرف ہے) قبلہ یعنی خانہ کعبہ کو صرف قبلہ نما خیال کیا کرتے ہیں۔ جو کہ اللہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔

(۵۱۵) افگار۔ زخمی ۔ مہر گیا۔ یعنی مہر گیاہ یا گیاہ مہر۔ زخم کو مندمل کرنے والی ایک بوٹی ہے۔ کہ جو کسی آدمی کے پاس ہو تو

حسب کا اثر رکھتی ہے۔ یعنی ایسی بولی والے پر سب مہربانی کرتے ہیں۔ جب سے مجھے تیرے زخمی پاؤں پر رحم آیا ہے۔ تو جس راہ سے گذر کر ہم تیرے پاس گئے تھے۔ اور رستے میں جس کانٹے سے ہمارا پاؤں زخمی ہوا تھا۔ اس کانٹے کو ہم مہرگیا کہتے ہیں (کیونکہ یہی ہم کو چبھا تو ہم پر تو نے رحم کیا)۔

(۵۱۶) وہ ایک شررِ عشق جو دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا کیونکہ اگرچہ ہم اس (شرر) کا مفہوم بظاہر آگ سمجھتے ہیں۔ لیکن کہنے سننے میں اس کو ہوا (ہوائے عشق) یا دوست کی چاہت کہتے ہیں۔ تو وہ حقیقت میں کوئی آگ نہیں ہے۔ کہ جس سے جل جانے کا خوف ہو۔ تو اس سے ہم گھبرائیں گے کیا۔

(۵۱۷) قاعدہ ہے کہ جتنی کسی کی خاطر خوشامد کی جائے اس کا غرور دُونا ہوتا ہے۔ کہتا ہے۔ دیکھئے اس شوخ کی نخوت (غرور) کیا رنگ لائے۔ یعنی کیا نتائج پیدا کرے۔ ہم اس کی ہر بات پہ "نام خدا" یا "بسم اللہ" (خوشامد کے طور پہ) کہتے رہتے ہیں۔

(۵۱۸) وحشت۔ غلام علی خاں وحشت۔ اور شیفتہ۔ نواب مصطفیٰ خاں متخلص بہ شیفتہ غالب کے ہمعصر اور دوست تھے۔ آشفتہ نوا جس کے کلام میں سوز و گداز ہو۔

غالب۔ آشفتہ نوا سا مر گیا ہے اب شاید وحشت اور شیفتہ (یہ دو شاعر) اس کا مرثیہ لکھیں گے (مگر تعجب ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی یہ کام نہ کر سکا اور خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے غالب کا ایک بہترین مرثیہ لکھا)۔ علاوہ ازیں قربان علی بیگ سالک اور میر مہدی مجروح نے بھی غالب کے اچھے مرثیے لکھے۔

غزل

۵۱۹ — ہو گئی کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں / ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

۵۲۰ — ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں / رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

۵۲۱ — ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب / ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

۵۲۲ — کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے / پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

۵۲۳ — رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے / انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

۵۲۴ — زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن / غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

۵۲۵ — بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے / جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

۵۲۶ — قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا / خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

۵۲۷ — لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری / موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

۵۲۸ — ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود / قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

۵۲۹ — تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر / بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

(۵۱۹) گریباں بہ دامن رفتن۔ ایک فارسی محاورہ ہے۔ جس کا مطلب گریبان کا چاک ہونا ہے۔ لہٰذا اگر گریبان بہ دامن نہ رفتہ یا گریبان بہ دامن نہ بودن (گریبان کا دامن میں نہ ہونا چاہئے) کا ترجمہ کر کے اُردو میں غالب نے یہاں استعمال کیا ہے (مراد گریبان کا چاک نہ ہونا)۔ چونکہ گریبان وہ خالی جگہ ہوتی ہے۔ کہ جس میں سے گردن نکلی رہتی ہے۔ لہٰذا اگر یہ چاک نہ ہو تو ظاہر ہے۔ کہ گریبان کی ایسی موجودگی پیراہن کو بیکار کر دے گی گویا اس کے لئے باعثِ ننگ ہو جائیگی۔

مطلب یہ کہ کسی کرتے میں گریبان کا اپنے دامن میں نہ ہونا یعنی اس کی صورت جیسے کرتے کو بیکار کرکے اس کی شرمندگی کا باعث ہوتی ہے۔ ایسے ہی جو پھول باغ میں نہ ہو تو اس کی یہ بے سدھی اس پھول کے لئے بےعزتی کا باعث بن جاتی ہے۔ یعنی کرتے کی عزت گریبان بہ دامن ہونے کے ساتھ اور پھول کی گل در باغ ہونے سے وابستہ ہے +

(۵۲۰) میں اس قدر لہو رو تا رہا ہوں کہ اب ضعف ہو کر میرے تن میں کچھ بھی (خون) باقی نہیں رہا ہے۔ بلکہ جو تھوڑا بہت خون دامن سے لگا ہوا تھا وہ بھی شل رنگ کے وہاں سے اڑ گیا ہے +

(۵۲۱) اگر گھر کی کھڑکی بند ہو اور اس میں سے دھوپ کی کرنیں چھن کر نکلیں تو اس میں سے ذرّے ذرّے اڑتے ہوئے دکھائی دیا کرتے ہیں + کہتا ہے یہ ذرّے اس کی کھڑکی میں جمع نہیں ہو گئے ہیں۔ بلکہ آفتاب کی نظر کے اجزا (جب نہ اس کی طرف دیکھنے کو تانک جھانک لگا رہا تھا) شوقِ دیدار کی غرض سے جمع ہو گئے ہیں +

(۵۲۲) میں اپنے قیدخانۂ غم کی تاریکی کا حال بیان کیا کروں اندھیرے ہے یعنی یہ تاریکی مجھ پر ظلم ہے۔ کہ اس زندانِ غم کی کھڑکی میں کچھ روئی کہیں ٹھونس دیں تو اس اندھیرے کے تناسب سے وہ سفید روئی بھی صبح کے اجالے سے کم علامت ثابت نہیں ہوگی +

(۵۲۳) عشق جس کا خاصہ تباہ کرنا ہے۔ اور چونکہ برقِ خرمن بھی کھلیان کو برباد کیا کرتی ہے۔ تو گویا اس لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں +

زندگی کی رونق اس تباہ کن عشق سے ہے۔ اور چونکہ یہ عشق برقِ خرمن سے مشابہ ہے۔ تو گویا یہ برقِ خرمن اگر نہ ہو تو انجمن بے شمع ہو جائے یعنی یہ انجمنِ دنیا جس میں ہم بستے ہیں بے شمع یا اندھیری

ہو جائے +

(۵۲۴) میں نے زخم کے ٹانکے سلوائے تو بیر طعن کرتا ہے۔ کہ میں زخم کا علاج کرا رہا ہوں۔ تاکہ آئندہ تکلیف جاتی رہے حالانکہ ٹانکے سلوانے سے بھی تو جراح کی سوئی سے تکلیف پہنچا کرتی ہے۔ تو یہ کوئی مزے کی بات نہیں۔ جیسے کہ غیر نے سمجھ رکھا ہے +

(۵۲۵) چونکہ ہم نازنین معشوق کے کشتۂ حسن ہیں۔ ہماری قبر میں کوئی مٹی نہیں ہے (بلکہ اس بہارِ ناز کے تصور کے باعث) پھول کا جلوہ ہی جلوہ بھرا پڑا ہے +

(۵۲۶) میرے خون کا ایک ایک قطرہ ایک ایک نئے ناسور کا ہیولیٰ یعنی موادِ حقیقی ہے۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ میرا خون بھی مجھے ذوقِ درد پہنچانے کے لئے میرے جسم میں فارغ یا بے کار نہیں ہے +

(۵۲۷) قلزم آشامی۔ یہاں مراد بکثرت شراب پینے کی عادت لفظِ رگ کے فارسی میں مختلف معنی ہیں۔ یہاں مراد عرق ہے +

ساقی کے عزور نے میری کثرتِ شراب نوشی کی عادت کا خاتمہ کر دیا کہ کوئی موجِ مے کی رگ یا عرقِ شراب میرے شیشے کی گردن میں نہیں ہے۔ یعنی شراب اس میں سے دکھائی نہیں دیتی۔ رگ بمعنی عزور بھی ہے۔ لیکن مصنف نے بہ تقلیدِ شعرائے فارس رگ مے سے عرقِ شراب مراد رکھی ہے۔ اور رگ اور گردن کا تناسب دکھایا ہے +

(۵۲۸) فشار۔ نچوڑ کر کسی چیز کو نکال ڈالنا + مجھ کو ضعف نے نچوڑ کر ناتوانی نکال دی۔ تو اب ناتوانی کا اثر کہاں باقی رہا۔ لہٰذا ناتوانی

یا کمزوری جس سے انسان کا قد جھک جایا کرتا ہے۔ وہ اب میرے قد کو جھکا نہیں سکتی۔ اور مجھے اپنے جسم کو شکاوت کے وقت جھکانے سے جو ذرا آرام ملتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں مل سکتا ؛

(۵۲۹) اے غالب وطن میں میری کیا شان و عظمت تھی۔ کہ عالم مسافرت میں کچھ قدر ہوتی۔ میں بے شک گھاس کا وہ حقیر تنکا ہوں جو کہ بھٹی میں نہیں ہے۔ اور اگر بھٹی میں ہوں تو جلا دیا جاتا ہوں۔ اور اگر باہر ہوں تو پاؤں تلے روندتے ہیں ؛

غزل

۵۳۰ عہدے سے مدح ناز کے باہر نہ آ سکا | گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

۵۳۱ حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل | ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں

۵۳۲ میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش | تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

۵۳۳ ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

(۵۳۰) عہدہ سے باہر نہ آنا۔ جیسا کہ چاہئے ویسا کوئی کام نہ ہو سکنا ؛ ناز سے یہاں مراد دلفریبی کے سامان ؛

میں اس کی دلفریبی کے ساز و سامان کی حسب منشا تعریف نہ کر سکا۔ اگر ایک ہی ادا ہوتی (مثلاً اس کے دیکھنے کی ادا، چلنے کی ادا وغیرہ) تو اس کی تعریف میں اس کو میں اپنی قضا کہہ دیتا۔ مراد اس کی صدہا ادائیں ہیں۔ جو میری قضا کا باعث ہیں۔ تو میں کس کس پہ مروں اور کس کی تعریف کروں ؛

(۵۳۱) چشمہائے کشادہ۔ خوب کھلی ہوئی آنکھیں جو کسی چیز پر پھاڑ پھاڑ کر ڈالی جاتی ہیں۔ کہ موقع ملے تو وہ چیز گم کر دی جائے۔ تیری زلفوں کے حلقے (کنڈل) وہ کھلی ہوئی آنکھیں ہیں۔ جو میرے دل کی طرف اس کو چھیننے کیلئے لگی ہوئی ہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ میں اس زلف کے ہر بال کو نگاہ سرمہ آلود کہوں جو کہ ان کنڈلوں (حلقہ ہائے زلف) کی آنکھوں سے نکل کر میرے دل پہ پڑ رہی ہیں۔ کہ اس کو چھین لیں ؛

(۵۳۲) میں اور ہزاروں دل و جگر خراش آہ و زاریاں اور تو اور ایک وہی ناسننا کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا ؛

(۵۳۳) میرا گمان یعنی شک یا وہم مجھے بتاتا ہے۔ کہ تو بیوفا ہے۔ مگر اے ظالم مجھ کو اس میرے وہم سے منفعل نہ چاہ یعنی شرمندہ نہ ہونے دے۔ (وفا کر اور) "ہے ہے" خدا ایسا نہ کرے کہ میں (تیری بیوفائیاں دیکھ کر تجھے ایک دن) بیوفا کہوں ؛

غزل

۵۳۴ مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

۵۳۵ ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

۵۳۶ زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

(۵۳۴) تم مجھے جس وقت کہ چاہو۔ مہربان ہو کے (بلا تکلف) بلا لیا کرو۔ میں کوئی گیا ہوا وقت نہیں ہوں جو ہاتھ سے چلا جاتا ہے۔ تو پھر (ہاتھ) آ ہی نہیں سکتا۔

(۵۳۵) میں حالت ضعف (غشی) میں ہوں۔ رقیبوں نے طعن کی (مثلاً یہ کہ محض مکر کرکے میں بیہوش پڑ گیا ہوں) تو آپ اس کا شکوہ کرتے یا بڑائیوں سناتے ہیں۔ میں رقیبوں کی یہ بات اٹھا رہا ہوں (اور صبر کر رہا ہوں) کیونکہ یہ بات کوئی میرا اثر تو نہیں ہے۔ کہ میں جس کو یہ حالت ضعف اور یہ نہ اٹھا سکوں۔ گویا سر اٹھانا اور بات سہنا ایک ہی چیز ہیں

(۵۳۶) قسم کے اردو میں کئی معنی ہیں۔ یہاں انکار۔ جیسے گائے ہندوؤں کی قسم ہے۔ خنزیر مسلمانوں کی۔ اسی طرح اگر کسی سے اقرار لیا جائے کہ تم فلاں شخص سے نہ ملا کرو تو وہ کہے گا کہ اچھا اس کا ملنا مجھ پہ قسم ہوا۔

دوست سے کہتا ہے۔ کہ زہر گو تیرے ملنے کی قسم تو نہیں ہے کہ جس کو کسی صورت سے بھی میں کھا نہیں سکتا۔ اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ زہر ملتا ہی نہیں ہے۔ ورنہ اے ظالم میں اپنی جان سے اس قدر تنگ ہوں کہ اسے ضرور کھا لوں۔

غزل

۵۳۷ ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

۵۳۸ عزۂ اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو

اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

۵۳۹ قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

۵۴۰ نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

۵۴۱ دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

(۵۳۷) وقت مے پرستی۔ یعنی شراب پیتے وقت ایک دن تم بھی شرم کو بالائے طاق رکھ کے شریک مے نوشی ہو جاؤ۔ ورنہ تمہارے انکار پر کسی دن ہم تم کو قصداً چھیڑیں گے اور اگر تم شکوہ کرو گے تو کہہ دیں گے کہ ہم شراب کے نشے میں تھے۔

(۵۳۸) عزہ۔ کسی چیز کے پاس ہونے پر مغرور کرنا۔ عالم امکاں۔ عالم ہستی۔ یہاں مراد حیات انسانی کا وجود۔

حیات انسانی کی بنیاد کی بلندی پر (یعنی اپنے آپ کو اشرف مخلوقات تصور کرکے) مغرور نہ ہو۔ کیونکہ اس بلندی کے نصیبوں میں ایک دن پستی لکھی ہے۔ مراد یہ کہ اس کی وہ بنیاد ڈھل جائے گی۔ اور وہ بلندی پستی ہو جائے گی۔ یعنی آخر اس کو فنا نصیب ہوگی۔

(۵۳۹) ہم شراب قرض لے کے پیتے تھے۔ تاہم دل میں سمجھتے تھے کہ ہماری یہ فاقہ مستی یعنی باوجود تہیدستی کے عیش اڑانا ایک دن ضرور رنگ لائے گا یا ہمارا استحکام دکھائے گی۔ سو اس نے دکھایا۔

کہتے ہیں غدر کے بعد جب مرزا غالب کی پنشن بند ہوگئی تو وہ کسی

دوکاندار سے روپیہ ادھار لے کے شراب پیا کرتے تھے۔ جب قرض نہ ادا ہو سکا تو ان پر دعویٰ دائر کیا گیا۔ مفتی صدرالدین خاں کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ اپنے اقرارِ جرم اور عذرِ تقصیر کے طور پر جاتے ہی یہ شعر پڑھا تو مفتی صاحب ہنس دیئے اور خود روپیہ ادا کر کے مرزا کو بری کر دیا۔

(۵۴۰) نغمہ ہائے غم، یعنی غم کی حالت میں درد کے ساتھ چیخنا چلانا۔

اے دل غم کی حالت میں یہ جو ہم چیختے چلاتے ہیں۔ تو یہ بھی غنیمت ہے کیونکہ یہ زندگی کا ساز (باجہ) ایک دن بالکل بے صدا یعنی چپ ہو جائے گا۔ اور اس سے نغمۂ غم بھی نہیں نکل سکے گا مطلب یہ کہ زندگی ہونا چاہیے خواہ وہ غموں ہی میں بسر ہو۔

(۵۴۱) اے غالب اس سراپا نازنین معشوق کا شیوہ (دستور) دھول دھپا یعنی کسی سے دھینگا مشتی کرنا نہیں ہے (اور یہ بات اس طرح ہمیں معلوم ہوئی کہ) ہم ایک دن پیش دستی (پہل کر کے) اس کو ایک دھول جما بیٹھے تھے۔

غزل

۵۴۲ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

۵۴۳ کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

۵۴۴ ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

۵۴۵ بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

۵۴۶ ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

۵۴۷ جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

۵۴۸ ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

۵۴۹ خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

۵۵۰ نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

۵۵۱ کہتے ہو کیا لکھا ہے تیری سرنوشت میں
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

۵۵۲ پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ میرا ہم زباں نہیں

۵۵۳ جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

(۵۴۲) ہم ان کی جفا سے تنگ آ گئے ان سے وفا کرنا ترک کردیں۔ یہ ان کو گمان یا خیال نہیں ہے۔ کہ جس کی وجہ سے وہ (ہم پر) زیادہ ظلم کر کے گویا) ہماری وفا کا امتحان کر رہے ہیں۔ بلکہ ان کو اب ایک چھیڑ سوجھی ہے۔ سو تفنن کے طور پر وہ وفا آزما ظلم کر رہے ہیں یعنی وہ ظلم کہ جس کی ہم برداشت کر سکتے ہیں مگر یہ مشکل بات ہوجاتی ہے۔ پھر بھی چھیڑ کے طور پر ہمارا امتحان کرتا ہے *

(۵۴۳) دوست کی اس پرسش حال کا جو وہ ہماری طرف اپنا ہاتھ ہلا کے بغیر بات چیت کئے (یعنی پاس سخن درمیان نہیں) عمل میں لا رہا ہے۔ کس منہ سے شکریہ ادا کریں۔ یہ تو گویا اس کا ہم پر ایک لطف خاص ہے۔

کسی وقت دو شخص جو دور دور جاتے ہوں۔ ان میں سے ایک اپنا ہاتھ ہلا کر دوسرے کی پرسش حال کر لیا کرتا ہے یہاں کسی ایسی ہی تقریب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۵۴۴) دوست کا ظلم تو ہم کو عزیز ہے۔ اور ہم اس ظالم کو عزیز تو اس وجہ سے اگر وہ ہم پر مہربان نہیں ہے۔ یعنی ظلم کرتا ہے تو کرنے دو (یہ ظلم تو ہم کو بھی عزیز ہے) اس لئے وہ نامہربان اگر ہے بھی تو گویا مہربان ہی ہے (عشاق جب ظلم کو پسند کرتے ہیں تو جو شخص ان پر ظلم کرے گویا مہربانی کرتا ہے) *

(۵۴۵) معشوقوں کی نسبت کہا جاتا ہے۔ کہ وہ دہن (منہ) رکھتے ہیں نہ کمر یہاں مبالغہ کر کے کہنا ہے۔ کہ اگر تم دہن نہیں رکھتے اور اسی لئے بوسہ بھی نہیں دے سکتے تو نہ دیجئے آخر زبان تو رکھتے ہو۔ اسی سے اپنے عاشق کو کوئی گالی ہی دے دیجئے (کہ وہ اتنے ہی میں خوش ہو

جائے گا *

(۵۴۶) قطعہ *

(۵۴۷) یہ دو شعر قطعہ بند ہیں *

پشت گرمی سے مراد سہارا۔ ل٘ن مزید یہ معنی اور زیادتی ہو سچ زمزمہ الاماں نہیں۔ یعنی پناہ مانگنے کے لئے کوئی لفظ تک منہ سے نہیں نکالا *

ہرچند ان کا جان گداز قہر و عتاب ہم پر نازل ہو رہا ہے۔ اور اگرچہ ہماری تاب و تواں کو کسی چیز کا سہارا نہیں ہے۔ یعنی یہ زیادہ دیر ظلم سہنے کے ناقابل ہے *

لیکن پھر بھی ہمارے لب پر کسی سے پناہ مانگنے کا ایک لفظ تک نہیں آیا۔ اور ہماری جان مطرب اسی طرح زیادتی ظلم کا ترانہ گاتی ہے (جان کو مطرب اس لئے کہا کہ گویا یہی ایک گویا ہے۔ جو ہل من مزید کا گیت گا رہی ہے)

(۵۴۸) اگر دل جل جل کے آتشکدہ نہ بن جائے۔ تو وہ سینے کے لئے باعث شرم ہے۔ اسی طرح نفس یعنی سانس یہاں مراد آہ اگر آذر فشاں نہیں ہے یعنی وہ اس قدر گرم نہیں ہے۔ کہ آذر جو آتش پرست تھا۔ اس کی تپش برداشت کرنے کو نہیں سکتا تو ایسی آہ دل کے لئے موجب عار ہے *

(۵۴۹) اگر میرا دل (عشق کی بدولت) دو ٹکڑے نہیں ہوا تو خنجر سے میرے سینے کو چیر دے (اور پھر دل کے دو ٹکڑے کر دے) اسی طرح اگر میری مژگان (پلکیں) خون دل سے تر ہو کے خون نہیں ٹپکاتیں۔ تو میرے دل میں ایک چھری چبھو دے کہ خون پلکوں تک پہنچ جائے (مراد یہ کہ چھری اور خنجر خوب چلا) *

(۵۵۰) بلا سے گھر تباہ ہو۔ حالت جنون میں اس سے

کچھ نقصان نہیں ہوتا کیونکہ ہم وحشت میں بھر کے بیابان کی طرف نکل جائیں گے۔ تو (گھر کی) سولہ زمین کے بدلے گویا اتنا بڑا صحرا ہمیں رہنے کو مل جائے گا۔ تو یہ سودا کچھ مہنگا نہیں ہے۔

(۵۵۱) مجھ کو جو تم کہتے ہو۔ کہ تیری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ (یہ اس لئے ہے کہ) گویا تم نے میری پیشانی پر جو سجدہ بت کا نشان ہے اس کو نہیں دیکھا (اگر دیکھا ہوتا تو خود ہی جان لیتے کہ میری قسمت میں ایک بت کا عشق لکھا ہے۔ اور پھر ایسا سوال نہ کرتے) گویا جبیں پر الخ سے مراد تمہارے نزدیک میری پیشانی پر سجدۂ بت کا نشان نہیں کیونکہ تم نے اسے بغور دیکھا نہیں ہے۔

(۵۵۲) روح القدس۔ جبریل فرشتہ۔ جو کلام وحی لایا کرتا ہے۔ ہم زبان نہ ہونا آپس میں باتیں نہ کرنا۔ یعنی جبریل تو پیغمبروں کے ساتھ باتیں کیا کرتا تھا اور کلام وحی بالکل بے مثل ہوا کرتا ہے اور جبریل میرے ساتھ کچھ کلام نہیں کرتا۔ یعنی میں کوئی پیغمبر نہیں کہ جبریل مجھ سے ہم زبان [illegible] میرا کلام بھی گویا وحی ہی کی طرح کا ہے۔ جو کہ روح القدس سمجھ سکتا ہے اور اسی سے میں پھر اس کی داد پاتا ہوں۔ بھلا انسان اسکو کیا سمجھے گا۔ مراد یہ کہ میرا کلام بالکل بے مثل ہے۔

(۵۵۳) جان ایک بوسے کی قیمت ٹھہری ہے۔ مگر وہ ابھی سے کیوں اسے مانگے (اور اس کے عوض بوسہ دے) کیونکہ وہ جانتا ہے کہ غالب ابھی نیم جان بھی نہیں ہوا حالانکہ بوسہ تو جب جان کی قیمت میں ادا ہوگا جب کہ غالب پوری طرح جان دے دے گا۔

غزل

۵۵۴ مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

۵۵۵ شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

۵۵۶ حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

۵۵۷ رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

۵۵۸ سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

۵۵۹ جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

۵۶۰ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

---

(۵۵۴) چونکہ میرے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ہے کہ جسے کوئی پکڑے گا۔ اور میں چل پھر نہیں سکوں گا۔ بلکہ ایک چکر ہے (جس کو کوئی پکڑ ہی نہیں سکتا) لہذا کوئی تدبیر ایسی نہیں ہو سکتی کہ جو مجھ کو صحرا نوردی سے روک سکے۔ (فی الواقع ایک دیوانے

کو خواہ کتنا روکو حتیٰ کہ زنجیر بھی ڈال دو تو وہ اُٹھ اُٹھ کر دوڑے گا۔ وحشت سے باز نہیں آنے گا)۔

(۵۵۵) شوقِ عشق مجھ کو اس (خیالی) بیابان میں دوڑائے لیے جاتا ہے۔ کہ جہاں رستہ چلنے کی پگڈنڈی (جادہ) ایک تصویر کی آنکھ کی نظر کے سوا اور کچھ نہیں ہے (مگر تصویر کی نظر تو محض وہم ہوا کرتی ہے لہٰذا) مراد یہ کہ خیال کے گھوڑے سے دوڑا رہا ہوں یہ بھی معلوم نہیں کہ منزل کدھر ہے۔

(۵۵۶) چونکہ راہِ وفا کی پگڈنڈی تلوار کی دھار کے سوا اور کچھ نہیں ہے یعنی اس پر چلنے سے انسان فوراً کٹ جاتا ہے۔ لہٰذا افسوس ہے کہ ہم جو دوست کے ساتھ وفا کرنے کے ذوق کی لذت کے مشتاق ہیں۔ اس راہِ وفا پر چلیں تو کٹ کر مر جائیں گے۔ اور ہمارے دل سے حسرتِ لذتِ آزار نکلنے نہیں پائے گی۔

(۵۵۷) چونکہ میرا نالۂ دلکش تاثیر نہیں ہوا یعنی کسی تک پہنچ کے میری رسوائی کا سبب نہیں بنا۔ اور اس طرح کوئی میرا حال نہیں جانتا۔ اور نہ میرا کوئی غم خوار ہے۔ لہٰذا میں ہمیشہ کے لئے تو اپنے غم کے رنج ہونے سے ناامید ہو چکا ہوں۔ تو "اے رنجِ نومیدیٔ جاوید" تو ہمیشہ کے لیے یونہی میرے حسبِ مراد قائم رہیو۔

(۵۵۸) جب کبھی میرے سر کا زخم اچھا ہو جاتا ہے۔ تو پھر میرا سر کھجانے لگ جاتا ہے۔ (گویا پھر سر پہ پتھر کھانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے) لہٰذا یہ پتھروں کی چوٹ کی لذت اندازۂ تقریر یا بیان سے باہر ہے (مراد عاشق ایذا کو پسند کرتا ہے)۔

(۵۵۹) جب اس کا کرم (بخشش) ہمیں اور زیادہ گناہوں میں بے باک ہونے۔ اور رند ہونے کی اجازت دے۔ تو ظاہر ہے کہ گویا یہ امر خدا کی طبع کے بالکل موافق ہے۔ اس وقت گناہ کرنے سے شرم کرنا۔ ایک طرح کی غلطی ہے۔ وہ غلطی بھی ایسی کہ اس سے بڑی ہو ہی نہیں سکتی (مراد یہ کہ جتنا کوئی شخص زیادہ گنہگار ہو اتنا ہی خدا زیادہ اس پر اپنی بخشش کیا کرتا ہے)۔

(۵۶۰) غالبؔ ہمارا بھی یہ عقیدہ ہے۔ بقول ناسخ کہ جو شخص میر تقی میر کا ماننے والا نہیں ہے۔ وہ گویا آپ ہی ایک ایسی علمی دولت سے محروم ہے۔ ناسخ نے میر کے حق میں یہ شعر کہا تھا ؎

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غزل

۵۶۱ مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

۵۶۲ بہ شکالِ گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

۵۶۳ الفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

(۵۶۱) مردمک دیدہ یعنی میری آنکھ کی پتلی میں جو نگاہیں ہیں ان کو نگاہیں نہ سمجھو۔ بلکہ دلِ چشم (یعنی آنکھوں کے دل یا پتلیوں) میں سیاہ نشان مثل سویدا کے ہے۔ اس میں میری آہیں جمع ہو گئی ہیں۔ اور اب وہ نظروں کے وہاں سے نکل رہی ہیں۔

(۵۶۲) عاشق کی گریہ وزاری کی برسات بھی دیکھنے کے قابل ہے کیونکہ یہ اس قدر پُرزور ہے۔ کہ اس سے باغ کی دیوار پھول کے کھلنے کی طرح صد جگہوں میں سے پھٹ گئی ہے۔

(۵۶۳) جب اس گل یعنی معشوق کی محبت ہوئی تو پھر اس سے آزادی کا دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ سرو باوجودیکہ اس کی تعریف میں سب کہتے ہیں کہ آزاد ہے۔ مگر نہیں وہ بھی باغ کی محبت میں گرفتار ہے۔ کہ وہ اسے چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتا۔

غزل

عشق تاثیر سے نومید نہیں ۔ ۵۶۴ ۔ جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے ۔ ۵۶۵ ۔ جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود ۔ ۵۶۶ ۔ ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ۔ ۵۶۷ ۔ ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے ۔ ۵۶۸ ۔ غمِ محرومیِ جاوید نہیں

۵۶۹

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ

ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

(۵۶۴) عشق (کچھ نہ کچھ معشوق میں) تاثیر ضرور کرتا ہے۔ کیوں کہ جاں سپاری یعنی کسی پہ جان قربان کرنا کوئی بیدِ مجنوں نہیں ہے۔ کہ جس میں پھل ہی نہیں آتا۔

(۵۶۵) خاتم سے اس شعر میں مراد کسی سلسلے کو ختم کر دینے والا ہے جیسے کہ آنحضرت کی تعریف میں کہتے ہیں۔ وہ خاتم النبیین ہیں۔ حل — جمشید بادشاہ کے دور میں جو شراب خواری کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ وہ اسی پہ ختم نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ وہ جامِ مے یعنی جامِ جم اس کے بعد بھی اسی طرح چلتا رہا۔ جیسے کہ جمشید یا اور کسی بادشاہ کی سلطنت۔ دست بدست (یعنی یکے بعد دیگرے) چلتی رہی ہے گویا کہ سلطنت کے ساتھ مے خواری یا عیاشی کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رہا ہے۔ یعنی مے خواری ایک سلطنت ہے۔

(۵۶۶) جس طرح کوئی ذرہ اس دنیا کا خورشید کے عکس یا اس کے نور کے بغیر کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا ہے۔ اسی طرح تیری تجلی یعنی خدا کے نور کے بغیر جس سے مراد قدرت ہے۔ یہاں کسی چیز کی ہستی کا ساز و سامان ہی قیام پذیر نہیں ہوتا۔ گویا ہر کہیں اس خدا کی قدرت ہی کا یہاں ظہور ہے۔

(۵۶۷) رازِ معشوق سے مراد کسی معشوق کے ساتھ عشق ہونا۔ اور اس کو عوام سے پوشیدہ رکھنا تاکہ رسوائی نہ ہو۔ ہم عشق میں اسلئے نہیں مرتے کہ معشوق بدنام ہو جائیگا۔

(۵۶۸) ایامِ عیش میں گردشِ آنیکا ڈر ہے۔ کیونکہ خوشی کے بعد غم بُرا لگتا ہے۔ ورنہ ہمیشہ کی محرومی ہو۔ تو اس کا عادی ہو جانے سے انسان کو غم نہیں ہوتا۔

(۵۶۹) ایک مثل ہے زندگی بامید قائم اسی لئے لکھتا ہے۔ کہ سب کہتے ہیں۔ لوگ کسی نہ کسی امید کے آسرے پر جیتے ہیں۔ مگر ہم کو اب اپنے جینے کی بھی امید نہیں رہی۔ (کیونکہ ہماری حالت اس قدر خراب ہو چکی ہے) لہذا ہماری بے امیدی سب سے بڑھی ہوئی ہے ٭

غزل

۵۷۰ جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

۵۷۱ دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے — سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

۵۷۲ ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

۵۷۳ تماشا کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

۵۷۴ سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے — کہ شبرو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

۵۷۵ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

(۵۷۰) ارم۔ وہ بہشت ہے۔ جو شداد نے دنیا میں بنایا تھا۔ کہتا ہے۔ جہاں کہیں ہم تیرے نقشِ قدم (پاؤں کے نشان) دیکھتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہم شداد کے بہشت کی کیاریاں دیکھ رہے ہیں۔ یعنی ایسے خوبصورت نقشِ قدم ہیں ٭

(۵۷۱) اس کے دہن کے کسی کونے گوشے کے خال کے عاشق پریشان خاطر اپنے دل کے سویدا میں عدم کی سیر دیکھتے ہیں (چونکہ عشق

و محبت کے جذبات سویدا سے متعلق سمجھے جاتے ہیں۔ اور معشوق کا دہن معدوم ہوتا ہے۔ لہذا عاشق اپنے سویدا میں معشوق کے معدوم دہن کو دیکھتے ہیں ٭

(۵۷۲) قدِ آدم۔ آدمی کے قد کے برابر کوئی چیز۔ حل شعر۔ تیرے قد و قامت کے سرو سے قیامت کا فتنہ قریباً ایک آدمی کے قد کے برابر کم ہے۔ گویا تو فتنہ قیامت سے بھی زیادہ فتنہ انگیز ہے دوسرے معنی۔ بقول مولانا حالی۔ تیرا قد فتنۂ قیامت کے قد سے بنایا گیا ہے۔ اس لئے۔ وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔ یہ معنی ہم اس صورت میں قبول کر سکتے ہیں۔ کہ قیامت کے فتنے کو ایک مجسم چیز فرض کیا جائے مگر یہاں تو دو قدوں کا صرف مقابلہ کیا گیا ہے۔ پھر ایک سے دوسرا قد وضع ہی کیسے ہو گیا ٭

(۵۷۳) اے (محبوب) جو اپنے آئینے کو لئے ہوئے بناؤ سنگار میں مست بنتا ہے۔ ذرا ادھر تو دیکھ کہ ہم تجھے کس تمنا کے ساتھ یعنی کن آرزوؤں سے دیکھ رہے ہیں۔ مراد یہ کہ اپنی آرائش ہی میں مست نہ رہ۔ کچھ ہماری طرف بھی متوجہ ہو ٭۔

(۵۷۴) شبرو سے یہاں مراد نالۂ نیم شبی یا جیسے کہ مومن کا ایک مصرعہ ہے۔ "نالہ باندھے ہے کمر وقت سفر آخر شب" یعنی عشاق رات ہی کو رویا کرتے ہیں ٭ مطلب شعر۔ نالہ داغِ دل۔ یعنی دل کے غم سے جو ہم نے آہ کھینچی تھی۔ اس کی تف یا بخار کا سراغ ایسا ہے۔ جیسا کہ رات کو چلنے والے مسافر کا نقشِ قدم ہم صبح کو دیکھا کرتے ہیں ٭ مراد یہ کہ رات کو آہیں بھرتے رہے۔ اور صبح کو خیال کیا کہ رات ہم کس قدر روتے رہے ٭

(۵۷۶) اے غالب ہم (فقیر تو نہیں ہیں مگر) فقیروں کا بھیس بدل کر۔ ان لوگوں کا جو کہ اہلِ کرم بننے لگے ہیں۔ امتحان کرتے ہیں۔ کہ آیا یہ خلوصِ نیت سے فی سبیل اللہ دیتے ہیں۔ یا کسی ذاتی دنیوی غرض سے ♦

غزل

۵۷۷ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

۵۷۸ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

۵۷۹ تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

۵۸۰ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

۵۸۱ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

۵۸۲ جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

۵۸۳ میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

۵۸۴ میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

۵۸۵ تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

۵۸۶ لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

۵۸۷ وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

۵۸۸ وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

۵۸۹ غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں ؏

(۵۷۷) التہاب۔ آگ کا بھڑکنا۔ شعلے پیدا کرنا۔ آگ جو بھڑکتی اور خوب شعلے مارتی ہے۔ وہ دوست کی غضبیل مزاج سے ملتی جلتی ہے لہٰذا میں اس آتشی مزاج والے سے خوش ہوتا ہوں۔ اگر مجھ کو اس قسم کے عذاب سے راحت نہ ملتی ہو تو گویا کافر ہوں۔ مراد یہ کہ میں بہت ایذا دوست ہوں اور اپنے کافر ہونے کی علامت یہ سمجھتا ہوں۔ کہ آگ کو راحت نہ سمجھوں۔ حالانکہ مسلمان آگ ہی کو نشانِ جہنم قرار دیتے ہیں ♦

(۵۷۸) اگر میں اپنی عمر کے دنوں میں شبہائے ہجر کو بھی

شامل کر کے حساب کروں (حالانکہ غم کا زمانہ تو گویا نہ ہونے کے برابر سمجھا جاتا ہے) تو شب فرقت کی ایک ایک گھڑی ہزار ہا برس کے برابر گذر تی تھی۔ پس اس طرح میں کب سے اس جہانِ خراب میں ہوں۔ اس کے متعلق یہ کہنا پڑے گا۔ کہ میں اس مدت کا کچھ اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔

(۵۷۸) وہ مجھے خواب میں دکھائی دیئے۔ اور مجھ سے اپنے آنیکا وعدہ کر گئے۔ مگر یہ ان کا ایک فریب تھا۔ کیونکہ ان کو یہ مقصود ہی نہیں تھا۔ کہ وہ کبھی دیں۔ لہذا ان کا یہ وعدہ مجھے بے چین کر گیا۔ اور ابھی عمر بھر کریگا۔ انتظار میں نیند نہ آنے سے مراد یہاں سخت بے چینی کی حالت پیدا ہونا ہے) +

(۵۷۹) اپنے قاصد کے لوٹنے تک میں۔ ایک اور خط بھی لکھ رکھوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ کہ وہ میرے خط کے جواب میں بھلا کیا لکھیں گے۔ یعنی کچھ نہیں لکھیں گے + یا وہ ضرور میرے مطلب کو ٹال جائیں گے۔ تو ان کی یاد دہانی کو ایک اور خط بھی قاصد کے آنے تک تیار کر رکھوں +

(۵۸۰) ان کی محفل میں شراب کے پیالے کا دَور مجھ تک کب پہنچا کرتا تھا۔ (آج خلافِ معمول ساقی مجھے شراب دے رہا ہے۔ اس میں کچھ اس نے ملا نہ دیا ہو۔ مثلاً زہر وغیرہ؟

(۵۸۱) وہ شخص جو وفا کا منکر ہی ہو۔ یعنی کسی سے وفا کرنا چاہتا ہی نہیں ہے۔ اس پر کوئی فریب دے کر اپنے ساتھ وفا کیسے کرائے +

لہذا میں رقیب کے بارے میں اپنے اس دوست سے بدگمان

کیوں ہو۔ یعنی کس طرح یہ بدگمانی دل میں لاؤں۔ کہ وہ دوست میرے رقیب کے ساتھ تو وفا کرتا ہے۔ حالانکہ اوروں سے اس باب میں انکاری ہے +

(۵۸۲) میں تو وصل میں اس لئے ڈرتا ہوں۔ کہ کہیں رقیب نہ آجائے۔ (اور وہ مخل صحبت ہو) بھلا تم کو کس وہم یا بدگمانی نے حیران کر دیا ہے۔ (کیونکہ وہ رقیب اگر آ بھی جائے تو تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے) +

مولانا شوکت مرحوم مجددو میرٹھی نے اس شعر کے کچھ خلاف تہذیب معنی بھی لکھے ہیں۔ جو تصور کئے جا سکتے ہیں۔ لہذا یہاں نقل نہیں کئے گئے +

(۵۸۳) مجھے دوست کا خطِ وصل وصول ہوا یہ خدا کی دین ہے۔ یعنی خدا ساز بات ہے۔ چنانچہ ایک ایسی بڑی خوشی سے میں گھبرا گیا۔ ورنہ میں جان میں ایسے خوشی کے خط پر قربان کر دیتا + مراد یہ کہ شادی مرگ ہو کر مرنا بھول گیا کیونکہ بے خود سا ہو گیا تھا۔

(۵۸۴) وہ دوست نقاب کے اندر سے بھی مجھے دیکھ رہا ہے تو غصے کے ساتھ تیوری چڑھا کے۔ اور پھر غصہ بھی اتنا۔ کہ اس کے نقاب پر تیقے کے ایک طرف میں بوجہ تیوری کے شکن کی پڑی ہوئی (باہر بھی) دکھائی دے رہی ہے +

(۵۸۵) لگاؤ۔ مراد لگاوٹ یعنی دوست کا عشاق کے ساتھ بہ التفات پیش آنا + آنکھ چرانا۔ کچھ تعلق نہ رکھنا۔ لگاؤ کے خلاف کام کرنا + بناؤ۔ بناؤ سنگار + بگڑنا عتاب میں۔ غصے میں چہرہ یا منہ بگاڑ بگاڑ کر باتیں کرنا +

دوست کا ہم سے آنکھ چرانا ۔ دکہ جس سے ہمیں ثابت ہوتا ہے ۔
کہ وہ کچھ ہمیں اپنے خاطر میں نہیں لاتا ہے ۔ بقول مصنف ؎

(دوستی کا پردہ ہے بیگانگی)

یہ اس کے لاکھوں ظاہری التفات یا لگاوٹوں کے برابر ہے ۔ اسی
طرح اس کا غصے میں بھر کے ہم سے بگڑ جانا ۔ یعنی چہرے کا بگاڑ کے
دیکھنا ۔ ہمیں ایسا ہی پیارا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے کہ وہ لاکھوں بناؤ سنگھار
کر کے ہماری طرف دیکھے ۔

(۵۸۶) ہمارا وہ نالہ یا آہ جس سے آفتاب میں بھی شگاف یا دراڑ
سی پڑ جاتی ہے ۔ افسوس تیرے دل میں خس برابر یعنی مطلقاً اثر ہی نہیں کرتی
اسی طرح (دیکھو شعر ذیل)

(۵۸۷) وہ جادو ہماری مقصد برآری میں کام نہیں آیا ۔ کہ جس
جادو سے سراب میں دجلہ خشک ہوتا ہے ۔ اور اس میں پانی کا نام و
نشان تک نہیں ہوتا ۔ ایک کشتی رواں ہو جاتی ہے ۔ گویا خلاف امکان
کام کرنے سے بھی ہم وصال دوست حاصل نہیں کر سکے ۔

(۵۸۸) غالب مجھ سے شراب چھوٹ گئی ۔ لیکن اب بھی کبھی
کبھی پیتا ہوں جبکہ روز ابر ہو ۔ یعنی گھٹا چھائی ہو ۔ یا جب کہ چاندنی
رات ہو ۔

(۵۸۹) کل کے دو معنی ہیں ۔ کل کا دن ۔ دوسرے فردائے قیامت
یعنی روز محشر ۔ اہل شرع کا عقیدہ ہے ۔ کہ جو لوگ یہاں نیکی کرتے ہیں
کل ان کو بہشت کے روز حوض کوثر کی شراب طہور پلائی جائے گی ۔
تو گویا ساقی کوثر دنیا میں شراب پلانے سے معذور ہیں ۔ حل شعر ۔

اے ساقی ۔ تو کل کیلئے آج خست نہ کر یعنی جس قدر شراب تیرے
پاس ہے ۔ اس میں کنجوسی نہ کر اور آج ہی سب ہمیں پلا دے ۔ کیونکہ
یہ شراب کا کل پر ملتوی رکھنا تو ایک سوء ظن ہے ۔ یعنی برا سا خیال ہے
جو ساقی کوثر (یا بہشت میں شراب پلانے والے) کے متعلق ہے ۔ کہ
وہ بجائے یہاں کے وہاں شراب پلائے گا ۔ یعنی ہمارے گناہوں کو بخش کر

غزل

۵۸۹ کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوء ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں
(اس شعر کے معنی اوپر ملاحظہ ہوں)

۵۹۰ ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

۵۹۱ جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

۵۹۲ رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

۵۹۳ اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

۵۹۴ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

۵۹۵ ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

۵۹۶ شرمِ اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

۵۹۷ آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

۵۹۸ ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

۵۹۹ غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

---

(۵۸۹) گستاخیٔ فرشتہ۔ کہتے ہیں جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا گیا۔ تو فرشتوں کو حکم ہوا۔ کہ آدمؑ کے سامنے سجدہ کرو۔ اس نے ایک فرشتے نے انکار کر دیا۔ جو اب شیطان کے نام سے ذلیل و خوار ہے +

ہم آج دنیا میں کیوں اتنے ذلیل ہیں۔ کہ اس سے پہلے تو ہمارے حضور میں ایک فرشتے کی گستاخی یا عدول حکمی بھی تجھے پسند نہیں آئی تھی +

(۵۹۰) سماع۔ قوالی سننا + چنگ و رباب۔ سارنگی کی قسم کے باجے + قوالی سنتے وقت (صوفیوں کی) جان کیوں تن

سے نکلنے لگتی ہے یعنی وہ وجد و حال میں آکر کیوں اسقدر تڑپنے لگتے ہیں۔ جبکہ وہی صدا یا نغمہ چنگ و رباب میں سمایا ہوا ہے۔ اور ان کو کچھ نہیں ہوتا +

دوسرے معنی:- گانا سنتے وقت ہماری جان کیوں تن سے نکلنے لگتی ہے یعنی ہم کیوں اسقدر مضطرب ہو جاتے ہیں۔ جبکہ چنگ و رباب میں وہی گانا بھرا ہوتا ہے۔ تو وہ بحالتِ سکون پائے جاتے ہیں + مراد یہ کہ گانا۔ وجہ مسرت و اطمینان ہونا چاہیئے۔ نہ کہ ایک وجہ اضطراب +

(۵۹۱) رو میں ہے۔ یعنی چلا جا رہا ہے + رخش۔ گھوڑا + حلِ شعر۔ عمر کا گھوڑا برابر چلا جا رہا ہے۔ دیکھئے کہاں جا کر تھمے + کچھ ہمارا قابو اس پر بس نہیں چلتا۔ کیونکہ اس گھوڑے کی باگ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ نہ ہمارا پاؤں اس کی رکاب میں ہے۔ یعنی نہ تو اس کو از خود ہم چلا سکتے ہیں۔ نہ روک سکتے ہیں۔ (رخشِ عمر کا تھمنا مراد مر جانا) +

(۵۹۲) ایک حدیث ہے۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ یعنی جتنا کہ نفس سے محبت بڑھی۔ اتنا ہی انسان خدا سے دور ہے + وہمِ غیر۔ یہاں مراد کوئی بات جو خدا سے تعلق نہ رکھتی ہو۔ اس کی فکر کرنا +

حلِ شعر۔ میں جتنا ماسوائے اللہ یعنی غیر از خدا باتوں کی فکر کرتا ہوں۔ اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد یعنی دوری حاصل ہو جاتی ہے + چونکہ صوفیا۔ سب چیزوں کی اصل خدا کو بتاتے ہیں (گویا ہمہ اوست) اور ان سب چیزوں میں ہم بھی شامل ہیں۔ تو

ہم جس قدر خدا سے دور ہوتے ہیں۔ گویا اپنے ہی سے دور ہو جاتے ہیں ۔

(۵۹۳) شہود وہ حالت کہ کسی صوفی کو جب یہاں ہر شے میں حق ہی حق نظر آئے ۔ اور شاہد وہ کہ اس عالم شہود کا دیکھنے والا ہو ۔ اور مشہود وہ ہستی کہ جس کو دیکھا گیا ہو۔ یعنی جس کا مشاہدہ کیا گیا ہو ۔ کیونکہ ہمہ اوست کے اصول کے مطابق جب عالم شہود ہے یعنی خود قدرت خدا ہے ۔ اور مشہود یعنی خدا جس کا ظہور قدرت میں رکھا گیا ہے ۔ وہ بھی خدا ہے ۔ اور شاہد یعنی انسان وہ بھی شامل قدرت ہے ۔ تو پھر پوچھتا ہے ۔ کہ میں حیران ہوں یہ "مشاہدہ" کس حساب میں ہے ۔ یعنی "مشاہدہ" وہ شے ہونی چاہیے۔ کہ شاہد سے بالکل الگ ہو۔

جیسے زید بکر کو دیکھتا ہے ۔ تو زید بکر کو اس سے جدا ہو کے ہی دیکھ سکتا ہے ، اب جب کہ ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ شاہد یعنی صوفی ۔ خدا میں شامل ہے ۔ اور قدرت یا شہود بھی خدا ہے ۔ اور مشہود تو ظہور قدرت ہے یہ بھی خدا ہی ہے ۔ تو پھر خدا سے کون سی الگ ہوئی کہ جس کو گویا ہم علیحدہ کر کے دیکھیں ۔ اور اسے اپنا "مشاہدہ" قرار دیں ۔ دراصل ہمارا مشاہدہ بھی خدا ہی ہے اور اس سے الگ ہو کے ہم کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے ۔

(۵۹۴) صور ۔ جمع صورت ۔ صورتیں ۔ حل ۔ سمندر کا وجود کچھ صورتوں کی نمود پر مشتمل ہے ۔ یعنی کچھ صورتیں مثلاً پانی کے قطرے ۔ بلبلے ۔ اور لہریں وغیرہ مل کر سمندر کو بنا دیتی ہیں ۔ لہذا ۔ ان کے سوا ایک

سمندر میں کیا دھرا ہے ۔ گویا کثرت و وحدت یہاں آپس میں مجتمع ہیں ۔ اور سمندر ان کی مثال ہے ۔

(۵۹۶) شرم اک ادائے ناز ہے ۔ عورتیں لجا کے منہ پھیر لیتی ہیں ۔ یا حجاب کے طور پر آنچل سے منہ ڈھانکتی ہیں ۔ تو ان کی ایسی شرمیلی ادائیں بھی ادائے ناز خیال کی جاتی ہیں ۔ جو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں ۔

کہتا ہے کہ جب کہ حسینوں کا شرمانا یا حجاب میں ہونا بھی ایک طرح کا خاص معشوقانہ ناز ہے ۔ اور ہمارا وہ دوست بات بات پہ ایسے ناز کرتا ہے ۔ تو دیکھو کہ وہ کس قدر ناز و انداز میں غرق ہو رہا ہے ۔ مثلاً کسی نے عشقیہ قصہ پڑھا ۔ وہ جھینپ گئے ۔ اور منہ پر آنچل لے لیا ۔ کوئی نظر ڈال کے انہیں دیکھنے لگا ۔ تو وہ لجا کے منہ پھیرنے لگے وغیرہ وغیرہ ۔ یہ ادائیں حجاب کی ہیں ۔ اور چونکہ بکثرت ایسی باتیں انہیں پیش آتی ہیں ۔ اور وہ بوجہ عورت ہونے کے اپنے ہی سے ایسی شرمیلی ادائیں کرتے رہتے ہیں ۔ کوئی ان کا خاص طور پر محرک نہیں ہوتا تو اب چونکہ یہ ادائیں دوسرے الفاظ میں معشوقانہ ناز ہیں ۔ اور ناز کی کثرت بے حجابی یعنی بے حیائی میں داخل ہے ۔ تو صاف ظاہر ہے کہ

ہیں کتنے بے حجاب جو یوں ہی حجاب میں

(یہاں بے حجاب کے معنی بکثرت ناز بگھارنے کی بے حیائی اور یوں حجاب کا مطلب معشوق کا وہ فطری شرمیلا پن جو موجب ایسے ناز و بے حجابی کا ہے ، دوسرے معنی ۔ مولانا طباطبائی اس کی شرح یوں کرتے ہیں ۔

کہ دوست کا شرمانا اور سامنے نہ آنا ۔ یہ گویا غمزۂ معشوقانہ ہے ۔ ہم نے مانا کہ یہاں کوئی دوسرا موجود نہیں ہے ۔ اور ان کا اپنا غمزہ اپنے

ہی سالغہ ہے۔ لیکن جب غمزہ و ادا خود ایک طرح کی بے حجابی ہے۔
تو اس کا حجاب کرنا عین بے حجابی ہوا (یہ شعر تصوف میں داخل ہے اور یہاں
جو معشوق حجاب میں ہے۔ اس سے مراد خدا ہے۔ کہ باوجود اس قدر اخفا
کے ظاہر ہو رہا ہے)۔

تیسرے معنی۔ اگر اس شعر کو کتابت کی غلطی سمجھا جائے۔ اور مانا
جائے کہ یہ صورتِ ذیل میں ہے تو اس کا مفہوم بہت صاف ہو جاتا ہے
یعنی ؎

شرم اک ادائے ناز ہے اپنوں ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب جو یوں ہیں حجاب میں

قاعدہ ہے کہ عورتیں خویش و اقارب سے اتنا پردہ کرتی ہیں۔ کہ
بعض اوقات حدِ شرعی سے بہت بڑھ جایا کرتا ہے۔ مگر چونکہ عورتوں کا یہ
لجانا فطرتاً ایک ادائے ناز ہوتی ہے۔ (جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا
ہے) تو ان کی کثرتِ ناز دوسروں کے نزدیک اسی طرح حظِ نفس کو
تحریک دلاتی ہے۔ جیسا کہ بے حجابی۔ تو گویا ان کا یوں حجاب کرنا
بالفرض میلے پن کے ناز و انداز دکھانا بھی ایک طرح کی بے حجابی ہے خواہ
یہ اپنوں ہی سے کیوں نہ ہو۔ حالانکہ اپنوں کے ساتھ ان کو ایسا نہیں ہونا
چاہیئے۔

چوتھا مفہوم حسرت موہانی نے اس شعر کے یہ معنی لیے ہیں
کہ وہ جب لجا کے حجاب میں ہو گئے۔ تو وہ وہاں پردے میں رہ
کے گویا اپنے سے نہیں شرماتے۔ حالانکہ شرم اک ادائے ناز ہے
یعنی ایک معشوقانہ ادا۔ لیکن ؎

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے ہیں کہ نہ دیکھے کوئی ادا میری

(حسرت موہانی)

(۵۹۷) اپنے بناؤ سنگار سے ابھی فارغ نہیں ہوئے۔ ہمیشہ نقاب
میں بھی آئینہ ان کے سامنے رہتا ہے۔ (یہ ساری غزل تصوف میں
ہے۔ اس شعر سے یہ مراد ہے۔ کہ قدرت اپنے راز چھپائے ہوئے
ہے۔ اور وہ رازِ حسنِ قدرت کا جلا کرتا ہے)۔

(۵۹۸) مولانا حالی اس شعر کے معنی یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ سالک
کو تمام موجودات میں جب حق ہی حق نظر آتا ہے۔ تو اسے شہود کہتے
ہیں۔ اور غیب غیب یا غیب الغیب سے مراد رتبہ احدیتِ ذات
ہے۔ (مراد خدا کا اپنے آپ کو دوسروں سے غیب یا بالکل الگ
تھلگ کرنا) جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے ورا الورا (وابستہ پیوستہ)
ہے۔ [illegible] کہتا ہے۔ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ درحقیقت
غیب الغیب ہے۔ اور اس کو غلطی سے شہود (حاضر) سمجھتے ہیں۔
ہماری ایسی مثال ہے۔ جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں
پس اگرچہ وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ ابھی
خواب ہی میں ہے۔

(یادگارِ غالب)

(۵۹۹) ندیم۔ مصاحب۔ ندیم دوست۔ دو دوستوں کا [illegible]
نام صحبت یہاں دوست سے مراد خدا اور ندیم۔ حضرت [illegible]

غالب دوست کے مصاحب سے دوست کی بو آتی ہے۔ یعنی اس کی سی خوشبو پائی جاتی ہے۔ لہذا ابوتراب (حضرت علیؑ) کی بندگی یا اطاعت میں گویا میں خدا ہی میں مشغول یا اسی کی اطاعت کر رہا ہوں۔

غزل

۶۰۰ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

(۶۰۰) میں حیران ہوں۔ کہ میں کس کو پیٹوں اپنے دل کو یا جگر کو (دونوں کا رونا ہے اور میں اکیلا) اگر میں صاحب مقدرت ہوتا یعنی روپیہ پیسہ رکھتا۔ تو کسی رونے والے کو بھی جیالی پیشے کر رکھ لیتا ~~(جیسے محرم میں پیشہ ور گریہ کرنے والے مقرر کر لیے جاتے ہیں)~~۔

۶۰۱ چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

۶۰۲ جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

۶۰۳ ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

۶۰۴ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

۶۰۴ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

۶۰۵ خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

۶۰۶ پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

۶۰۸ اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

۶۰۸ غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

(۶۰۰ الف) رشک نے مجھے اس قابل نہ چھوڑا کہ تیرے گھر کا نام کسی سے لوں۔ پس ہر ایک سے (جان بوجھ کر) پوچھتا ہوں۔ کہ میں کدھر کو جاؤں۔ (تاکہ میں اگر تیرے گھر کا نام لیکر رستہ پوچھوں تو رشک آتا ہے۔ کہ کوئی شخص تیرے گھر کا پتہ نہ پا جائے)۔

(۶۰۱) اس شعر میں یہ عبارت بطورِ تمہید ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ عاشق اپنے معشوق کا گھر تلاش کر رہا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے کہیں اسے جاتے دیکھ لیا ہے۔ تو سراغ لگاتے لگاتے معلوم ہوا کہ وہ عاشق ہی کے رقیب کے گھر آتا جاتا ہے۔ اس لئے۔ فرمایا ہے۔ کہ مجھے ہزار بار رقیب کے گھر (دوست کی تلاش میں جانا پڑا) اے کاش

ہیں دوست کے گذرنے کے اس رستے کو جو رقیب کے گھر کی طرف جاتا ہے۔ نہ جاتا تاکہ وہاں جا کے رقیب کے ہاتھوں ذلیل نہ ہوتا)۔

(٢٠٣) کمر باندھنا۔ کسی کام پر مستعد ہونا۔ یہاں شاعر کی مراد معشوق کا عاشق کے قتل کے لئے کمر باندھنا۔ چونکہ کمرِ معشوق معدوم بتائی جاتی ہے۔ ظاہر کہ معشوق اس کو کس کر کیا باندھے گا۔

حل شعر۔ کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری کمر کیا کچھ ہے۔ یعنی معدوم ہے تو میری بلا ڈرے کہ آپ اس کو میرے قتل کیلئے اگر کس کر باندھ رہے ہیں۔ بھلا یہ معدوم چیز کیا بندھے گی!

(٢٠٤) وہ ہیں (جس کیلئے میں نے اپنا گھربار لٹا دیا) مجھے کہتا ہے کہ میں بے ننگ و نام یعنی بے شرم اور بدنام ہوں۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا۔ تو ایسے بے وفا کیلئے اپنا گھر بار (عشق میں) کیوں لٹاتا۔

(٢٠٥) میں ابھی مبتدی عشق یا کسی راہ میں نیا چلنے والا ہوں۔ کہ ہر ایک تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور جا کے رہ جاتا ہوں۔ کیونکہ ابھی یہ نہیں جانتا کہ کیسی راہ کونسی ہے۔ اور مجھے کدھر کو جانا چاہئے۔ (قاعدہ ہے کہ مبتدی یا انجان ہر کام کو ہاتھ ڈالتا ہے۔ مگر چونکہ اصلیت سے ناواقف ہوتا ہے۔ تھوڑی ہی مدت میں ناکام ہو کے بیٹھ جاتا ہے)۔

(٢٠٦) احمقوں نے میری چاہت کو۔ جو اس بُت یا معشوق کیلئے میرے دل میں ہے۔ پرستش قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ میں اس ظالم بت کو پوجتا نہیں ہوں۔ محض اس سے محبت رکھتا ہوں۔ (مراد یہ کہ بتوں کی الفت پر دھوکہ ہوتا ہے۔ کہ عشاق ان کی پوجا کیا کرتے ہیں)۔

(٢٠٧) عاشق عموماً اپنے آپ کو معشوق ہی کے کوچے میں تصور کیا کرتا ہے۔ لہٰذا کہتا ہے کہ میں اپنی خبر لینے کو دوست کے کوچہ میں جاتا۔ مگر عالم بے خودی میں دوست کے کوچے کا راستہ ہی بھول گیا۔ مراد یہ کہ اپنے آپ کی بھی خبر نہیں۔ صرف دوست کے کوچے کا خیال دل میں باقی ہے۔

(٢٠٨) جس طرح میں ہنر کی دولت کو عزیز رکھتا ہوں۔ خیال کرتا ہوں کہ یہی حال سارے زمانے کا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہنر یعنی کمال پیدا کرنے کا کسی کسی کو ہی خیال ہوا کرتا ہے۔ جو اس کو اچھا جانتا ہے۔

(٢٠٩) اے غالب میں خدا سے یہ دعا مانگتا ہوں۔ کہ عالی گوہر یعنی اعلےٰ خاندان والے۔ علی بہادر کو میں ناز و افتخار کے گھوڑے پہ سوار دیکھوں مراد یہ کہ وہ علو مرتبہ حاصل کرے۔

(٢١٠) وہ میرا ذکر بہ بدی (یعنی برائی اور مذمت) کے ساتھ بھی کیا جانا پسند نہیں کرتا۔ حالانکہ غیر کے ساتھ اس کی یہ مروت ہے۔ کہ اگر غیر کا کوئی کام بگڑ بھی جائے تو وہ اسے سہل سمجھتا ہے۔ اور فوراً اس کا بگڑا کام بنا دیتا ہے۔

(٢١١) دوست نے میرے ساتھ باغ کی سیر کرنے کا وعدہ تو لیا ہے۔ زہے قسمت۔ دراصل وعدہ نہیں ہے۔ مژدہ قتل ہے کہ دوست مجھے ساتھ لے جا کے قتل کر دیگا۔ جو بہت مقدر ہی میں ہے اور دوست نے مجھے اس امر کے متعلق ابھی تک کچھ بتایا نہیں ہے۔

غزل

(١) ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں

غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

۶۱۱ وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

۶۱۲ شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

۶۱۳ قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

۶۱۴ حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

۶۱۵ میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

۶۱۶ ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

۶۱۷ صافِ دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

۶۱۸ ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

---

(۶۱۲) شعرا معشوق کی کمر معدوم بتایا کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کو بہت باریک اور موجود بھی کہا کرتے ہیں۔ تو گویا وہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اسی قیاس پہ یہ دنیا بھی شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر بتائی گئی ہے

مگر جیسے کمر کو موجود بھی کہتے ہیں۔ اور معدوم بھی۔ مصنف کہتا ہے۔ کہ ہمارے نزدیک یہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ معدوم ہی ہے۔ یہاں شاہدِ ہستیٔ مطلق سے مراد قدرت ہے۔ کہ جس کو بوجہ زیب و زینت کے شاہد یا معشوق کہا گیا ہے۔ اور وہ مطلق ہے۔ یعنی کسی سے اس کو کچھ تعلق حسن و عشق وغیرہ نہیں ہے۔

حاصلِ شعر یہ کہ دنیا دوست کی کمر کی طرح ہے بھی اور نہیں بھی ہے تاہم فانی ہے۔ گو بظاہر موجود ہے۔

(۶۱۳) قطرہ سے مراد یہاں ایک حقیر ہستی۔ تنک ظرفیٔ منصور منصور کا یہ چھچھورا پن کہ وہ انا الحق کا نعرہ لگانے لگا۔ کہ بس میں ہی خدا ہوں۔ حل شعر یوں۔ تو ہماری ہستی بھی حقیر ہے۔ مگر ہم منصور کی طرح چھچھورے نہیں ہیں۔ کہ اس بارے میں اس کی تقلید کریں۔ مانا کہ ہم انسان ہیں۔ اور انسان کی مثال خدا سے وہی ہے۔ جو کہ ایک قطرے کو دریا سے ہوا کرتی ہے۔ اور قطرہ دریا سے کچھ مختلف نہیں ہوتا۔ تاہم آدمی کی خدا سے کیا نسبت۔

(۶۱۴) اے خرابات کے ذوق و شوق۔ اب ہم میں فسق و فجور کی طاقت ہی نہیں رہی۔ جس کا سخت افسوس ہے۔ اب ہمارا دکھوں بھرا جسم عشقِ پُر عربدہ یعنی سخت جنگ جو عشق کے قابل ہی نہیں۔ ہاں گویا جوانی کا عالم گذر چکا ہے)۔

(۶۱۵) چونکہ بہشت میں لوگوں کو حوریں دی جائیں گی۔ شاعر لکھتا ہے کہ میں اپنے دوست کے چھیڑنے کو اُن سے کہتا ہوں۔ کہ میں قیامت میں تمہیں ضرور لوں گا۔ تو کسقدر غرور کے ساتھ وہ

جواب دیتے ہیں۔ کہ ہم کوئی حورِ بہشت تو نہیں ہیں۔ کہ کسی کے ہاتھ آئیں گے۔ مراد یہ کہ وہ دوست اس جگہ بھی ہم سے نفور ہے اور وہاں بہشت میں بھی ✦

(۶۱۶) اگر تو مجھ پر مہربانی کرنے سے جھجکتا ہے۔ تو ضرور ظلم کر۔ کیونکہ تو عشاق سے غافل رہتے ہیں۔ (جو کہ بمنزلہ ظلم کے ہے) ہر گز معذور یعنی کسی عذر پر اس کو ترک کر دینے والا نہیں ہے ✦ مراد یہ کہ تو رحم نہیں کر سکتا۔ تو ظلم ہی کیا کر اس سے تو تو کبھی چوکنے والا نہیں ہے ✦

(۶۱۷) شعر ہذا میں شرابِ طہور اور شرابِ جمشید کا تقابل کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم لوگ بادِ تکلیف جمشید کے شراب کے پیالے کی نعمت پینے والے ہیں۔ جو کہ افشردہ انگور تھی یعنی انگور کی رس ✦ (اور وہ بادشاہ جم شراب بہت مختلف قسم کی تھی) لہٰذا۔ افسوس ہے۔ اس شراب پر جو کہ انگوری نہیں ہے یعنی شرابِ طہور وغیرہ ✦

ماحصل شعر یہ کہ ہم انگوری شراب پینے والے بہشت کی شرابوں کی کیا پرواہ کر سکتے ہیں۔ ان پر تو ہمیں افسوس آتا ہے۔ کہ یہ بنائی ہی کیوں گئی تھیں ✦

(۶۱۸) خفا مراد پوشیدگی۔ اور خفائی جو پوشیدہ یا گمنام ہو ✦ اسے غالب بالمقابل ظہوری کے ہیں ایک گمنام شاعر ہوں۔ اس لئے میرے دعویٰ پر (کہ میں بھی کوئی شاعر ہوں) یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ میں کوئی مشہور شاعر نہیں ہوں۔ یعنی "ظہوری" ظاہر ہونے والا اور خفائی گمنام یا پوشیدہ۔ تو ان میں مناسبت کیا ہوئی ✦

(۶۱۹) فرہاد نے کوہِ بے ستون کاٹ کر جو اپنی بہادری دکھائی تھی۔

اس کی مزدوری وہ وصالِ شیریں کی صورت میں طلب کرتا تھا۔ حالانکہ وہ پہاڑ کٹ کر خسرو کو (جو فرہاد کا رقیب تھا) محل بنانا تھا چونکہ عشق میں عاشق اپنی محنت کی مزدوری طلب نہیں کیا کرتا لہٰذا فرہاد کی یہ بیگار نمائی (کہ اس نے خسرو کیلئے پہاڑ کاٹا تھا) قابلِ پذیرائی نہیں ہے ✦

(۶۲۰) اگرچہ ویرانی اور خرابی میں دشت سے میرا گھر بھی کم نہیں ہے۔ مگر میرے گھر میں اتنی جگہ نہیں جتنی جنگل میں لہٰذا یہاں جو عیش ہے وہ گھر میں نہیں ہے ✦

۶۲۱ نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

(۶۲۱) او ستم ایجاد میرا آہ کرنا اس مقصدِ خیر سے ہے کہ اس سے تو خفا ہو اور اور ظلم کرے۔ اور یہ تقاضائے ظلم ہے ورنہ کوئی شکایت ظلم کی نہیں ہے ✦

۶۱۹ عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں
۶۲۰ کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
۶۲۱ اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں
۶۲۲ وائے محرومیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
۶۲۳ رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشان کیوں ہے

ان دو اشعار کے معنی اوپر ملاحظہ فرماویں۔

گر چراغان سر رہگذر باد نہیں

۶۲۵ سبد گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

۶۲۶ نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں

۶۲۷ کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

۶۲۸ کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

---

(۶۲۲) جو لوگ آنکھیں رکھتے ہیں۔ ان کے لئے۔ حادثات کا طوفان (یعنی حادثات کی کثرت یا ان سے پے در پے تکالیف) ایک مکتب یعنی عبرت کی درس گاہ ہے۔ اور اس طوفان کی لہر کے تماچے۔ (نظر) استاد کی تھپی سے کچھ کم نہیں ہوتے۔

(۶۲۳) معشوق جانتا ہے کہ ہم میں خوئے تسلیم ہے۔ اور وفا کرنے کی عادت بھی ہے۔ اس لئے۔ فریاد کرنے کی ہمیں طاقت یا جرات نہیں۔ افسوس ہماری خو ہمیں یوں محروم رکھے اور بد (یعنی خراب حال) رہے۔ اس طرح ہماری وفا شعاری

(۶۲۴) گل لالہ (پوست کا پھول) اور گلاب کے پھول کے ضبطِ خودداری (تمکین) کا رنگ اس قدر اڑنے کیوں لگا ہے اگر یہ خیال نہیں کرتے کہ ہم وہ چراغ جل رہے ہیں۔ کہ جو ہوا کی گذرگاہ

پر رکھ دیئے گئے ہیں پس جو ہوا سے جلدی بجھ جائیں گے۔ یعنی خزاں ان پھولوں کو برباد کردے گی اور اس سے زرد زرد ہو رہے ہیں۔

(۶۲۵) گلچیں (مالی) جو پرند پکڑتا ہے تو اسے سبد گل (پھولوں کی ٹوکری) کے نیچے بند کر دیتا ہے۔ اے مرغ (یعنی بلبل) تجھے خوشخبری کہ باغ میں صیاد نہیں ہے۔ جو ادھر پکڑتا ہے۔ اور ادھر چھری گردن پر چلا دیتا ہے بلکہ مالی ہے جس کی ٹوکری میں پھولوں کی خوشبو بھی تجھ بلبل اسیر کے دماغ کو پہنچتی رہے گی۔

(۶۲۶) اس محبوب کو قدرت نے منہ کے عوض "نہیں" دی تھی۔ جو ہماری ہر بات پر وہ کہہ دیتا ہے لہذا۔ ثابت ہوا۔ کہ پہلے اس کو نہی (نفی) بہ صورت (نہیں) دی گئی تھی اس سے پھر دہن جو بصورت ایک ہستی کے یعنی اثبات کے ہے اس نے تراوش یا ظہور کیا تھا۔ (معشوق کا منہ معدوم بتایا جاتا ہے گویا یہ نفی سے بنا)

(۶۲۷) تیرے کوچے کی رونق سے بہشت کی چہل پہل کچھ کم نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں بھی یہی نقشہ ہے۔ مگر بہشت اس قدر آباد نہیں ہے۔ یعنی تیرے کوچے میں تو تجھے دیکھنے کے لئے ساری دنیا آتی جاتی ہے۔ حالانکہ بہشت میں خاص خاص لوگ ہی جا سکتے ہیں۔

(۶۲۸) اے غالب تم کس منہ سے اپنی غربت (مسافت) کی شکایت کرتے ہو کیا تم کو ہم وطن دوستوں کی بے مہری یا بے وفائی بھول گئی ہے۔ یعنی اہل وطن ہی نے تو تم کو پریشان کر کے گھر سے نکالا اور پھر تم ان کو یاد کرتے ہو۔

(۶۲۹) وہ سے مراد یہاں مربیان قضا و قدر سے ہے۔ جو انسان کو پیدا کر کے ان دونوں جہانوں کا وارث قرار دیتے ہیں۔ حل شعر۔

مربیان قضا و قدر انسان کو دونوں جہانوں کا وارث بنا کے یہ سمجھے کہ وہ خوش ہو گیا یعنی مطمئن ہو گیا۔ مگر نہیں۔ انسان کو یہ شرم آ پڑی ہے کہ خدا کے پاس تو بس یہی دونوں جہان ہیں نہ زیادہ انہیں ہیں اور پھر کسی تیسرے جہان کے لئے وہ کیا تکرار کرے۔ مراد انسان بیحد حریص ہے۔

(۶۳۰) صوفیا خدا تک پہنچنے کی کئی منزلیں قرار دیتے ہیں جن کو مقام کہا جاتا ہے۔ حل شعر۔

ہر مقام راہ سلوک پہ کئی سالک تھک تھک کے رہ گئے۔

ناچار تیرا پتہ یعنی خدا کا نہ ملا تو وہ بیٹھ نہ جاتے تو اور کیا کرتے۔

(۶۳۱) اہل بزم کیا شمع کے خیر خواہ نہیں ہیں یعنی کیا وہ نہیں چاہتے کہ شمع کبھی نہ بجھے۔ مگر اس کا وہ غم یعنی شمع کا جلنا ہی جب اس کے جسم کو پگھلانے اور نیست و نابود کر دینے والا ہو۔ تو وہ غم خوار شمع کیا کر سکتے ہیں۔ یعنی شمع کا جلنا بہر حال ضروری ہے۔ اور یہی اس کا غم بھی ہے جو جانگداز ہے۔

غزل

۶۲۹ دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
۶۳۰ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

ان تین اشعار کے معنی اوپر ملاحظہ کرو۔

تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
۶۳۱ کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غم خوار کیا کریں

ان اشعار کے معنی اوپر ملاحظہ ہوں۔

(۶۳۲) رقیب کی میٹھی میٹھی (فریب آمیز) باتوں کا وہ گرویدہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ ہم جو اس کے عاشق صادق ہیں۔ اور اپنی محبت اس پر جتایا نہیں کرتے۔ ایسے بے زبانوں پر اس کو یہ گمان یا خیال تک بھی نہیں آتا ہے۔ کہ ہم بھی کوئی اس کے عاشق ہیں۔

مراد دنیا میں لاف زنی بہ نسبت خاموشی کے زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے۔

(۶۳۳) کہتے ہیں۔ دشت نجد میں جب مجنوں سخت شکستہ حال ہو گیا تھا۔ تو لیلے کا اونٹ مجنوں پر رحم کھا کر لیلے کو مجنوں کے پاس لے آیا تھا۔ یہاں اس تعجب خیز روایت کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب شعر۔ وہ محبوب یہ سن کر کہنے لگے! کہ عاشق مجنوں کے پاس جنگل میں چلی آئی تھی۔ تعجب سے بولا کہ کیا زمانے میں کبھی ایسا واقعہ بھی ہوا کرتا ہے۔ یعنی معشوق خود بخود عاشق کے پاس کبھی چلا نہیں آتا۔ ان کی یہ بات سن کے مجھ پر تو قیامت سی گذر گئی کہ اب ان کے آنے کی امید دل میں نہیں رکھنی چاہئے۔

(۶۳۴) اے غالبؔ تو اس کو اپنی محبت کا امتحان لینے کی طرف سرگرم نہ کر یعنی اس بات کا شوق نہ دلا۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ کا ارادہ دل رکھتا ہے۔ اور میرا امتحان وفا کرنے کے لئے اس کو فرصت

سے سخت ظلم کرنے پڑیں گے ۔ اور وہ اتنا عاجز ہو جائے گا ۔ کہ اس کی حالت قابلِ رحم ہو جائے گی ۔ مراد یہ کہ میری محبت اس قدر صادق ہے ۔

۶۳۱ ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

(اس تمام غزل کے معنی اوپر ملاحظہ کرو)

۶۳۳ قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

۶۳۴ دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

۶۳۵ دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

۶۳۶ ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

(۶۳۵) وہ محبوب بھی کسی کا عاشق ہو کے اب تنہا (اپنے معشوق کے خیال میں) بیٹھا رہتا ہے ۔ بارے اپنی بیکسی کی اب ہم نے داد پائی (بیکس وہ انسان ہوتا ہے ۔ کہ جس کا کوئی یار و مددگار نہ ہو) ۔
حاصل شعر یہ کہ ہمارے ظلم کا خدا ہی نے ہمیں انصاف دلا دیا ۔

(۶۳۶) اس آفرینش یا کائنات کے تمام اجزا یعنی ذرہ ذرہ اپنے زوال اور فنا کی طرف آمادہ ہیں ۔ خود وہ آسمان پر کا آفتاب جس سے یہاں سب کچھ ظہور پذیر ہوا ہے ۔ وہ بھی ایک ایسے چراغ کی مانند ہے

کہ جس کو ہوا کی گذرگاہ پر رکھ دیا گیا ہو ۔ مطلب یہ کہ جس کے فوراً بجھ جانے میں کچھ شک و شبہ ہی نہیں ہے ۔ (یہ مسئلہ علمِ ہیئت سے تعلق رکھتا ہے) ۔

۶۳۷ یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

۶۳۸ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

۶۳۹ نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

(۶۳۷) ہم اس کے فراق میں کبھی اپنے گھر کی دیوار کو دیکھتے ہیں تو اس لیے ۔ کہ بادِ نسیم اسی طرف سے دوست کا پیغام لانے کی ۔ اور پھر ہم اپنے گھر کے دروازے کی طرف نگاہ کرتے ہیں ۔ تو اس لئے کہ ہمارا قاصد ادھر ہی سے یار کا خط لائے گا ۔

(۶۳۸) وہ دوست ہمارے گھر میں آگیا ۔ اور یہ بات واقعہ ہوئی تو اس پر خدا ہی کو قدرت تھی (ہمارا کیا اختیار تھا) لہذا ۔ ہم کبھی اپنے گھر کے دروازے کی طرف دیکھتے ہیں ۔ کہ وہ اس در سے داخل ہوا تھا اور کبھی اس دوست کو دیکھتے ہیں ۔ کہ اس نے ایسی عنایت کی ۔
(۶۳۹) کہیں دوست کے ہاتھ اور بازوؤں کو نظر نہ لگ جائے انہیں نے اپنی بڑی بھاری طاقت سے اتنا بڑا شگاف اپنی تلوار سے میرے

سینے میں کر دیا ہے) کہ میں ڈرتا ہوں ۔ یہ لوگ جو میرے اس زخم جگر کو دیکھ کر دوست کی طاقت کا اندازہ لگا رہے ہیں ۔ اس سے اس کے دست و بازو کو بوجہ نظر لگنے کے کچھ صدمہ نہ پہنچ جائے ۔ (دوست کی طاقت بیداد کا ذکر کیا ہے) ۔

---

۶۴۰ ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

---

(۶۴۰) ہم تیری کلاہ کے ایک طرف جو موتی لگے ہوئے ہیں ۔ ان کو کیا دیکھیں کہ یہ کیسے خوب صورت ہیں ۔ ہم تو ان جواہرات اور لعلوں کی قسمت کی اس بلندی کو دیکھتے ہیں ۔ کہ یہ ایسے شخص (مثلاً کوئی مرشد یا بادشاہ) کے سر پر چڑھ کر چمک رہے ہیں ۔

غزل

۶۴۱ نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

۶۴۲ کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

۶۴۳ جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں ان سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

(۶۴۱) یہ بات نہیں ہے کہ مجھے قیامت کا یقین نہیں ۔ یقیناً قیامت کا دن ضرور آئے گا ۔ لیکن وہ سزا جزا کا روز میری اس شب تنہائی سے زیادہ کٹھن نہیں ہوگا ۔

(۶۴۲) شراب خوار عموماً گھٹا کا انتظار کرتے ہیں ۔ کہ خوب برسات ہو تو شراب پئیں ۔ وہ کہتا ہے ۔ کہ بلا سے یعنی ہمیں کیا پرواہ ہے ۔ اگر آج دن کے وقت ہوا اور بارش نہیں ہوئی ۔ رات تو چاندنی ہے ۔ چلو اس میں خوب پیٹ بھر کے شراب پی لیں گے ۔ یعنی اگر دن کو بوجہ ابر و باد نہ ہونے کے نہیں پی تھی ۔ (شراب خوار چاندنی رات کو بھی مے کشی کے لئے بہت پسند کیا کرتے ہیں ۔

(۶۴۳) میں دوست کی ملاقات کو جاتا ہوں ۔ تو وہ مرحبا کہہ کر یا ہم تم آئیے کہہ کر مجھے نہیں بٹھاتے یعنی میری طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے ۔ اور جو وہاں سے اٹھ کر کہیں چلا جاؤں ۔ تو خیر باد " یعنی تو " بخیر و سلامت رہے " نہیں کہتے ۔ مجھ سے اس قدر لاپرواہی ہے ۔

انتباہ

کتاب ہذا موسوم بہ " شفائے معانی " دو ضخیم حصوں میں منقسم ہے جس کے ہر حصہ میں صرف ایک ہزار اشعار کی مفصل شرح درج کی گئی ہے ۔ لہذا مکمل شرح اردو دیوان غالب (مشتمل بر دو ہزار اشعار) ہر دو علیحدہ علیحدہ حصص کتاب میں ملاحظہ فرمائیں ۔

" خاکسار مؤلف "

۶۴۴ کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنۂ و فساد نہیں

۶۴۵ علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

۶۴۶ جہاں میں ہیں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

۶۴۷ تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

(۶۴۴) کبھی وہ محفل یار مجھے یاد بھی کیا کرتے ہیں۔ تو یہ کہہ کر کہ آج اس مجلس میں کچھ فتنہ فساد نہیں ہے۔ گویا میرا نام فتنہ و فساد مقرر کر رکھا ہے۔

(۶۴۵) عوام رمضان کے مہینے میں عیش و عشرت ترک کر کے اکثر شراب نہیں پیا کرتے ہاں عید کو بہت مست ہو جاتے ہیں گویا عید ان کے لئے پیغام شراب لاتی ہے۔ مگر ایک عادی مے خوار نے رمضان کیا اور عید کیا ہر وقت گدائے کوچۂ مے خانہ بنا رہتا ہے۔ تو اسے کبھی شراب کی طرف سے نامرادی یعنی مایوسی حاصل ہوتی ہے کہ صرف عید کے دن ہی وہ شراب پی سکتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔

(۶۴۶) دنیا میں رنج و راحت ایک ساتھ رہتے ہیں تو ہمیں اس

سے کیا مطلب ہے۔ کیونکہ خدا نے ہمیں وہ دل دیا ہے۔ کہ صرف رنج و غم کا احساس کر سکتا ہے۔ لہذا خوشی تو ہم کو کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔

(۶۴۷) اے غالبؔ بھلا تم ان کو ان کا وعدہ یاد دلا کے لیے ان سے اس کا کچھ ذکر ہی کیوں کرو۔ کیوں کہ تم جانتے ہو کہ وہ وعدہ وفا نہیں ہے تو پھر یہ بات کیا (یعنی ایسی فضول بات کیوں کرو) کہ تم اس کے متعلق کچھ کہو اور وہ کہیں کہ نہیں تو کوئی ایسا وعدہ یاد نہیں ہے۔ مراد یہ کہ محبوب وعدہ وفا نہیں تم اس کا ذکر بھی نہ کیا کرو۔

۶۴۸ تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

۶۴۹ آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

۶۵۰ تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

(۶۴۸) توسن۔ گھوڑا۔ مضمون کی ہوا باندھنا۔ کسی بات کو شہرت دلانا۔ مطلب شعر۔ ہم تیرے گھوڑے کی تعریف میں اس کو صبا رفتار باندھ کے گویا اپنے مضمون یا شاعری کو شہرت دلانا چاہتے ہیں۔ مراد یہ کہ اکثر قصیدہ گو شعرا۔ اپنے ممدوح کے گھوڑے کی تعریف میں ایک معمولی سا خیال (مثلاً گھوڑے کو صبا یا صبا رفتار) باندھنے جاتے ہیں۔ کہ ان کو انوری و خاقانی تصور کیا جائے۔ اور وہ بھی کو نظر شاعر ہوتے ہیں۔

دوسرے معنی ۔ یہاں مضمون گھوڑا ہے ۔ اور صبا جو ہوا ہوتی ہے
اس کی تعریف ہے تو گویا ہم مضمون کی ہوا باندھتے ہیں ۔ لیکن ہوا تو
کسی طرح بندھ نہیں سکتی لہٰذا تیرے گھوڑے کی تعریف حد توصیف
سے باہر ہے ؁

(۶۴۹) بھلا عاشق کی آہ و فریاد کا اثر ہی کہاں ہوتا ہے ۔ لہٰذا
ہم بھی ایک آہ کر کے اپنی ہوا باندھنے لگے ہیں ۔ یعنی چاہتے ہیں ۔ کہ
ہم کو بھی فرہاد و مجنوں کی طرح کا ایک عاشق تصور کیا جائے + اور
کوئی لیلیٰ یا شیریں ہم پر بھی مرنے لگے ۔
دوسرے معنی :۔ شعراء کی آہ کا اثر کس نے دیکھا ہے ۔ یعنی یہ بے اثر
ہوتی ہے ۔ تو پھر اس کو شعر میں باندھنا ۔ گویا اپنی ہوا باندھنا ہے ۔ یعنی اپنی
ہوا و حرص کا اظہار کرنا ہے ۔ جو ایک فضول بے اثر بات ہے ۔ یا
محض یونہی سی بیکار ۔

(۶۵۰) پا بہ حنا ہونا ۔ مراد قدرے توقف کرنا ۔ جیسے مہندی
لگا کے چلتے پھرتے نہیں ہیں + حل شعر ۔ عمر تیری تیزی رفتار کے آگے
ہم بجلی کو بھی جو اتنی تیز رفتار ہے ۔ پا بہ حنا لکھتے ہیں ۔ یعنی وہ بھی کچھ توقف
یا ٹھہراؤ کرتی ہے ۔ حالانکہ تجھ میں اے عمر اس قدر توقف و تامل بھی نہیں
پایا جاتا ؁

۶۵۱ قید ہستی سے رہائی معلوم

اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
۶۵۲ نشۂ رنگ سے ہے واشد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہیں
۶۵۳ غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
۶۵۴ اہل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
۶۵۵ سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

۶۵۶ زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

(۶۵۱) چونکہ شعرا اشک یا آنسو کو "بے سر و پا" باندھا
کرتے ہیں ۔ اور جو چیز بندھ گئی ہو ۔ وہ گویا آزاد نہیں ہوا کرتی
لہٰذا کسی کا قید ہستی سے رہا ہونا ۔ معلوم ہے ۔ یعنی ظاہر ہے
کہ کبھی ممکن ہی نہیں ہے ۔ کہ کوئی یہاں آزاد رہ سکے +

(۶۵۲) نشہ ۔ جوش + رنگ ۔ یہاں مراد نشو و نما حاصل
کرنا (بہ حوالہ غیاث اللغات) نشۂ رنگ یعنی نشو و نما کے جوش
میں پھول کی واشد ہوئی ہے ۔ یعنی وہ کھل گیا ہے + گیا وہ لوگ جو
مست ہوں ۔ کبھی اپنے قبا کا بند باندھا کرتے ہیں ۔ لہٰذا پھول بھی

موسم بہار میں اسی طرح مست اور خوب کھلا ہوا ہے +

(۶۵۳) لوگ سے یہاں مراد شعرا ہیں۔ کہتا ہے شعرا نالہ و آہ کو رسا باندھا کرتے ہیں۔ حالانکہ نالہ و آہ کبھی رسا یعنی مؤثر ہی نہیں ہوا کرتے۔ لہٰذا ان مضامین کی کثرت کا حال مت پوچھ کہ جن میں غلطی سے آہ کو رسا باندھا گیا ہے +

(۶۵۴) اہلِ تدبیر۔ کسی دکھ کا علاج کرنے والے۔ درماندگیاں مجبوریاں + حل شعر:

اہلِ تدبیر کی یہ مجبوریاں دیکھو۔ کہ جب مجھ کو صحرا نوردی سے باز نہ رکھ سکے۔ تو میرے پاؤں کے آبلوں پر بھی مہندی باندھ دی کہ یہ چل پھر نہ سکے۔ بھلا کہیں اس طرح بھی مہندی لگائی جاتی ہے۔ اور کیا مہندی مجھے صحرا گردی سے مانع آ سکے گی۔ (آبلوں پر مہندی اس حالت میں حکیم لوگ باندھتے ہیں۔ کہ معمولی سوزش ہو۔ لیکن یہاں تو آبلوں کا تعلق عشق و محبت کے ساتھ ہے۔ جو دوسرا مضمون ہے) +

(۶۵۵) خوباں یعنی محبوب ہم سے وفا کا اقرار کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم بخوبی واقف ہیں۔ وہ کبھی ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ تو یہ سادہ پرکار ہونے کی دلیل ہے۔ یعنی اصلی حالات سے وہ پرکار یا چالاک آدمیوں کی طرح واقف ہیں مگر تاہم بظاہر سادہ یعنی بھولے بھالے بن کے ہم سے اس قسم کا وعدہ کرتے ہیں +

(۶۵۶) بجانِ اسد۔ اسد کی جان۔ دوسرے معنی ۔ اسد کی جان کی قسم + حل شعر۔

زمانہ ہمارے ساتھ اتنا ظلم نہیں کرتا کہ جتنا ہم اس سے متوقع رکھتے ہیں۔ دوسرے معنی یہ کہ ہم اسد کی جان کی قسم کھا کے کہتے ہیں۔ تاکہ سب کو یقین آ جائے۔ کہ ہم کو زمانہ جتنا کم آزار پہنچاتا ہے۔ ہم اس سے کہیں زیادہ ایذا رسانی کی اس سے خواہش رکھتے ہیں۔ گویا بہت ایذا دوست ہیں +

۶۵۷ دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

۶۵۸ کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

۶۵۹ یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

۶۶۰ حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

۶۶۱ کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

۶۶۲ رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

۶۶۳ کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

۶۶۴ غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

(۶۵۷) میں تیرے دروازے پہ (پتھر کی طرح) ہمیشہ پڑا ہوا نہیں ہوں۔ (حالانکہ میں ایسا چاہتا ہوں) لہذا۔ ایسی زندگی پر (جو کہ بصورت انسان ہے) خاک کہ میں پتھر نہ ہوا۔ ورنہ تیرے در پہ پڑا رہتا۔

(۶۵۸) میں عشق کی بدولت ہمیشہ گردش میں مبتلا ہوں۔ مگر کوئی انسان جب ہمیشہ گردش میں رہے۔ تو وہ گھبرا جاتا ہے۔ یہی میرا حال ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ میں کوئی شراب کا پیالہ یا ساغر تو نہیں ہوں۔ کہ متواتر گردش سے اکتا نہ جاؤں گا۔

(۶۵۹) یارب زمانہ مجھ کو (اپنے گذرتے جانے سے) مٹا کیوں رہا ہے۔ یعنی میں ہر روز عمر کے گذرنے سے گویا مٹتا جا رہا ہوں یہ کس لئے؟

اس دنیا کی لوح یعنی تختی یا صفحہ دنیا پر میں کوئی دوبارہ لکھا ہوا حرف تو نہیں ہوں کہ جس کو غلط یا غیر ضروری سمجھ کر مٹایا جا رہا ہے۔ (مراد یہ کہ میں دنیا میں ایک ہی تو ہوں پھر میرا فنا کرنا کس لئے ہے)۔

(۶۶۰) شرع اسلامی میں بعض گناہ کی نسبت حکم ہے۔ کہ وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔ لیکن گنہ گار مسلمان ایک میعاد کے لئے وہاں رکھ کر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ کہتا ہے کہ میں جب سے دنیا میں پیدا ہوا ابتلائے رنج ہوں۔ اور وہاں اگلے جہان میں بھی مجھے دوزخ ہی نظر آتا ہے۔ یہ کیوں؟

میں ایک گنہ گار مسلمان ہی ہوں آخر کافر تو نہیں ہوں۔ میرے لئے عقوبت یعنی عاقبت میں سزا دینے کی کوئی حد مقرر ہونی چاہیئے۔ یعنی جب دنیا میں اتنی تکلیفیں میں نے اٹھائی تو وہاں پھر مجھے کوئی سزا دی ہی نہیں چاہیئے۔

(۶۶۱) یہ قطعہ بادشاہ کی تعریف میں کہا ہے۔ کہ آپ لعل و زر و گوہر کو عزیز نہیں رکھتے۔ (یعنی آپ ایک درویش صفت بادشاہ ہیں۔ مراد بہادر شاہ ظفر) اور کیا مجھ کو بھی آپ عزیز نہیں جانتے۔ اس لئے کہ میں کوئی لعل و گوہر وغیرہ نہیں ہوں۔

(۶۶۲) میں بصورت انسان اور پھر ایک قابل انسان کی حیثیت سے مہر و ماہ سے ہرگز کم نہیں ہوں۔ تو کیا آپ میری آنکھوں پر بھی اپنا قدم نہیں رکھتے۔ یعنی میرے ہاں تشریف نہیں لاتے۔ (یعنی آپ کی شان اتنی اعلےٰ و ارفع ہے۔ کہ مہر و ماہ پہ قدم رکھنا بھی آپ کو گوارا نہیں ہے)۔

(۶۶۳) آپ مجھ کو اپنے قدم چومنے سے کیوں منع کرتے ہیں اس لئے کہ میں آسمان کے برابر بھی نہیں ہوں (اور آپ کی شان ایسی اعلےٰ ہے۔ کہ کم از کم آسمان آپ کی قدم بوسی کرے۔ یا آسمان قدم بوسی کرتا

ہے۔ اور مجھے منع کرتے ہیں ⁂

(۶۶۴) اے غالب (یہ باتیں بادشاہ کی بے اعتنائی، بے پروائی) جو اوپر رقم ہوئیں۔ ان کو چھوڑ دو) اب تو تم بادشاہ کے وظیفہ خوار ہو۔ اس کے سر کو دعا دو۔ اب وہ دن گئے۔ کہ تم کہا کرتے تھے کہ ہائے میں بادشاہ کا نوکر نہیں ہوں ⁂

غزل

۶۶۵ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

۶۶۶ یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

۶۶۷ تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

(۶۶۵) کیا جانیں کیسی کیسی حسین صورتیں تھی۔ کہ خاک میں مل گئیں۔ اور وہاں سے سب تو کہاں کچھ تھوڑی سی لالہ (پوست کے خوشنما پھول) اور گل (گلاب کے خوش وضع پھول) کی صورت میں یہاں پھر نمایاں ہو گئیں ⁂

(۶۶۶) ہم کو بھی (عالم شباب میں) طرح طرح کی محفلیں سجانا اور ان سے لطف حاصل کرنا آتا تھا۔ لیکن وہ باتیں اب بھول چوک کے

طاق کی نقش و نگار بن گئیں۔ یعنی سب کی سب بھول بسر گئیں (گویا یہ انقلاب زمانہ واضح ہوا) ⁂

(۶۶۷) بنات النعش۔ وہ سات ستارے ہیں۔ جن میں سے چار ستارے تو گویا جنازہ ہیں۔ اور تین ستارے جنازہ بردار ہیں۔ ان کو سات سہیلیوں کا جھمکا کہا کرتے ہیں۔ مطلب شعر یہ کہ سات سہیلیوں کا جھمکا یعنی بنات النعش دن کو تو آسمان پر پردے میں نہاں تھیں۔ پھر رات کو ان کے جی میں کیا آیا کہ یہ ننگی ہو کے نکلیں۔ مراد یہ کہ رات کا وقت ایسا محرک فرحت ہے۔ کہ انسان تو انسان ستارے بھی رندی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں ⁂

۶۶۸ قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

۶۶۹ سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

۶۷۰ جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

۶۷۱ ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

۶۷۲ نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

۶۷۳ میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

۶۷۴ وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

۶۷۵ بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

۶۷۶ واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

۶۷۷ جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

۶۷۸ ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

۶۷۹ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

۶۸۰ یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

(۶۶۸) حضرت یوسف جب مصر میں قید ہوئے۔ تو حضرت یعقوب (بوجہ دوری کے) ان کی خبر نہ لے سکے۔ لیکن ان کی آنکھیں اپنے بیٹے کی طرف اس طرح لگی ہوئی تھیں۔ کہ گویا کسی قید خانے کی کھڑکی بن گئی تھیں۔ یعنی انتظارِ یوسف میں شب و روز کھلی رہتی تھیں۔

(۶۶۹) روایت ہے۔ کہ بعض عورتوں نے زلیخا کو یوسف کے

عشق میں متہم کیا تھا۔ اس نے یک صد عورتیں ہاتھ میں لیموں اور چھری دیکے ایک جگہ بٹھا دیں۔ اور ان سے کہا کہ جب یوسف ان کے پاس سے گذریں تو وہ لیموں کاٹنا شروع کر دیں۔ جب حضرت یوسف آئے۔ تو وہ ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر اس قدر محو ہو گئیں۔ کہ بجائے لیموں کے انہوں نے اپنے ہاتھ ہی کاٹ ڈالے۔ اور اس طرح زلیخا پر پھر کوئی طعن نہ کر سکا۔

مطلب شعر۔ اوپر کی روایت سے واضح ہے۔ کہ جو عورتیں حضرت یوسف کو دیکھ کر اس پر عشق کھا گئی تھیں۔ وہ گویا زلیخا کی حریف یا رقیب بن گئی تھیں۔ لہذا شاعر کہتا ہے۔ کہ اور سب عشاق اپنے رقیبوں سے ناخوش ہوا کرتے ہیں۔ لیکن زلیخا زنانِ مصر سے (بوجہ واقعہ مسبوق الذکر) بہت خوش تھیں۔ کیوں کہ وہ ماہِ کنعان یعنی حضرت یوسف پر فدا ہو گئی تھیں۔

(۶۷۰) یہ فراق کی شام ہے۔ (جب کہ شمعیں جلائی جاتی ہیں) میری دونوں آنکھوں سے خون کی دو ندیاں بہنے دو۔ کیوں کہ میں یہ سمجھوں گا۔ کہ دو موم بتیاں مجھ سے شامِ فراق کو روشن ہو گئیں۔ اور وہ میرے گھر کو روشنی دینے لگیں۔ (خون جب دھار باندھ کے بہتا ہے۔ تو بہت روشن ہوا کرتا ہے۔ اس لئے شمع فروزاں سے نسبت دی ہے)

(۶۷۱) اگرچہ پری زادیں جن پر ہم یہاں عاشق ہیں۔ قدرت [illegible] بہشت میں حوریں بن گئیں۔ تو ہم ان کو وہاں اپنے سے لیکر [illegible] نہیں گے۔ کہ انہوں نے دنیا میں ہم پہ کیا کیا ظلم روا

رکھے +

(۶۶۲) جس شخص کے بازو پر تیری زلفیں پڑ گئیں یعنی جس کسی کو تیرا وصال حاصل ہوا۔ بس اسی کی نیند ہے۔ یعنی وہی خوشی سے سو سکتا ہے۔ اور اسی کا دماغ ہے۔ یعنی تیری زلفوں کی خوشبو سے اسی کا دماغ معطر ہو سکتا ہے۔ یا وہ اس بات کا بجا فخر کر سکتا ہے۔ اور وہ راتیں بھی اسی کی ہیں کہ وہ خوب عیش اڑائے گا +

(۶۶۳) جب چمن میں گیا گیا۔ گویا دبستان یعنی مکتب جاری ہو گیا اور بلبلیں میرے یہ نالے (یعنی پرسوز عشقیہ اشعار) سنکر غزلیں پڑھنے لگیں یا میری تقلید میں غزل سرائی کرنے لگیں +

مراد یہ کہ شاعر فخریہ کرتا ہے کہ بلبل بھی نغمہ سرائی میں میری تقلید کرتی ہے +

(۶۶۴) نگاہیں کیوں دل کے باہر ہوئی جاتی ہیں۔ اس کا اصل مطلب یہ کہ نگاہیں معشوق کی آنکھ سے نکل کے ہمیشہ میرے دل میں لگا کرتی تھی۔ اب وہ دل کے باہر یا بار کیوں رہی جاتی ہیں + حل شعر یا دسبہ (بطور زیادہ کہتا ہے۔ کہ یہ ایک عجیب واقعہ درد انگیز ہے) دوست کی وہ نگاہیں کیوں میرے دل میں نہیں اترتی۔ اور اسکے بار یعنی باہر ہوئی جاتی ہیں۔ (جو ہمیشہ میرے دل کو زخمی کیا کرتی تھیں) اس کا سبب یقیناً میری شومئی قسمت ہے کہ وہ نگاہیں۔ دوست کی نیچی نظر یا شرم کھانے کی وجہ سے اس کی پلکوں میں اٹک کر مژگاں بن گئی۔ اور پرو ہو گئی ہیں + خلاصہ مطلب یہ کہ نگاہیں معشوق کی مژگاں میں نہ اٹکتی تو عاشق کے دل سے کبھی باہر نہ رہتی +

دوسرے معنی :- یہ کہ باوجودیکہ معشوق نے اوپر نظر اٹھا کے نہیں دیکھا کہ عاشق کو اس کے حسن دیبائی کامل کی دید ہو جا سکتی۔ تاہم اس کی نظریں عاشق کی کوتاہی قسمت سے پلکوں ہی میں اٹک کر رہ گئیں۔ اور اس پر بھی اس کے تیز نظر کا یہ اثر ہوا کہ دل عاشق سے پار ہو گئیں۔ اور اس کو زخمی کر گئیں +

(۶۶۵) چونکہ میں اپنی آہوں کو نکلنے سے روکتا رہا۔ وہ میرے سینے میں بے بہ بے ابھریں۔ یعنی یکے بعد دیگرے۔ اور اسی وجہ سے میری آہیں چاک گریبان میں گویا بخیہ کی سلائی بن گئیں۔ جس کے ٹانکے بالکل پاس پاس ہوتے ہیں۔ اور بکثرت ہوا کرتے ہیں۔ مراد یہ کہ میں اپنے گریبان میں منہ ڈالے خوب آہیں بھرتا رہا +

(۶۶۶) میں اگر دوست کے ہاں گیا بھی (یعنی اول تو میں جایا ہی نہیں کرتا بالفرض گیا بھی) تو ان کی گالیوں کے جواب میں جو میں انہیں دعائیں دیا کرتا ہوں۔ اب ان کو کیا دعائیں دونگا۔ کیونکہ جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں وہ ان کے دربان کو دے چکا ہوں۔ مراد یہ کہ اس کا دربان جن کسی طرح مجھ سے خوش نہ ہوا۔ تو پھر وہ مجھے دوست کے گھر میں داخل کب ہونے دے گا۔ اور جو دوست کے ہاں گیا بھی تو یہی ہے کہ اس کی گالیاں کھا کے دعائیں دونگا۔ تو میری دعائیں وہاں کیا اثر کر سکتی ہیں بہتر ہے کہ نہ جاؤں +

(۶۶۷) جس کسی کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ آ گیا۔ گویا اس کی زندگی بڑھ گئی۔ یا اس میں طاقت و توانائی زیادہ ہو گئی۔ اور جس ہاتھ میں اس نے وہ جام شراب رکھ کر پیا۔ اس کے ہاتھ کی سب لکیریں رگ جان ہو گئیں۔ یعنی ہاتھ کی لکیروں میں انسان کی قسمت لکھی ہوتی ہے۔ لہذا اس کی ہتھیلی پر رگ جان کی لکیریں اس کی افزائش زندگی کا باعث بن گئیں +

(۶۷۸) ہم موحد یعنی خالص خدا کو ماننے والے توحید پرست ہیں۔ اس لئے ہر ایک ملت (قوم) جو خدا کو خالص طور پر نہیں مانتی یعنی توحید کے ساتھ شرک یا اَور اَور مذہبی اکرام بھی اس میں ملا کے توحید کو مانتی ہے ہمارا کیش یا دستور ہے۔ کہ ہم ان رسوم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تاکہ ہماری تقلید پر جب وہ سب قومیں خالص توحید ہی کو ماننے لگیں تو بس وہ سب اقوام ایک ہو جائیں۔ اور سب کی سب ایک ہی ایمان کی خاص ارکان بن جائیں ۔

(۶۷۹) قاعدہ ہے کہ مشکل سے مشکل کام کی بھی عادت ہو جائے۔ تو وہ کام کچھ مشکل نہیں رہتا۔ کہتا ہے۔ کہ اگر انسان رنج کا عادی بن جائے۔ تو رنج گویا جاتا رہتا ہے۔ اسی قاعدے کے مطابق لکھتا ہے۔ کہ مجھے اتنی مصیبتیں پیش آئیں۔ اور میں ان کا خوگر ہوا۔ کہ وہ سب مصیبتیں اب میرے لئے بالکل آسان ہوگئی ہیں ۔

(۶۸۰) اگر غالب اسی طرح (لگاتار زور سے) روتا رہا۔ تو اے لوگو دیکھنا کہ اس کے طوفانِ گریہ سے یہ سب شہر جنگل بن جائیں گے۔ (رونے کے متعلق مبالغہ کیا ہے) ۔

غزل

۶۸۱ دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

۶۸۲ دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

۶۸۳ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

(۶۸۱) بوجہ دیوانگی یا جنون کے ہم نے اپنے جسم پر زنار تک بھی نہیں رکھا یعنی اس کو توڑ کر پھینک یا ہے۔ اور اب ہمارے گریبان یعنی جیب گریبان میں ایک تار تک باقی نہیں ہے۔ مراد یہ کہ کپڑا تو انہی تاروں سے مرکب ہوتا ہے۔ جب جسم پر جنیو تک رکھنا گوارا نہ تھا۔ تو پھر کسی قسم کا کوئی کپڑا جو کہ دھاگے ہی کا جمع ہوتے ہیں۔ وہ کیسے زیب بدن رہتا۔ دیوانہ پن میں اب ننگے منگے ہی پھرتے ہیں۔ اور زنار تک بھی نہیں رکھتے جو کہ علامت عشاق ہے ۔

(۶۸۲) نیاز حسرت۔ رنج کی نذر۔ ہم اپنے دل کو اس حسرت یعنی رنج پر قربان کر چکے جو کہ اس کا دیدار نصیب ہونے کی بدولت ہمیں حق تھا۔ اب (اس نے ہمیں دیدار دیا تو) دیکھا کہ ہم میں اتنی قوت دل ہی باقی نہیں رہی کہ اس کا دیدار بھی کر سکیں یعنی اس کے حسن و جمال کا جو رعب چھا جائے گا۔ اس کی برداشت کر سکیں ۔

(۶۸۳) اگر تیرا ملنا آسان نہیں ہے۔ تو دشوار ہے۔ اس لئے سہل الحصول ہے۔ کیونکہ ایک دشوار بات کوشش سے سہل ہو جایا کرتی ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ وہ دشوار بھی نہیں ہے۔ یعنی دشواری کی حد سے بلکہ زیادہ ہے۔ مراد اس قدر دشوار کہ ناممکن ہوگئی ہے ۔

---

۶۸۴ بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

۶۸۵ شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبال دوش

صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

۶۸۶ گنجائش عداوت اغیار اِک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

۶۸۷ ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں

۶۸۸ دل میں ہے یار کی صف مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقت خلش خار بھی نہیں

۶۸۹ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۶۹۰ دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

(۶۸۴) عشق یعنی کسی چیز کی محبت۔ ایک ایسی چیز ہے۔ کہ زندگی کیلئے گویا ایک لازمی امر ہے۔ مگر اس محبت میں متواتر تکلیفیں بھی پیش آیا کرتی ہیں۔ کہتا ہے۔ بغیر محبت کے عمر کٹ نہیں سکتی اور یہاں (ہم میں) اتنی طاقت ہی نہیں رہی کہ جسقدر لذت آزار یعنی محبت کی لذت میں تکلیفیں لاحق ہوا کرتی ہیں۔ ان کی برداشت کر سکیں۔ مراد یہ کہ شوق تو ہے۔ مگر اس راہ میں جو تکالیف واقع ہوں ان کے متحمل نہیں ہو سکتے ٭

(۶۸۵) شوریدگی یا جنون کے ہاتھ سے میرا سر۔ میرے کندھوں کے لئے گویا وبال یا بوجھ سا بن گیا ہے۔ اے خدا کیا۔ جنگل میں کوئی دیوار بھی نہیں کہ جس سے سر ٹکرا کے میں اس کا خاتمہ کر دوں ٭

(۶۸۶) میرے دل میں غیروں کی عداوت سمانا تو درکنار ضعف سے خود ہوس یار تک بھی باقی نہیں ٭

(۶۸۷) میرے زار زار رونے سے ڈر اور خدا کو مان۔ کیا میری گریہ و زاری آخر ایک قیدی جانور کی فریاد کے برابر بھی نہیں کہ جس پر سب ترس کھایا کرتے ہیں ٭

(۶۸۸) روکشی۔ مقابلہ٭ مجھ کو دوست کی پلکوں کی فوج سے مقابلے کا شوق تو ہے۔ لیکن ایک کانٹا چبھے تو اس کی برداشت نہیں کر سکتا۔ یعنی ارادہ تو عظیم الشان ہے۔ مگر ہمت ندارد ٭

(۶۸۹) جنگ میں دشمن کے مارنے کو تیز تلوار چاہئے مگر معشوق کی تیز نظری یہ کام کر سکتی ہے۔ تو پھر اس کی سادگی یعنی بے سروسامانی پر اے خدا کون قربان نہ ہوگا۔ یعنی وہ معشوق ہم سے برسرِ جنگ ہے (مراد ہماری طرف دیکھ رہا اور گویا ہمیں قتل کر رہا ہے) مگر اس کے ہاتھ میں تلوار تک بھی نہیں ہے ٭

(۶۹۰) اسد کو تنہائی اور مجلس دونوں حالتوں میں بارہا دیکھا وہ اگرچہ جنونی نہیں تو کچھ ایسا ہوشیار یا چالاک بھی نہیں ہے۔ مراد معمولی آدمی ہے ٭

غزل

۶۹۱ نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے در خور مرے تن میں
ہوا ہے تار اشکِ یاس رشتہ چشم سوزن میں

۶۹۲ ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

۶۹۳ ودیعتِ خانۂ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

۶۹۴ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دوں پنبہ دیواروں کے روزن میں

۶۹۵ نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

۶۹۶ ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پرافشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں

۶۹۷ نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

۶۹۸ ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرۂ خوں تن میں

۶۹۹ اسد زندانیِ تاثیرِ الفتہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

---

(۶۹۱) چونکہ میرے جسم میں کوئی زخم سینے جانے لائق نہیں ہے (گویا استفدہ وہی حالت میں ہے) میری مایوسی کے آنسوؤں کا تاگا میری زخم سینے والی سوئی کی چشم یعنی ناکے کا تاگا بن گیا ہے۔ مراد سخت حالت یاس ہے ۔

(۶۹۲) میری خانہ ویرانی (بوجہ طوفانِ گریہ کے) استفدر ہو چکی ہے۔ کہ میرے گھر کی کھڑکیوں تک پانی چڑھ کے وہاں آبِ طوفان کی جھاگ گویا روئی کا گولا بنکے رہ گئی ہے۔ اور مجھے اپنی خانہ ویرانی سے نظارے کا لطف نہیں اٹھانے دیتی ۔

(۶۹۳) میں دوست کی پلکوں کی کاوش کے ظلم کا ودیعت خانہ یعنی امانت دار ہوں۔ اور میرا ہر قطرہ خون گویا ایسا نگینہ ہے کہ جس پر نام شاہد یعنی گواہی دینے والے کا نام ثبت ہے۔ مراد۔ تیری پلکوں سے کٹ کٹ کر میرے جسم کے لہو کی ہر بوند تیرے ظلم کی شہادت دیتی ہے ۔

(۶۹۴) میرے رین بسیرے پر جو تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا کیا بیان کروں۔ (ظلمت گستری تاریکی پھیلانا) کہ اسی تاریکی کی نسبت سے میری دیواروں کے شگاف میں روئی رکھ دوں تو گویا چاندنی رات ہو جاتی ہے ۔

(۶۹۵) دوستوں کی لعنت ملامت میرے جوشِ جنون کے بے ڈھنگا پن کی روک تھام کرنیوالی واقع ہوئی چنانچہ ان دوستوں کی ہنسی میرے (پھٹے ہوئے) گریبان اور دامن میں بخیہ کا کام کر گئی۔ یعنی میں نے گریبان پھاڑنا چھوڑ دیا ۔

(۶۹۶) اس حسین محبوب کی تصویر کے عکس کے آگے آئینہ کے خطوطِ جوہر اس طرح پرافشاں ہوئے یعنی اڑنے لگے۔ جیسے کہ شعاعِ آفتاب کی کھڑکی میں ذرے (اندھیرا کرنے سے) اڑتے دکھائی دیتے ہیں مراد۔ وہ محبوب کمال حسین ہے ۔

(۶۹۷) میں نہیں جانتا کہ نیک ہوں یا بد مگر میری صحبت میری طبع کے خلاف ہے۔ مثلاً اگر پھول ہوں تو بھاڑ یا بھٹی میں ہوں (جو ہیں

بن جاتا) اور اگر گھاس پھونس تو باغ میں کہ جہاں میری کچھ قدر نہیں ہے ؛

(۶۹۸) جنون عشق کے جوش نے مجھ کو ہزار ہا دل دیئے۔ دکھ یا یعنی دیوانہ پن اس قدر بڑھا) کہ میرا ہر قطرہ خون جسم میں (بوجہ جنون) سیاہ ہو کے سویدا بن گیا + مراد تمام خون سودا زدہ ہو کے سراپا جنونی بن گیا ؛

(۶۹۹) اسدؔ میں حسینوں کی تاثیر محبت کا خوگر ہوں۔ لہذا میرے دوست نے از رہ نوازش جب میرے گلے میں بانہیں ڈالی تو وہ میری گردن کا طوق (زنجیر) بن گئیں۔ اور میں اسیر محبت ہو گیا ؛

غزل

۷۰۰ مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خون جگر سو جگر میں خاک نہیں

۷۰۱ مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

۷۰۲ یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہ گذر میں خاک نہیں

۷۰۳ بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں

۷۰۴ خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

۷۰۵ ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

۷۰۶ ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

(۷۰۰) دنیا کے مزے میری نظر میں یعنی میرے نزدیک کچھ چیز ہی نہیں ہیں۔ سوائے اس کے کہ ان کی بدولت خون جگر پیئیں۔ (غم و رنج کریں) سو اب جگر بھی خالی ہو گیا۔ تو خون جگر کیونکر پیئیں۔ مراد مطلق مایوسی ہے ؛

(۷۰۱) مرغ اسیر کی طرح اب پروں میں اڑنے کی طاقت ہی نہیں رہی شاید مر جاؤں تو ہوا اڑا کے مجھے چمن میں لے جائے ؛

(۷۰۲) چونکہ بہشت میں خاک وصول نہیں پائی جاتی۔ کہتا ہے کہ یہ کس بہشت شمائل (باغ جنت کیسے آراستہ پیراستہ حسین) کی آمد آمد ہے۔ کہ اس کی راہ گذر میں بھی پھولوں کے جلوے کے سوا خاک بھی نہیں ہے۔ یعنی صرف جلوہ گل ہی پایا جاتا ہے ؛

(۷۰۳) نفس۔ یہاں مراد آہ و فریاد۔ بھلا دوست کو تو مجھ پر رحم نہیں آتا۔ مجھ ہی کو اپنے پر رحم آتا + کہ جب بار بار آہیں کھینچتا ہوں۔ تو مجھ کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور پھر میری بے اثر آہوں میں خاک بھی اثر نہیں رہا اس سے کہ دوست ان کی طرف کبھی متوجہ

ہی نہیں ہوتا) ٭

(۷۰۴) گل سے مراد یہاں محبوب حسین ہے ٭ شرابی اس حسین محبوب کے جلوے کی یاد میں خراب ہیں یعنی نشے ہو رہے ہیں ۔ ورنہ شراب خانے کی دیوار دور میں تو کچھ بھی دھرا نہیں ہے ٭ یعنی شراب نہ سہی ہم اس کی یاد میں مست ہیں ٭

(۷۰۵) میں عشق کی غارتگری سے شرمندہ ہوں ۔ کہ میرے گھر میں اب سوائے گھر کو سرِ نو تعمیر کرنے کی حسرت کے اور کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے ٭

(۷۰۶) اے اسد ہمارے شعر اب دل لگی کے مصرف کے ہو گئے ہیں ۔ معلوم ہوا کہ عرض ہنر یعنی اپنا کمال پیش عوام کرنے میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا ۔ غالب ابتدا میں ۔ عام شعراء سے ایک جداگانہ طرز میں غزل کہا کرتا تھا اسلئے اس طرز پر عموماً پھبتیاں اڑائی جاتی تھیں ٭

غزل

۷۰۷ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

۷۰۸ دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

۷۰۹ جب وہ جمال دل فروز صورت مہر نیم روز

آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

۷۱۰ دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

۷۱۱ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

۷۱۲ حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

۷۱۳ واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

۷۱۴ ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

۷۱۵ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

(۷۰۷) میرا یہ دل ۔ دل ہی تو ہے کچھ پتھر یا اینٹ نہیں ہے ۔ کہ اس کو درد یا رنج پہنچے اور میرا یہ دل بھر نہ آئے یعنی میں آنکھوں میں آنسو نہ بھر لاؤں ۔ اچھا ہم ہزار بار روئیں گے ۔ کوئی ہمیں ستائے کیوں یعنی اس میں مزاحمت کیوں کرے (کیا دل کو درد پہنچے تو کوئی رونے بھی نا)

(۷۰۸) ہم سر راہ بیٹھے ہیں ۔ رقیب ہم کو یہاں سے اٹھائے کیوں ۔ یہ تو کسی کا دروازہ نہیں ۔ دہلیز نہیں اور نہ یہاں کوئی بت خانہ ہے یا خانہ کعبہ ۔ مطلب بے فائدہ دخل دیتا ہے ٭

(۹،) جب دوست کا وہ اپنے دل کو لوٹ و سرو پہنچانے والا جمال دوپہر کے چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح خود ہی نظارہ سوز ہے۔ یعنی اس قدر جلوہ افگن کہ آنکھیں اسے دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ تو پھر وہ دوست بعدازاں پردے میں اپنا منہ کیوں چھپا رکھے۔ کیا پردے میں سے اس کا نور چھپکر باہر نہیں نکل آئیگا۔ اس شعر میں خدا کی طرف اشارہ ہے۔ کہ قدرت تو اس کا ظہور دکھا رہی ہے۔ پھر وہ ہماری آنکھوں سے پوشیدہ کیوں ہے ♦

(۱۰،) حسینوں کا دشنۂ غمزہ یعنی آنکھوں کے اشاروں کا خنجر جان ہی لے کے چھوڑتا ہے۔ اور ان کے ناز و ادا کا تیر بھی بے پناہ ہوا کرتا ہے۔ فرض کیا۔ یہ تیرے ہی جلوہ رخسار کے اوصاف ہیں۔ تو پھر کوئی (اپنی جان کھونے کے لئے) تیرے سامنے آئے ہی کیوں۔ کیا اس کو اپنی جان نہیں چاہیئے ♦

(۱۱،) زندگی کی قید اور غم کی قید دراصل دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ (یعنی جب تک انسان زندہ ہے وہ مبتلائے غم ہی رہے گا) لہذا۔ انسان موت سے پہلے غم سے نجات کیوں کر پا سکتا ہے ♦

(۱۲،) ایک تو اس محبوب کو حسن خدا نے عطا کیا ہے۔ اس پہ یہ حسن ظن کہ جو شخص اسے دیکھتا ہے۔ اسی پہ وہ مفتوں ہو جاتا ہے۔ لہذا جب بوالہوس نے اسے دیکھا تو اس نے سمجھ لیا کہ میرے حسن پر وہ پیچ فریفتہ ہے۔ (حالانکہ بوالہوس کو عشق و فریفتگی سے کیا مطلب) تاہم دوست کو اپنے اس خیال پہ (کہ ہر شخص اس کا سچے دل سے عاشق ہو جاتا ہے) پورا پورا اعتقاد ہو گیا۔ تو وہ رقیب کی محبت کی آزمایش کیوں کرتا۔ لہذا رقیب کی اس طرح شرم رہ گئی ورنہ اس کا عشق سچا ثابت نہیں ہو سکتا ♦

(۱۳،) وہاں یعنی دوست کو اپنے عزو برغرت کا خیال اور ناز کا گھمنڈ ہے۔ وہ ہمیں اپنی محفل میں نہیں بلاتا۔ اور یہاں یعنی ہمیں اپنی وضعداری کے احتیاط سے یہ شرم کھائے جاتی ہے۔ کہ ہم کہاں انہیں رستے ہیں میں (یہ کام تو شرفا کا نہیں ہے) اس کا نتیجہ یہ کہ نہ ہم سے وہ ملے نہ وہ ہمیں بلا سکے) ♦

(۱۴،) اچھا وہ (ہمارا دوست) خدا پرست نہیں ہے یعنی کافر ہے۔ اور یہ بھی مانا کہ وہ کسی سے وفا نہیں کیا کرتا تو پھر جو شخص اپنا دین اور دل عزیز رکھتا ہے۔ (یعنی عشق میں ان کو کھونا نہیں چاہتا) وہ اس کی گلی میں کیوں جاتے۔ (حاصل یہ کہ عشق میں مذہب اور اپنی جان کا پاس نہیں کیا جاتا) ♦

(۱۵،) خستہ حال غالب کے بغیر بھلا ہمارے کونسے کام بند ہو گئے ہیں۔ یعنی کوئی تکلیف پیش نہیں آئی۔ تو پھر اس کے لئے۔ زار زار کہا رو ہیں۔ اور ہائے ہائے کیوں کریں ♦

غزل

۱۶، غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

۱۷، پرسش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

۷۱۸ رات کیوقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

۷۱۹ غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

۷۲۰ بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
اس کی تو خاموشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

۷۲۱ میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

۷۲۲ مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کسطرح
دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

۷۲۳ کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

۷۲۴ گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

۷۲۵ جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

---

(۷۱۶) غنچہ ناشگفتہ جب گلاب کا پھول نہ کھلا ہو۔ تو وہ کچھ سبز سبز پتیوں کے اندر چھپا رہتا ہے۔ ایسے ہی جب انسان کسی کا بوسہ نہ لیتا ہو۔ تو اس کا منہ گویا غنچے کی طرح بند ہوا کرتا ہے۔ مگر جب وہ بوسہ لینے لگے۔ تو غنچے کے کھلنے کی طرح کھل جاتا ہے۔ کہتا ہے۔ میں تجھ سے

بوسہ لینے کی نسبت پوچھتا ہوں۔ تو اس طرح غنچہ ناشگفتہ (پھول کی بند کلی) کو دور سے دکھا کر بوسے کا انکار نہ کر۔ ادھر میرے پاس آ یہ اشارہ کی باتیں چھوڑ اور اپنے منہ کو (کھول کر) بتا کہ کیا کہتا ہے۔ یا یہ بتا کہ بوسہ ہی دینا نہیں چاہتا۔

(۷۱۷) ہم اس سے دلبری (دل لینے) کی طرز کا حال کب پوچھیں بغیر اس کے بتانے ہی کے اس کے ہر ایک اشارہ مرکنایہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ (طرز دلبری یا) ادا یوں ہوا کرتی ہے۔

(۷۱۸) وہ رات کے وقت شراب پیے ہوئے۔ اور رقیب کو ساتھ لیکر خدا کرے آئے تو سہی۔ مگر اس طرح کہ شراب تو ضرور پی ہو۔ لیکن خدا کرے۔ کہ وہ رقیب اس کے ساتھ نہ ہو۔ (اس شعر کی نثر یوں ہے)۔

خدا کرے وہ یاں رات کے وقت مے پیے آئے۔ پر نہ خدا کرے یوں رقیب کو ساتھ لیے۔

(۷۱۹) میں نے اس سے جب یہ پوچھا۔ کہ رات رقیب کیسا تھ تمہاری کس طرح گذری۔ تو دیکھنا وہ کس طرح میرے سامنے آ بیٹھا۔ اور اس طرح (غصے میں بھر کے) دیکھنے لگا۔ (گویا اس کا مدعا یہ تھا۔ کہ میں اس سے رقیب کے بارے میں کچھ پوچھتا ہی کیوں ہوں)۔

(۷۲۰) وہ محفل میں چپ ہو کے بیٹھ رہا۔ تو اس کی خاموشی میں یہ اما بعضے اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ سب چپ ہو کے بیٹھیں۔ تو ہم اس کے روبرو بزم میں خاموش ہو کے کیوں نہ بیٹھیں۔

(۷۲۱) جب میں نے کہا کہ آپ کی بزم ناز و ادا (جو صرف

انہوں ہی کے لئے مخصوص ہونی چاہئے ۔) عیب سے خالی ہو ۔ تو بہتر ہے یہ بات سنکر اس ستم ظریف نے مجھ ہی کو اپنی محفل سے اٹھا دیا ۔ ستم ظریف سے مراد ایسا شخص کہ جس کی ہنسی یا ٹھٹھول میں کوئی تکلیف یا ظلم کا پہلو بھی نکلتا ہو ۔*

(۲۲ ے) جب مجھ سے دوست نے پوچھا کہ ہوش کس طرح جاتے ہیں ۔ تو میں تو بوجہ بے خودی و بے ہوشی چپ رہا ۔ مگر ہوا چلنے لگی ۔ اور اس نے بتا دیا کہ ہوش و حواس یوں اڑا کرتے ہیں *

(۲۳ ے) حسرت نقش پا ۔ پاؤں کے قدم کا نشان اس طرح زمین پر کھلا رہتا ہے ۔ کہ جیسے کسی بیہوش آدمی کا چہرہ ۔ گویا وہ حیرانی کی سی حالت میں ہے * آئینہ دار ۔ آئینہ کو رکھنے والا ۔ یعنی شکل دکھانے والا ۔ مجھ کو دوست کے کوچے میں رہنے کی وضع کب یاد تھی یعنی بھول چکا تھا ۔ کہ دکھ سے بار کے ، نقش پا نے آئینہ داری کے ایسی حیرت دکھائی کہ میں سمجھ گیا کہ اس کے کوچے میں اس طرح رہنا مراد یہ اس کے نقش پا یہ میں محو ہو گیا *

(۲۴ ے) اس شعر کا مطلب یہ ہے ۔ اگر تیرے دل میں اس بات کے دریافت کرنے کا شوق ہو ۔ کہ وصال کے بعد عاشق کا شوق کس طرح زوال پذیر ہوا کرتا ہے ۔ تو دیکھ کہ موج محیط (سمندر کی لہر) پانی میں کس طرح اپنے ہاتھ پاؤں مارتی ہے ۔ اور پھر فنا ہو جاتی ہے ۔ یعنی پانی کی لہر سمندر کے ساتھ وصل حاصل کرنے کے بعد کیونکر زوال پذیر ہو جاتی ہے ۔ اور اس کا شوق زائل ہو جاتا ہے *

(۲۵ ے) جو یہ کہے ۔ کہ ریختہ (یعنی قدیم وضع کا اردو ریختہ) کیونکر فارسی جیسے اعلیٰ ترین علم ادب کیلئے باعث رشک ہو ۔ تو اس کو غالب کا کہا ہوا کوئی شعر پڑھ کر سنا دے ۔ تو وہ قائل ہو جائے گا (کیونکہ ریختہ غالب بھی تو آدھی فارسی ہوا کرتی ہے) *

غزل

۲۶ ے حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

۲۷ ے بقدر حسرت دل چاہئے ذوق معاصی بھی
بھروں یک گوشہ دامن گر آب ہفت دریا ہو

۲۸ ے اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آ جاوے
کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

(۲۶ ے) اگر تیرا دل حسد کے سبب بجھا سا رہتا ہے ۔ (اور اس سے تو کچھ تنگ دل ہو گیا ہے) تو سرگرم تماشا ہو ۔ یعنی جا پھر دنیا کو دیکھ ۔ کہ پھر ممکن ہے تیری تنگ آنکھ کثرت نظارہ (یعنی طرح طرح کے اپنے سے بھی گئے گذرے لوگوں کے دیکھنے) سے کھل جائے ۔ اور تو تنگ نظر نہ رہے *

(۲۷ ے) گناہوں کا شوق بھی دل کی حسرت کے اندازے کے

مطابق ہونا چاہئے۔ چنانچہ (معاصی کے) سات دریاؤں کا پانی ہو، تو میں اس کو اپنے دامن کے ایک گوشے ہی میں لے لوں ✤

(۲۲۸) اگر میرا وہ سرو قد ناز کے ساتھ جھومتا جھومتا چلا آئے۔ تو باغ کی مٹی کی ہر کف یعنی مٹھی بھر مٹی جیسے کہ قمری ایک کف خاک ہوتی ہے۔ (بوجہ اپنی مٹیالی رنگت کے) مارے حسد کے آہیں بھرنے لگے ✤

غزل

۲۲۹، کعبہ میں جا رہا ہوں تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو

۲۳۰، طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

۲۳۱، ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سر نوشت کو

۲۳۲، غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

(۲۲۹) اگر میں کعبے میں جاکے رہتا ہوں تو مجھے طعن مت کرو۔ کیا میں اہل کنشت (بت خانے والوں) کا حق صحبت کبھی بھول سکتا

ہوں یعنی میری انہوں نے خوب مدارات کی تھی۔ یا کہ خانہ کعبہ بھی تو پہلے اہل کنشت ہی کی صحبت میں۔ یا انہی سے متعلق تھا ✤

(۲۳۰) اہل شرع عوام کو تحریک دلایا کرتے ہیں۔ کہ عبادت کرو تاکہ بہشت میں شراب اور شہد نصیب ہو۔ لہٰذا شاعر کہتا ہے کہ عبادت کرتے وقت "تاکہ شراب اور شہد کا کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ (یعنی یہ خیال کہ عبادت محض شراب و شہد کے لئے کی جائے۔ اور خاص خدا کے لئے نہ ہو) کوئی بہشت ہی کو لیکے دوزخ میں ڈالدے "تاکہ نہ بہشت ہوگا۔ اور نہ محض شراب و شہد کا لالچ دلا کے کسی سے خدا کی عبادت کا وعظ کیا جائے گا ✤

(۲۳۱) میں ثواب کی راہ و رسم یعنی درست راستے پر چلنے سے کس طرح منحرف نہ ہوں۔ میری تو سر نوشت (پیشانی) کے قلم ہی کو جس سے میری تقدیر ماتھے پر لکھی گئی تھی۔ ٹیڑھا قط لگا یا گیا تھا (تو ایسا قلم ہمیشہ ٹیڑھا ہی لکھے گا۔ مراد یہ کہ بدراہی میری قسمت میں لکھی ہوئی ہے۔ تو یہ دور کس طرح ہو) ✤

(۲۳۲) غالب مجھے اپنی کوشش سے کچھ ملے گا نہیں۔ مثلاً میری کھلیان کو اگر ٹڈی نہیں کھائے گی۔ تو برق خرمن سے ضرور یہ جل جائیگا (بہرحال میرے لئے وہی بیکار کوشش کرتا ہے) ✤

غزل

۲۳۳، وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو

کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

۳۴ ، چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

۳۵ ، ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہو

۳۶ ۔ پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غم اُلفت ہی کیوں نہو

۳۷ ، ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہو

۳۸ ، ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

۳۹ ، ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہو

۴۰ ، وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہو

۴۱ ، مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کوئی
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

۴۲ ، اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہو

(۳۳ ء ، ہم وارستہ یعنی اس خیال سے آزاد ہیں ۔ کہ تجھے

ہمارے ساتھ " کیا وجہ ہے کہ محبت نہ ہو " ہم تو کہتے ہیں ۔ کہ اگر محبت ہمارے ساتھ نہیں کرتے تو عداوت ہی کیجئے ۔ گویا ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(۳۴ ء) مجھ سے بوجہ ضعف عشق یا محبت کا خیال جاتے رہنے سے دوست کے خلا ملا رکھنے کا شوق بھی جاتا رہا ۔ خواہ دل پر محبت کا نقش یا کوئی اثر ہی کیوں نہ ہو اب یہ مجھ کو بار معلوم ہوتا ہے ؛

(۳۵ ء) مجھ کو تجھ سے یہ گلا شکوہ ہے ۔ کہ تو نے رقیب کا ذکر میرے سامنے کیوں کیا ۔ (تو کہیگا کہ یہ محض شکایت کے طور پر تھا ۔) تو ہر چند یہ شکایت ہی کے طور پر تھا ۔ مگر مجھے تو اس کا نام تک سننا بھی گوارا نہیں ہے ۔ چہ جائے کہ ذکر اس کا ؛

(۳۶ ء) کہتے ہیں کہ ہر درد کا علاج دریافت کر لیا گیا ہے ۔ اگر ایسا ہو ۔ تو پھر کسی ویسے علاج سے کیوں غم الفت کو جو ایک روگ ہے اچھا نہ کیا جائے ۔ (یعنی عشق کے مرض کا کوئی علاج ہی نہیں کبھی دریافت ہوا) ؛

(۳۷ ء) بے کسی سے مراد دوستوں یا رفیقوں وغیرہ کا کسی کے ساتھ کچھ ہمدردی نہ کرنا ۔ کہتا ہے میری بیکسی کے باعث جب کوئی عزیز میرے پاس نہ آیا ۔ تو گویا مجھ کو کسی سے معاملہ نہ پڑا ۔ لہذا میں اب تن تنہا ہوں ۔ اور اگر خجالت یعنی رسوائی بھی اٹھاتا ہوں ۔ تو اپنے ہی سے کہ اکیلا بیٹھ کر اپنے آپ کو کوسا کرتا ہوں ۔ کہ میں نے کیا کیا ۔ جو اسقدر بری حالت کو پہنچ لیا ؛

(۳۸ ء) آدمی اگر اکیلا بھی بیٹھا ہو تو طرح طرح کے خیالات اس کے دل میں گذرتے رہتے ہیں ۔ گویا وہ ان کی ایک انجمن ہے ۔ اسی طرح کہتا ہے ۔ کہ آدمی (اوروں سے توگیا) بجائے خود ہی ایک خیالات آنے جانے کی محشر یعنی ہجوم خیالات کا ایک وسیع میدان ہے ۔ اگر یہ خلوت (تنہائی) میں بھی ہو ۔ تو ہم اس کو ایک (خیالات کی) محفل تصور کرتے ہیں ◆

(۳۹ ء) دنیا میں کچھ حاصل کرنے کے لئے ۔ محنت اور ہنگامہ آرائی کرنی پڑتی ہے ۔ مگر شعرا اس کو پسند نہیں کرتے ۔ کیونکہ وہ دنیا سے بیزار ہوتے ہیں ◆

غالب فرماتے ہیں ۔ کہ ہمت (یعنی دنیا میں کوشش کر کے کچھ حاصل کرنا اس کی) ذلت کا نظارہ (گلہ) انفعال یا شرم ہے ۔ جو ہم کو دنیا کا کوئی مقصد حاصل کر کے اٹھانی پڑتی ہے ۔ (مراد یہ کہ آخر ناکامی ہی حاصل ہوا کرتی ہے) لہذا ۔ دنیا سے کچھ حاصل ہی نہ کیجئے ۔ یعنی عبرت تک بھی نہیں سمجھو حالانکہ سب کہا کرتے ہیں ۔ کہ حالات دنیا سے عبرت حاصل کرو) ◆

(۴۰ ء) عمر خواہ کسی طرح سے کٹے (نیکی یا بدی میں) اس کے جانے کا غم ضرور ہوا کرتا ہے ۔ کہتا ہے ۔ زندگی کی فرصت یا فراغت کے جاتے رہنے (مراد عمر کے گذر جانے) کا غم کبھی مٹ ہی نہیں سکتا ۔ خواہ عمر عزیز عبادت (جیسے نیک کام) ہی میں صرف ہوئی ہو ◆

(۴۱ ء) اس نشاوی شخص (مراد معشوق) کے دروازے

سے ہم اسے اسباب اٹھنے کے نہیں ۔ اس بات میں ہمارے سر پر خواہ قیامت تک کیوں نہ گذر جائے ۔ (یعنی اب ہم بھی آمادہ بہ فساد ہیں ۔ یا اس کی سب تکلیفیں اٹھایا کریں گے ۔ اور کہیں بھی جائیں گے نہیں) ◆

غزل

۴۳ ء قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو

۴۴ ء نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

۴۵ ء نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینہ میں جس نے خوں چکاں مژگان سوزن کو

۴۶ ء خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

۴۷ ء ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

۴۸ ء ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو

۴۹ ء خوشی کیا کھیت پہ میرے اگر سو بار ابر آوے

سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برقِ خرمن کو

۵۰۔ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے
مرے بتخانہ میں کعبہ میں گاڑو برہمن کو

۵۱۔ شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

۵۲۔ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

۵۳۔ سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

۵۴۔ مرے شاہ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

(۴۳ ۔) نواسنجانِ گلشن ۔ باغ میں گانے والے جانور ۔ قاعدہ ہے کہ کسی کا شور و شر کوئی پسند نہیں کرتا ۔ اسی طرح مرغ باغ آزاد ہوا کرتا ہے ۔ وہ قفس کو دیکھ کے ناخوش ہوتا ہے ۔ تو کہتا ہے ۔ کہ نواسنجانِ گلشن (باغ میں گانے والے جانور) ایک تو مجھے قفس میں دیکھ کر (گویا میرے قفس سے) ناخوش ہیں ۔ دوسرے اگر وہ میرے شور و شر کو بھی اچھا نہیں جانتے ۔ تو میرا کیا قصور کیا مر کے میں پنجرا ہی خالی کر دوں یعنی کیا اب میرا ہونا بھی ان کو ناگوار ہے ۔

لیکن میری یہ حالت جو گفتہ بہ ہے میرے بس کی نہیں ہے ۔ پھر گویا اس کا بڑا کیوں مناتے ۔

(۴۴ ۔) ہمدمی ۔ ہمدم ۔ رفیق ہونا ۔
اگر رقیب کے لئے دوست کا ہمدم ہونا کچھ آسان بات نہیں ہے ۔ بلانے نہ ہو ۔ میرے لئے کیا یہ رشک کم ہے ۔ کہ وہ دشمن رقیب میرے دوست کی رفاقت کا طالب ہے ۔ اے خدا تو نے میرے دوست کی آرزو میرے اس دشمن کے دل میں نہ ڈالی ہوتی ۔

(۴۵ ۔) جراحت سے مراد یہاں عمل جراحی یعنی زخم کی چیر پھاڑ کر کے اسے سینا ۔ میرے زخم کی چیر پھاڑ اور اس کے سیئے جانے پر جب جراح کی سوئی میرے سینے میں لگی ۔ تو سوئی کی پلکوں سے بھی خون کے قطرے ٹپک پڑے ۔ مگر (اے ظالم) تیری آنکھ سے تو ایک آنسو تک نہ نکلا ——— (زخم سیتے وقت سوئی سے قطرۂ خون ضرور ٹپک پڑتے ہیں ۔ اور درد بھی ہوا کرتا ہے ۔ جو حالت قابل رحم ہوتی ہے) ۔

(۴۶ ۔) خدا میرے ان ہاتھوں کو شرماوے (یعنی یہ ایسے کام کرنے سے باز آجائیں) کہ کبھی یہ میرے گریبان کے ساتھ کشاکشی کرتے یعنی کھینچ گھسیٹ کر کے انہیں پھاڑ ڈالتے ہیں ۔ اور کبھی میرا دوست مجھ سے رخصت ہونے لگے تو اس جانان کے دامن کو بری طرح کھینچ لیتے ہیں ۔

مراد ۔ یہ میرے ہاتھ مجھے کشمکش میں رکھتے ہیں ۔ خدا یا یہ باز ہوں ۔ اگر وہ معشوق پاس رہے ۔ نہ گریبان پھاڑوں نہ یار کا دامن ۔

(۴۷ ۔) ابھی ہم مقتل (یا قتل گاہ) کا دیکھنا کچھ معمولی بات سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ (یہ قبل از وقت ہے ۔ اور ہزار ہا عشاق کا قتل ہونے والا ہے) اور ہم نے ابھی خون کی ندی میں تیرے گھوڑے کو تیرتے ہوئے

نہیں دیکھا ؞

(۷۴۸) میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا چرچا ہوا۔ تو لوہے کو لوہے کے خواص یا مواد نے یہ تحریک دلائی۔ کہ وہ میرے پاؤں کی زنجیر بننے کے لئے بیتاب ہوگیا۔ یعنی وہ شوق سے ایسے کام پر رضا مند ہوگیا۔ مراد یہ کہ لوہا جو بے جان شئے ہے۔ وہ بھی مجھ دیوانے کو مقید دیکھنا چاہتا ہے ؞

(۷۴۹) اگر میری کھیتی پیدا ہوگئی ہے۔ تو اس سے مجھے کیا خوشی خواہ سو بار اس پہ ابر نمودار ہو۔ (کہ جس سے بارش کی امید بندھے) میں تو اس ابر کا نتیجہ یہ خیال کیا کرتا ہوں۔ کہ ابھی سے بجلی میرے کھلیان یا اس کھیتی کے حاصل کو ڈھونڈ رہی ہے۔ مراد یہ کہ مجھے اپنی محنت سے دنیا میں کچھ نفع نہیں ہونے کا ؞

(۷۵۰) اگر کوئی شخص اپنی وفاداری پر (خواہ وہ بت پرستی ہی کے شوق میں ہو) استواری (یعنی مضبوطی) کے ساتھ قائم رہے۔ تو ایسے شخص مراد برہمن بت پرست کو وہ جب مرے تو (بوجہ استحکامت) گو وہ بت خانے میں مرا ہے۔ وہاں سے اٹھا کر کعبے میں لے جا کے گاڑنا چاہئے۔ (کیونکہ اس میں وفاداری یا استحکامت جیسی بہترین خوبی ایمان موجود ہے ؞

(۷۵۱) میری تقدیر میں دوست کے ہاتھ سے شہادت پانی لکھی تھی۔ اس لئے یہ مجھ کو خود ہی سوجھی تھی۔ کہ جہاں کہیں تلوار دیکھتا ہوں۔ وہاں خود ہی اپنی گردن قتل کے لئے جھکا دیتا تھا ؞

(۷۵۲) اگر میں دن کو کسی لیٹرے کے ہاتھ سے نہ لوٹا جاتا تو سبب

مال لٹا کر۔۔۔۔۔۔ یوں رات کو مدہوش ہو کے نہ سوتا۔ اب چوری کا خوف (بوجہ مال پاس نہ ہونے کے) جاتا رہا۔ تو اس لئے۔ اپنے لیٹرے کے حق میں دعا کرتا ہوں (کہ وہ سلامت رہے) ؞

(۷۵۳) سخن کیا کہہ نہیں سکتے ؟

یعنی کیا ہم شعر نہیں کہہ سکتے۔ کہ جواہرات کی تلاش کریں۔ (گویا یہ اشعار ہی ہمارے لئے جواہرات ہیں اسی طرح) کیا ہم جگر نہیں رکھتے کہ کسی کان کو جا کے کھودیں (یعنی یہی ہمارا جگر۔ وہ خون جمع رکھتا ہے۔ کہ جس سے خونِ جگر کھا کے ہم شعر کہتے ہیں۔) اور یہ ہمارا جگر کان جواہر ہے ؞

(۷۵۴) میرا بادشاہ جو سلیمان کے مرتبے والا ہے۔ سلیمان اس لئے کہا کہ حضرت سلیمان اور سب بادشاہوں پہ درجہ فضیلت رکھتے تھے۔ اور ہمارا بادشاہ ظفر جس کی یہاں تعریف کی گئی ہے۔ وہ بھی ایک درویش صفت آدمی تھا) اس کو اسے غالب۔ فریدون۔ جمشید۔ کیخسرو اور داراب و بہمن وغیرہ ایرانی بادشاہوں سے کیا نسبت ہے یعنی وہ تو محض دنیوی بادشاہ تھے۔ اور ظفر دینی بادشاہ بھی ہے ؞

غزل

۷۵۵ وہ سوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں

رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

۷۵۶ دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

۷۵۷ بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

۷۵۸ مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

۷۵۹ اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

۷۶۰ ہے جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغ چمن کے پاؤں

۷۶۱ شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں

۷۶۲ غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

---

(۷۵۵) اس چاندی کے ایسے بدن رکھنے والے محبوب کے پاؤں جو میں اس کے پاؤں کا دھوون پینے کے لئے دھوتا ہوں۔ تو وہ میری ضد سے لگن کے باہر پاؤں نکال کے دھوتا ہے (اس لئے کہ اس کے پاؤں کا دھوون میرے لئے لگن میں جمع نہ ہو بلکہ زمین پر ہی بہہ جائے) حاصل شعر یہ کہ وہ میرا مخالف ہے +

(۷۵۶) مرزا غالب کے زمانے میں کسی سادہ کو بنانے کیلئے دہلی میں کہا کرتے تھے۔ آپ کے پاؤں پڑتے یا بالفاظ دیگر آپ کے پاؤں دھو کے پیجئے۔ اب کہتے ہیں۔ اس کا پاؤں پاؤں لیجئے۔ مصنف کہتا ہے۔ کہ فرہاد نے مرتے وقت ایک عیار آدمی کو پیرزن سمجھ کے جان دے دی تھی لہذا فرہاد کے پاؤں پڑتے یعنی اس کو خوب بنایا گیا ہے۔ مگر افسوس اس پیرزن ہی کے جو فرہاد کے پاس آئی تھی کیوں پاؤں نہ ٹوٹ گئے۔ کہ وہ فرہاد کے پاس آ کر اسے فریب نہ دے سکتی۔ یہ قصہ یوں ہے۔ کہ فرہاد نے وصال شیریں کے حاصل کرنے کو حسب وعدہ نہر کھود ڈالی تو ایک مرد بصورت پیرزن فرہاد کے پاس آیا۔ اور رو رو کر کہا کہ شیریں تو اچانک مر گئی۔ فرہاد سے صبر نہ ہو سکا اور اپنا تیشہ سر پہ مار کے فوراً مر گیا +

(۷۵۷) ہم رہزن سے بہت بھاگے تھے۔ (اب اس نے پکڑ لیا تو) اس کی سزا یہی ہے کہ قید ہو کر رہزن کے پاؤں دبا رہے ہیں۔ یعنی ہم تھکے ماندے تھے۔ چاہئے تھا کہ کوئی ہمارے پاؤں دباتا۔ اب الٹا اس لٹیرے کے پاؤں دابنے پڑے۔ مگر یہ سزا اس لئے ہمیں ملی کہ ہم نے لٹیرے کو بہت دوڑایا اور آخر بڑی محنت سے ہمیں وہ پکڑ پایا +

(۷۵۸) میں مرہم کی تلاش میں جو اس قدر دور دور پھرا ہوں۔ اس لئے اس خستہ تن کے پاؤں اپنے زخمی بدن سے بھی زیادہ فگار ہیں۔ یعنی پھٹ گئے ہیں + (مراد یہ۔ کہ ہم اپنے درد کا چارہ کرتے ہیں۔ تو ہمارا دکھ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے) +

(۷۵۹) اللہ رے بھی قابل تعجب ہے۔ ہمارا وہ صحرا گردی کا ذوق شوق کہ مرنے کے بعد کفن میں بھی ہمارے پاؤں خود بخود ہل رہے ہیں +

(۷۶۰) فصلِ بہار میں پھول اس کثرت سے اُمڈ پڑے یا ہر طرف آگے کو پھیل گئے ہیں۔ کہ کوئی جانور باغ کا کہیں اڑتا ہے۔ تو اس کے پاؤں ان پھولوں میں الجھ پڑتے ہیں +

(۷۶۱) وہ رات کو کسی کے پاس کہیں خواب میں چل کر نہ آیا ہو۔ کہ اس نازک بدن بت کے آج پاؤں دُکھتے ہیں۔ (عجیب مبالغہ کیا ہے) +

(۷۶۲) غالب میرے کلام میں ایک خاص لطف کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ایک شیریں سخن بادشاہ کے پاؤں دھو کر پیتا ہوں۔ (یعنی اس کا نوکر اور جاں نثار ہوں) جب اس کے پاؤں کا دھوون پیتا ہوں تو اس کی شیریں سخنی کا میرے کلام پہ بھی ایک اثر ہوتا ہے +

غزل

۷۶۳ واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

۷۶۴ اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

(۷۶۳) دوست کو دل کی دھڑکن سے تکلیف ہوئی تو میں شرمسار ہوں۔ کہ کہیں میری آہ ہی کی یہ تاثیر نہ ہو +

(۷۶۴) تو اپنے آپ کو نہیں دیکھتا یعنی آئینے میں منہ نہیں دیکھتا

جب تک کہ آئینہ کسی نخچیر و شکار کی آنکھوں کا نہ بنایا ہو تو اپنا یہ ظلم تو دیکھ کہ کس قدر کاٹتا ہے +

غزل

۷۶۵ واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

۷۶۶ دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو

۷۶۷ ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

۷۶۸ جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

۷۶۹ رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

۷۷۰ سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

۷۷۱ دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدار اہم ہے ہم کو

۷۷۲ تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو

ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
۷۷۳ لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
۷۷۴ مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو
۷۷۵ لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

(۷۶۵) پیے ہم - پا بہم ، متواتر - وہاں سے مراد دوست کی محفل یا دوست کی گلی ہوا کرتی ہے ۔

کہتا ہے - دوست کے کوچے میں پہنچ کر ہمیں جو بار بار غشی آتی ہے - (اور اس سے زمین پر سربسجود ہو جاتے ہیں) تو اس کا مطلب یہ ہے چونکہ دوست اپنے کوچے میں صد رہ یعنی سینکڑوں طرف کو نکل کر رہگیر ہوتا ہے - اب ہم اسی طرح صد رہ (ہر طرف) زمین بوس قدم - یعنی اس کے ایک ایک قدم کے نشان پر جو وہاں نظر آتا ہے - یہ آہنگ زمین بوس کرتے یعنی اس کی زمین قدم چومنے کا ارادہ رکھتے ہیں - یہ ارادہ ہماری متواتر غشی اور سرسجود ہونے ہی سے پورا ہو سکتا ہے - (قدم کے معنی نشان قدم کے بھی ہیں) ۔

عام شارحین غالب نے اس شعر کے معنی یہ لکھے ہیں کہ ہم کو کوچہ یار میں غشی اس لئے آتی ہے - کہ زمین پہ گر کر ان پاؤں کو چومیں کہ جنہوں نے ہم کو کوچہ یار تک پہنچا دیا ۔

سوال یہ ہے کہ شعر میں جب کسی کے نقش قدم کا اشارہ نہیں ہے - تو پھر کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ قدم سے مراد عاشق ہی کے نقش قدم ہیں - حالانکہ کوچۂ یار میں عاشق سے قبل صدہا مرتبہ معشوق ہی ہر طرف آیا جایا کرتا ہے - لہذا نقش قدم محبوب ہے ۔

(۷۶۶) ہم - بہ معنی ساتھ ۔

میں اپنے دل کو اور میرا دل مجھ کو اس کی وفا میں محویت میں مبتلا رکھتا ہے ہم دونوں کو ایک ساتھ گرفتار یا مبتلا رہنے کا کس قدر شوق ہے ۔

(۷۶۷) نقش پے مور - چیونٹی کے پاؤں کا نقش یعنی اس کا نقش قدم ۔

اب ضعف سے چیونٹی کا نقش قدم بھی میرے لئے طوق گردن ہے (یعنی کمزور ہو کر اسقدر نحیف ہو گیا ہوں) بھلا مجھ کو تیرے کوچے سے بھاگ جانے کی طاقت کہاں حاصل ہے ۔

(۷۶۸) جان کر تغافل کرنا - لگاوٹ کرنا - جب کوئی عورت یہ سمجھے کہ فلاں آدمی اس کے ساتھ عشق و محبت کر سکتا ہے - اس سے اپنی آنکھیں دانستہ پھیر لے - تو یہ گویا ایک چیلنج ہوتا ہے - کہ وہ آدمی اس کی طرف مائل ہو - لیکن اگر وہ دیدہ چاک کر کے کسی آدمی کی طرف دیکھے یا ایک غلط انداز نظر سے تو یہ نظر کچھ امید افزا نہیں ہوا کرتی لہذا مصنف کہتا ہے - کہ تم جان کر مجھ سے اگر تغافل کرو یعنی دانستہ اپنی آنکھیں پھیر لو - تو مجھے تم سے کسی چیز کی امید بھی ہو - لہذا یہ غلطی سے یا اتفاقاً تمہاری نظر مجھ پر پڑ جاتا تو میرے لئے ایک زہر کا حکم رکھتی ہے گویا میری طبع کے ایک خلاف بات ہے ۔

(۷۶۹) ہمطرحی ۔ ہم نوائی ۔ ایک طرح کے گیت گانا ۔
تیغ دودم ۔ دو دھار کی تلوار یا جیسا ان بارہ تلوار ۔

مرغ سحر کا صبح کے وقت میرا ہم نوا ہونا یعنی میری ہی طرح شور و پکار کرنا ۔ میرے لئے باعث رشک ہے ۔ پھر اس کی غم ناک بانگ (آواز) کے اثر سے ایک درد پیدا ہوتا جیسے کہ میری فریاد سے پیدا ہوتا ہے ۔ وہ بھی مجھ کو رشک دلاتا ہے ۔ تو گویا اس مرغ سحر کا نالہ میرے لئے (رشک کی) ایک دو دھاری والی تلوار ہے (یعنی میں اس سے سخت رشک کھاتا ہوں) ۔

(۷۷۰) میں نے ان سے اپنے سر کے قلم کئے جانے کے وعدے کے متعلق (بغرض تصدیق) دوبارہ پوچھا ۔ تو انہوں نے ہنس کر کہا کہ تیرے سر کی ہم کو قسم ہے ۔ یعنی اس جملے کا ایک تو یہ مطلب کہ وہ قسم کھا کر کہنے لگے ۔ کہ ضرور سر قلم کریں گے ۔ دوسرے معنی یہ کہ ان کو اس بات کی قسم ہے ۔ یعنی وہ ہرگز ایسا نہیں کریں گے دوست کا ہنسنا ایسی بات پر اس لئے یہاں لکھا ہے ۔ کہ اس نے ایک ذو معنی جواب دے دیا ۔ کہ سننے والا خوش بھی ہو اور ناخوش بھی) ۔

(۷۷۱) شعلہ خون کو روشن ۔ شعلے کی طرح بھڑکتا ہوا اور بارونق بتایا کرتے ہیں ۔ لہذا کہنا ہے ۔ ہم نے اپنے دل کو جو خوناخون کر دیا ہے ۔ تو اس کی وجہ لاچاری یہ ہے ۔ کہ ہم کو اپنی رشک آلودہ (پُر غم) آنکھوں کی بے رونقی کا یہ خیال ہے ۔ کہ آنسو تو معمولی پانی کی طرح بے رنگ و بے رونق ہوا کرتے ہیں ۔ ان میں

دل خون خالص مل جائے گا ۔ تو رونق سی نظر آنے لگی ۔ (اہم مراد ضروری) ۔

(۷۷۲) تم وہ نازک طبع آدمی ہو ۔ کہ ایک ذرا سی بات گوارا نہیں کر سکتے ۔ مثلاً ہم روتے روتے چپ ہو گئے ۔ تو ابھی وہ ہمارا رونا تمہارے دماغ میں سمایا ہوا ہے ۔ اور اس ہماری خاموشی کو بھی رونا جلانا سمجھ رہے ہو ۔ ادھر ہم ایسے عاجز ۔ کہ ستم تو ستم تمہارا تغافل یعنی بے پروائی بھی تو بھی ہمارے لئے ایک ستم کا پہاڑ بن گئی ہے ۔ تو اتفاق کیجئے ہو ۔

(۷۷۳) مرزا غالب جب کلکتہ گئے تھے ۔ تو اپنی وراثت کے جھگڑے میں سخت پریشان ہو رہے تھے ۔ لہذا جب آپ رستے میں لکھنؤ اترے پڑے ۔ تو مجبوراً اس شعر میں اپنی اسوقت کی پریشان حالی کو نظم کرنا پڑا ۔ یعنی ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

سچ پوچھو تو دلی جب سے برباد ہوئی اور اس کی بربادی پر ہر ایک دہلوی شاعر نے ایک دردناک مرثیہ لکھا ۔ تو غالب کا دل بھی اس واقع سے ہمیشہ متاثر رہا کرتا تھا ۔ لیکن چونکہ لکھنؤ ایام غدر کے بعد فوراً ہی ایک بارونق شہر بن گیا تھا ۔ اہل دلی زیادہ تر وہاں سیر و تماشے کے لئے آیا جایا کرتے تھے ۔ خصوصاً آخر عہد سلطنت میں واجد علی شاہ کا زمانہ تو وہاں دن عید رات شب برات کا سماں تھا یہاں اس کی طرف غالب کا ایک اشارہ سا کر دینا گویا ایک تاریخی واقعہ ہے اور یہ شعر بالکل صاف ہو گیا ہے ۔ زیادہ تشریح کی کچھ حاجت

نہیں ہے +

(۷۷۴) پھر اس شعر میں جو اوپر کے دردناک شعر کے بعد لکھا ہے مرزا غالب فرماتے ہیں۔ کہ لکھنؤ میں تو ہمیں شوق سیر لے گیا تھا۔ کہ جیسے بیان ہوا۔ مگر وہ اوپر کا سفر منقطع سلسلہ شوق نہیں ہے۔ یعنی ابھی ہمیں اور مقامات کی سیر کا بھی شوق ہے۔ لہٰذا سیر نجف کربلا جانے اور طوافِ حرم یا خانہ کعبہ کے گرد پھرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ (دراصل ایک مسلمان جب اپنی دنیوی ناکامی سے بالکل اکتا جاتا ہے۔ تو پھر وہ کعبہ یا کربلا کا عزم کیا کرتا ہے۔ لہٰذا یہ شعر بھی اسی سلسلے میں مرزا صاحب کی پریشان حالی کا اظہار کرتا ہے) منقطع سلسلہ شوق یعنی شوقِ سیر کا خاتمہ نہیں ہوا ابھی اور مقامات کی سیر بھی کرنی ہے +

(۷۷۵) اے غالب ہمیں ایک توقع (امید) کہیں کھینچے کھینچے لئے جاتی ہے۔ لہٰذا کرم کے لفظ کا کاف ہمارے لئے شوق کے وسیع راستے کی ایک پگڈنڈی ہے۔ مراد یہ کہ "کرم" کے لفظ میں اگر کاف نہ ہو۔ تو باقی صرف رم رہ جاتے۔ تو گویا وہ "ک" ہی مرزا صاحب کو کلکتے کی طرف کھینچے لئے جا رہا ہے + (جیسا کہ اوپر تشریح کی گئی ہے)۔ ورنہ کرم کا رم تو آپ کو یہ تحریک دلاتے کہ نا بھئی۔ اس معاملے سے دور ہی بھاگنا اچھا۔ دراصل وظیفہ کے لینے کے لئے مرزا غالب کلکتے گئے تھے۔ یہ اسی توقع کرم کا قصہ ہے +

غزل

۷۷۶ تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

۷۷۷ بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

۷۷۸ کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

۷۷۹ ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

۷۸۰ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

۷۸۱ سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے کہ تیری جلوہ گاہ ہو

۷۸۲ غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب اور میرا بادشاہ ہو

(۷۷۶) تم کو رقیب سے جو رسم و راہ ہو۔ اس کی بابت تو تم ہی جانو (یعنی مجھے اس سے کیا تعلق) ہاں مجھ کو بھی اگر تم تھوڑا بہت پوچھتے رہو (یعنی مجھ سے بھی ذرا تعلق خاطر رکھو) تو اس میں کیا گناہ ہوگا یعنی کوئی بری بات نہیں۔

(۷۷۷) مواخذۂ ۔ یہاں مراد جواب دہی ہے

اگر میرا قاتل رقیب ہے ۔ اور تم اس کے شہادت دینے والے ہو ۔ اور کہو گے کہ قاتل موصوف نے مجھے قتل نہیں کیا ۔ تو پھر تم بھی جواب دہی سے اس طرح نہیں بچ سکو گے ۔ یعنی ثابت کرنا پڑے گا ۔ کہ اگر رقیب نے مجھے قتل نہیں کیا تو پھر کس نے کیا ۔ (جس کا فیصلہ یہی ہوگا کہ یا تو رقیب نے قتل کیا یا تم نے یا تم دونوں نے ملکر تو پھر تم ان سب صورتوں میں ضرور با لضرور دھر لئے جاؤ گے) ۔

(۷۷۸) میں نے مانا کہ ظاہری اوصاف کے لحاظ سے تم بشر نہیں ہو ۔ بلکہ دیا ند اور سورج ہو ۔ تو کیا بلحاظ ذاتی اوصاف وہ بھی یعنی ماہ و آفتاب بھی بیگنہ (عاشق) کے مارنے والے اور اس (عاشق) کا حق نہ پہچاننے والے ہیں ۔

(۷۷۹) ان کے نقاب سے ایک تار باہر نکلا ہوا ہے ۔ لیکن اسکا رشک یا بدگمانی سے مرتا ہوں ۔ کہ کہیں یہ کسی رقیب کی نظر کا تار تو نہیں ہے ۔ کہ ان کے نقاب میں جا کر رہ گیا ہے ۔

(۷۸۰) جب میکدہ ہم سے چھٹ گیا ۔ یعنی مے کشی کے لئے یہ پرواہ نہ رہی ۔ کہ ضرور شراب خانے ہی میں جا کر شراب پیئیں ۔ (گویا ہم اس قدر بے باک رند ہو گئے) تو پھر کسی خاص جگہ مے نوشی کی قید کیا جہاں جا ہا پی لی ۔ حتیٰ کہ مسجد ۔ مدرسہ ۔ اور خانقاہ کو بھی نہ چھوڑا ۔ وہاں بھی شراب پی کے اٹھے ۔

مراد یہ کہ کھلا ڈلا آدمی رندی کرنے میں انتہا سے زیادہ بے باک ہوا کرتا ہے ۔

(۷۸۱) بہشت کی جو مبالغہ آمیز تعریفیں ہم سنتے ہیں ۔ وہ سب بجا و درست لیکن خدا کرے کہ وہاں تو ہی موجود ہو ۔ اور بہشت گویا تیرے ہی جلوے دکھانے کی ایک جگہ مقرر کی گئی ہو ۔ تاکہ وہاں ہم جا کے تیرا دیدار کر سکیں ۔

(۷۸۲) اگر غالب بھی دنیا میں نہ رہے ۔ تو اس سے کچھ ایسا نقصان یہاں واقع نہیں ہوگا ۔ البتہ یہ دنیا جب تک موجود ہے ۔ (اس کے فائدے کے لئے) اے خدا ۔ میرا بادشاہ ضرور زندہ و سلامت رہے ۔ اپنی کسر نفسی اور بادشاہ کی عظمت کا اظہار کیا ہے ۔

غزل

۷۸۳ گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

۷۸۴ ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

۷۸۵ ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیوں کر ہو

۷۸۶ نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

۶۸۷ الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

۶۸۸ جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

۶۸۹ ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

۶۹۰ غلط نہ تھا ہمیں خط پہ گمان تسلی کا
نہ مانیں دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

۶۹۱ بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

۶۹۲ مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور
فراق یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

---

(۶۸۳) اب وہ بات نہیں رہی یعنی وہ حالات جاتے رہے کہ جب ہم ان سے گفتگو کا موقع نہیں پاتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ ان سے اپنے دکھڑے کو کیوں کر روئیں۔ لو اب ہم نے ایک بار ان سے سارا اپنا حال کہہ دیا مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ تو اگر دوبارہ وہی کہیں تو کیا خاک نتیجہ برآمد ہوگا — مراد۔ نہ سننے والے پہ اثر کیا ہو ﴾

(۶۸۴) ہمارے دماغ میں "وصال" اس فکر کا نام ہے کہ جب بیٹھے ہم بیٹھے ہوئے یہ سوچا کرتے ہیں۔ کہ آہ۔ اس سے وصال ہو تو کیوں کر ہو۔ اور اگر یہ وصال حاصل نہیں ہوگا۔ تو ہم کہاں جائینگے

(گویا دونوں صورتوں میں مایوسی ہی مایوسی ہے) ﴾

(۶۸۵) حصول وصال کے لئے ہم ان سے کشمکش کرنے یعنی ان کی طرف ہاتھ بڑھانے کا قصد تو کرتے ہیں۔ مگر ادب مانع آتا ہے۔ کہئے کیا کریں۔ اس طرح ادھر وہ محبوب بھی اقرار وصال کے متعلق گومگو سے کام لیتا ہے۔ (یعنی کبھی اقرار کبھی انکار) کیونکہ اس کو حیا مانع ہے۔ تو کہئے کہ اس معاملے میں کیا کیا جائے۔ ہر طرح مشکل ہے ﴾

(۶۸۶) معشوق سے کہتے ہیں۔ کہ اگر تمام بتوں یعنی معشوقوں کی خو بو تمہارے ہی جیسی ہو۔ تو تمہیں (انصاف سے) کہو کہ پھر تم پرستوں (بتوں کے عاشقوں) کا گزارہ کیوں کر چلے گا ﴾

(۶۸۷) تم اگر آئینہ دیکھتے ہو۔ تو (اس میں اپنا عکس یعنی اپنے ہی جیسا کوئی حسین دیکھ کے رشک سے) اپنے ہی ساتھ الجھ پڑتے ہو فرض کرو تمہیں جیسے دو ایک حسین اگر اس شہر میں اور موجود ہوں تو کیونکر ہو۔ یعنی تم پھر کیا کرو۔ (کر بیٹھے کیا۔ بس خوب دنگا فساد ہوگا) ﴾

(۶۸۸) جس شخص کو میرے جیسا روز سیاہ نصیب ہو۔ تو جہاں رات تو تا سیاہ ہوا کرتی ہے۔ (اس کا دن اور رات دونوں برابر ہو جائیں گے۔) لہذا وہ اگر رات کو دن ہی نہ تصور کرے تو اور کیا اس کو کہئے ﴾

(۶۸۹) طنز سے کہتا ہے۔ کہ ہمیں پھر ان سے کوئی امید ہو۔ اور ان کو ہماری قدر ہو۔ یہ دونو غلط باتیں ہیں۔ کیونکہ جب وہ ہماری بات تک کو نہیں پوچھتے۔ تو پھر بھلا ان سے کوئی امید۔ اور ان کو

ہماری قدر کس طرح ہو سکتی ہے ۔ مراد یہ کہ وہ ہمارے قدر دان نہیں تو پوچھیں کیسے ۔

(۷۹۰) ان کا خط آیا۔ اس خط پر ہمیں اپنے دل کی تسلی کا گمان رکھنا کچھ غلط نہ تھا۔ بلکہ قرائن سے بالکل صحیح تھا۔ مگر ہماری دیدار جو یعنی اس کا دیدار طلب کرنے والی ہیں آنکھیں ایک اتنی سی بات سے مطمئن نہ ہوں تو کیا۔ کیا جائے ؟ آخر ان کا دیدار ہی کر کے اب ہماری آنکھیں تسلی حاصل کریں گی) ۔

(۷۹۱) کوئی بتائے کہ اس پلک کو دیکھ کر مجھے کیوں کر قرار آئے جب کہ وہ پلک نہیں ہے ۔ بلکہ نشتر ہے کہ رگ جان میں گڑا ہوا ہے گویا اس کی نظر قہر سے تسکین کیا ہو گی ۔

(۷۹۲) غالب مجھے کچھ جنون تو نہیں ہے کہ بے قرار ہوں بلکہ بقول حضور (یعنی بہادر شاہ ظفر کے اس مصرعے کے مطابق) "فراق یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو" ۔

آخر الذکر مصرعہ ظفر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے ۔ غالباً یہی مصرعہ طرح ہو گا ۔ کہ جس پر مصنف نے بھی طبع آزمائی کی ہے ۔

غزل

۷۹۳ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغان کیون ہو
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زبان کیون ہو

۷۹۴ وہ اپنی خو نہ چھوڑین گے ہم اپنی وضع کیون چھوڑین
سبک سر بن کے کیا پوچھین کہ ہم سے سرگران کیون ہو

۷۹۵ کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازدان کیون ہو

۷۹۶ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستان کیون ہو

۷۹۷ قفس مین مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیان کیون ہو

۷۹۸ یہ کہہ سکتے ہو ہم دل مین نہین ہین پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل مین تمہین تم ہو تو آنکھون سے نہان کیون ہو

۷۹۹ غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیان کیون ہو

۸۰۰ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسمان کیون ہو

۸۰۱ یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہین
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحان کیون ہو

۸۰۲ کہا تم نے کہ کیون ہو غیر کے ملنے مین رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہان کیون ہو!

۸۰۳ نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنون سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہربان کیون ہو

(۷۹۳) کسی کو دل دے کے کوئی یعنی عاشق ہو کر نوا سنج فغان یعنی شور و فغان کی آواز نکالنے والا کیوں ہو؟

مراد یہ کہ عشق میں رونا چلانا نہیں چاہیے۔ لہذا جب دل ہی سینے میں نہ رہے۔ تو پھر زبان بھی منہ میں نہ رہے۔ کیونکہ عشق میں دل کھو کے زبان بھی گویا کھو دینی چاہیے۔ (کیونکہ عاشقی صبر طلب ہے)۔ اس میں تم کو گلہ مناسب نہیں +

(۷۹۴) وہ اپنی عادت (غرور) کی، نہ چھوڑینگے۔ ہم اپنا رنگ ڈھنگ کیوں ترک کریں۔ اور سبک سر بن کے یعنی ہلکاپن اختیار کر کے اُن سے یہ کیوں پوچھیں۔ کہ تم ہم سے ناراض کیوں ہو۔ (گویا اپنی خودداری کو قائم رکھنا چاہیئے +)

(۷۹۵) میرے غم خوار نے مجھے رسوا کر دیا۔ خدا کرے کہ اس محبت کو آگ لگے۔ کیونکہ جو شخص غم کی تاب ہی نہیں لا سکتا۔ وہ میرا رازدان یعنی رفیق غم و غم خوار کیسے بن گیا۔ (کہ وہ میرا غم دیکھ کر رو پڑا تو میرے عشق کا حال سب کو معلوم ہو گیا۔ اور اس سے مجھے رسوائی حاصل ہوئی) +

(۷۹۶) جب ہم کو اس عشق میں بجز سر پھوڑنے کے اور کچھ حاصل ہی نہیں ہونے کا۔ تو پھر اے سنگدل تیرے ساتھ یہ وفا کیسی اور یہ کہاں کا عشق کہ صرف تیرے ہی سنگ آستان یعنی دہلیز پر اپنا سر پھوڑا کریں۔ مطلب یہ کہ ہم جہاں جائیں یہ بات کہ اپنا سر پھوڑیں ہر جگہ حاصل ہو سکتی ہے

(۷۹۷) اے ہمدم۔ یعنی دوست۔ تو مجھ سے جب کہ قفس میں بند ہوں (اور اپنے آشیانے اور چمن سے بہت دور) چمن کی سرگذشت

کہتے ہوئے کیوں اتنا ڈرتا ہے۔ ہاں جس آشیانے پر کہتا ہے۔ کہ کل بجلی گری تھی۔ یہ کیا ضرور ہے۔ کہ وہ میرا ہی گھر گھونسلا ہو۔ (مطلب یہ کہ ایک قیدی جانور کا آشیانہ باغ میں بجلی سے جل گیا ہے۔ کوئی اور مرغ اس کے پاس آکر جھجکتے ہوئے یہ خبر سنانا چاہتا ہے۔ مگر رک جاتا ہے تو وہ مرغ اسیر اپنے گھونسلے کے تباہ ہو جانے کا شک کر کے کہتا ہے۔ اے دوست + گری ہے جس پہ کل بجلی ــــ الخ) +

(۷۹۸) یہ کہہ سکتے ہو۔ اس پہ زور دے کے پڑھو۔ تو مطلب شعر یہ ہوگا۔ کہ کیا تم یہ بات کہہ سکتے ہو کہ ہم دل میں نہیں ہیں۔ (یعنی ضرور ہو) تو پھر یہ بتاؤ کہ جب ہمارے دل میں تم ہی تم سمائے ہو۔ تو پھر آنکھوں سے چھپے ہوئے کیوں ہو۔ اس شعر میں اسی محبوب حقیقی کی طرف اشارہ ہے۔ کہ جو سب سے نہاں ہے مگر سب کے دل میں بھی موجود ہے +

(۷۹۹) تم یہ شکایت مجھ سے کرتے ہو۔ کہ "تیرا جذبہ دل ہم کو کھینچتا ہے" یہ بات غلط ہے۔ ذرا سوچ کر فیصلہ دو کہ اس میں کس کا جرم ہے۔ یعنی تم اگر اپنے کو نہ کھینچو۔ مراد ہم سے تم اگر نہ کھینچو (یعنی الگ تھلگ رہنا پسند نہ کرو) تو پھر یہ کشاکش کیوں ہو۔ (کہ اُدھر تو تم کھنچے رہتے ہو ادھر ہم جذب دل کی کھینچاوٹ سے کام لیتے ہیں۔ یہ دونوں کششیں برابر ہو گئیں۔ پھر قصور کس کا اور شکوہ کیا) +

(۸۰۰) دوست کو فتنہ قرار دے کے کہتا ہے۔ کہ تم جس کے دوست ہوئے۔ پھر (اس کی خانہ بربادی کے لئے) آسمان اس کا دشمن کیوں بنے۔ تمہارے جیسا فتنہ پرداز اس شخص کی خانہ تباہی کے لئے

کچھ کم نہیں ہے ÷

(۸۰۱) اگر یہی آزمانا ہے۔ تو پھر ستانا کسے کہتے ہیں۔ کیونکہ جب میرے دشمن کے تم دوست بن گئے تو پھر میرا امتحان تم کیوں کرتے ہو ضرور اس لئے کہ یوں ستانا منظور ہے۔

(۸۰۲) تم نے کہا کہ غیر کے ملنے میں رسوائی ہی کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں۔ کچھ رسوائی نہیں ہے۔ تم بجا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو۔ ذرا پھر تو کہنا۔ کہ ہاں رسوائی کیوں ہو۔ (یہ انداز کلام سن کے دوست ٹھٹک میں پڑ جاتا ہے۔ کہ شاید یہ عجیب مجھ کو کچھ بنا تا ہے۔ اور وہ تاڑ جاتا ہے کہ میرا اصلی مطلب یہ ہے۔ کہ غیر کے ملنے میں ضرور رسوائی ہے)÷

(۸۰۳) اے غالب کیا تو طعنے دے دے کر اپنا کام بنانا چاہتا ہے۔ دیکھ۔ بنیز وہ دوست۔ تیرے بے مہر (یا ظالم) کہنے سے تجھ پر مہربان کبھی نہ ہوگا ÷

غزل

۸۰۴ رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو

۸۰۵ بے درو دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

۸۰۶ پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار

اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۸۰۴) یہ قطعہ دنیا سے بیزار ہو کے کہیں نکل جانے اور ان تنہا رہنے سے متعلق ہے۔ دراصل مرجانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ کہ کہتا ہے۔ اب ایسی جگہ جا کر رہیئے۔ جہاں کوئی نہ ہو۔ اور نہ کوئی ہمارا ہم زبان ہو نہ ہم سے کوئی بات تک کرنے والا ہو۔ (جیسے قبر کی رہائش)÷

(۸۰۵) ایک گھر ایسا بنا ئیں کہ بے درو دیوار ہو (گویا جنگل میں جا رہیں کہ جہاں نہ در نہ دیوار) اور نہ کوئی ہمارا ہمسایہ ہو اور نہ پاسباں (کیونکہ جب گھر ہی نہیں ہوگا۔ تو پاسباں کس کا ہوگی)÷

(۸۰۶) اگر بیمار پڑیں تو کوئی تیمار داری نہ کرے۔ اور اگر مرجائیں تو کوئی ہمیں رونے پیٹنے کو نہ آسکے ÷ (یعنی عالم عدم میں جا ہوں)÷

غزل

۸۰۷ از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

(۸۰۷) دل و دل ایک فارسی محاورہ ہے۔ جس کے معنی بیقراری یا اضطراب کی سی حالت میں ہونا ہے۔ بجز کاشی سے

دنبالِ چشم او دل و دل کردہ ایم ما
وز گریہ راہ را ہمہ گِل کردہ ایم ما

یعنی اس کی آنکھوں کے پیچھے ہم اضطراب و بے قراری کی حالت میں ہیں۔ چنانچہ اپنے آنسوؤں سے رستے کو تر کر کے ہم نے اس کو کیچڑ مٹی بنا دیا ہے۔

آئینہ کے ایک معنی تو عیاں اور ظاہر ہونے کے ہیں۔ دوسرے آئینہ بہ معنی حیرانی۔ طوطی سے مراد۔ انسان ہے۔ اور یہاں طوطی کا استعارہ بہ لحاظ آئینے کے کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس مشہور فارسی شعر میں استعارہ کیا گیا ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگویم

مصنف کہتا ہے کہ از مہر تا بہ ذرہ یعنی قدرت کی ہر ایک چیز دل و دل ہے۔ یعنی گردش یا اضطراب و بیقراری کی حالت میں ہے اور یہ آئینہ ہے۔ یعنی صاف عیاں ہو رہا ہے۔ لہذا طوطی یعنی انسان کو چھیوں طرف (شش جہت۔ اوپر نیچے۔ شمال۔ جنوب۔ مشرق۔ مغرب۔) سے ایک آئینہ یعنی سامانِ حیرت و پریشانی درپیش و مقابل ہو رہا ہے۔

چونکہ انسان بھی قدرت میں شامل ہے۔ اور حسب ذرہ۔ ذرہ قدرت کا بیقرار ہے۔ یعنی ہر وقت گردش میں ہے۔ جیسے کہ صاف ظاہر ہے تو گویا انسان خود بھی ساز و سامانِ حیرت میں گھرا ہوا ہے۔

دوسرے معنی یہ کہ مہر سے ذرے تک دل ہے۔ اور دل یہ آئینہ

یعنی آئینہ سے مراد دل لی جاتی ہے۔ تو گویا از مہر تا بہ ذرہ آئینہ ہے۔ لہذا طوطی کو ہر طرف سے آئینہ ہی مقابل نظر آتا ہے۔ پس وہ ہر طرف اپنا ہی جلوہ منعکس پاتا ہے۔ یعنی دنیا میں جو کچھ اسے نظر آتا ہے۔ وہ گویا اسی کے خیال کا عکس ہوا کرتا ہے۔ یا جیسے اس کا دل ہوتا ہے۔ ویسی ہی دنیا اسے دکھائی دیتی ہے۔

غزل

۸۰۸ ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

۸۰۹ ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہم رہاں نہ پوچھ

(۸۰۸) میرے غم کدہ یعنی گھر کی ہر در و دیوار بوجہ تباہی اور بربادی کے ڈھ چکی ہے۔ اور اس پہ سبزہ زار پیدا ہو گیا ہے۔ اب جس اجڑے باغ کی بہار یہ ہو۔ پھر اس کی خزاں کا کیا پوچھنا وہ تو قیامت ہو گی یعنی تباہ حال۔

(۸۰۹) رستے کی دشواری اور اس پہ اپنے ہمراہیوں کے ظلم کا حال نہ پوچھ۔ یہی جی چاہتا ہے۔ کہ اپنے ہمراہیوں کو چھوڑ دوں اور لاچار یہ حسرت اٹھاؤں کہ آہ میں بیکس ہوں۔ اور اس راہ (یعنی دنیا میں) میرا کوئی ساتھی

ہی نہیں ہے۔ اور اس حالت سے بہتر ہے۔ کہ ساقی ظلم کرنے والے اور لٹیرے ہوں) بیکس، سے مراد وہ شخص جس کا کوئی غمخوار یا ساقی نہ ہو۔

غزل

۸۱۰ صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے

۸۱۱ ہے سنگ پر برات معاش جنون عشق
یعنی ہنوز منت طفلاں اٹھائیے

۸۱۲ دیوار بار منت مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیے

۸۱۳ یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے
یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھائیے

(۸۱۰) اگر پلکیں اٹھائیں یعنی نظر اٹھا کے دیکھیں۔ تو سینکڑوں جلوے سامنے آ جائیں۔ مگر یہ طاقت ہی کہاں ہے۔ کہ اس کے جلوے کا احسان اٹھائیے۔ یعنی خدا ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس کے جلوے کو دیکھنے کی تاب کون لائے۔ اور یہ احسان اٹھانے بہ سخت مشکل امر ہے۔

(۸۱۱) برات۔ وہ چٹھی یا کاغذ جس سے کسی کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ برات معاش۔ گذران کی تنخواہ کی چٹھی۔

چونکہ جنون عشق کے گذران کی تنخواہ پتھر پر منحصر ہے۔ ابھی لڑکوں کا یہ احسان اٹھانا ہے۔ کہ وہ پتھر مارا کریں۔ اور دیوانے کی گذر اوقات ہو۔ مطلب یہ کہ حالت جنون میں کچھ دنوں اور لڑکوں سے پتھر کھائے۔

(۸۱۲) دیوار جو جھکی نظر آتی ہے۔ تو اس کا باعث یہ ہے کہ مزدور کے احسان کے بوجھ سے دب کر خم کھا گئی ہے۔ اے خانہ خراب کسی کا دنیا میں احسان نہیں اٹھانا چاہیئے۔ گویا دیوار نہ بنتی تو مزدور کی ممنون احسان نہ ہوتی کہ جس سے وہ خم ہو گئی۔

(۸۱۳) کوئی شخص خود بخود ہنس نہیں سکتا۔ کہتا ہے۔ یا تو رقیب کے ساتھ مل کر مجھ پر چھپ چھپ کے ہنسنا چھوڑ دیں۔ یا مختصر یہ کہ رقیب سے زیادہ تپاک سے مل کر میرے زخم رقابت کو بڑھانا۔ اور پھر اسی سے مل کر میری کھلی اڑانا کہ جس سے میرے زخم رقابت کی رسوائی ہو۔ چھوڑ دیجئے۔

غزل

۸۱۴ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے

۸۱۵ عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہئے

۸۱۶ دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہئے

۸۱۷ سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

۸۱۸ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

۸۱۹ ہے رنگ لالہ وگل ونسرین جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

۸۲۰ سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بیخودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

۸۲۱ یعنی بحسب گردش پیمانہ صفات
عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیئے

۸۲۲ نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے جو بات چاہیئے

(۸۱۴) مرزا شراب خوار تھے۔ ایک مسجد کے پاس گھر بنا کے رہنے لگے تھے۔ لہذا کہتے ہیں۔ کہ مسجد کے زیر سایہ شراب خانہ ضرور چاہیئے۔ جس طرح اے قبلہ حاجات یعنی اے شیخ یا واعظ۔ معبودوں کے پاس آنکھ ہوا کرتی ہے۔ معبون سے طاق مسجد مراد ہے۔ اور آنکھ کو خرابات سے نسبت دی کہ اسی کی بدولت کسی کو دیکھ کر انسان عشق وخرابات میں مبتلا ہوا کرتا ہے۔ یا آنکھ بدمست ہوا کرتی ہے +

(۸۱۵) آپ بھی ایک اور شخص پہ عاشق ہوگئے (اور میری

رنج تکلیفیں اٹھاتے رہیں) آخر اس ظلم کا جواب مجھ پر کرتے ہیں۔ کچھ بدلہ تو آپ کو ملنا چاہیئے تھا۔ مکافات۔ بدلہ)

(۸۱۶) مافات۔ فوت ہو چکا۔ یا گذر چکا ہو۔ اے آسمان اب میرے اس حسرت پسند دل سے جو ہمیشہ کیا کرتا ہے۔ کچھ تو انصاف کر۔ اُن کو کھو چکا ہوں۔ تو اُس کی تھوڑی بہت تلافی کر +

(۸۱۷) ہم نے اُن حسینوں کے لئے مصوری یعنی تصویر کشی کا کام سیکھا ہے۔ کیونکہ ان سے ملاقات کے لئے کچھ تو ذریعہ ہونا چاہیئے۔ (یعنی تصویر کھینچنے کے بہانے اُن کے ہاں چلے جایا کریں گے۔ اور اُن کی دید بہ آسانی کر لیا کریں گے)

(۸۱۸) کس روسیاہ (گنہگار) کی شراب پینے سے غرض نشاط یعنی خوشی کا حاصل کرنا ہے۔ بلکہ مجھے تو اس سے جو ایک طرح کی بے ہوشی اور خود فراموشی سی ہو جاتی ہے۔ وہ مقصود ہے۔ طعن شراب نوشی کا دفیعہ کیا ہے۔

(۸۱۹) لالہ۔ پوست کا پھول۔ گل۔ گلاب کا پھول۔ اور نسرین۔ سیوتی کا پھول۔ ان سب کے رنگ جدا جدا ہیں۔ (یہ پھول چونکہ بہار میں کھلتے ہیں) لہذا ہر طرح سے بہار کے ہونے کا ثبوت ملنا چاہیئے۔ یعنی ہر پھول کی کیفیت جدا جدا ہے۔ اور یہی بہار ہے۔

(۸۲۰) جب شراب کا نشہ چڑھ جائے۔ تو شرابی کو اپنا سر شراب کے مٹکے کے پاؤں پر رکھ دینا چاہیئے۔ جیسے کہ مناجات یا خدا سے دعا مانگتے وقت منہ کعبے کی طرف کر لیا کرتے ہیں۔ (خم شراب گویا قبلہ و کعبہ ہے) مراد شرابی

کو خم شراب کا احسانمند اور شکرگذار ہونا چاہیے۔

(۸۲۱) بحسب گردش۔ مطابق گردش یا تبدیلی کے۔ پیمانہ صفات صفتوں کا اندازہ۔ مثلاً پہلے اوصاف یا درجہ کم ہو۔ پھر بتدریج بڑھتا چلا جائے مئے ذات۔ یہاں مراد خدا کی ذات۔ عارف کو ہمیشہ خدا کی ذات وصفات پر مست ہونا چاہیے۔ اور یہ مستی خدا کے پیمانۂ اوصاف کی گردش کے حسب حال ہونا چاہیے۔ کہ جس قدر اُس کے اوصاف کا وقوف یا اُس پر وجدان حاصل ہو اُسی قدر اس اُس کی ذات پرمست وبیخود ہونا چاہیے۔

(۸۲۲) غالب اصل ہی سے فروع کو نشوونما ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ جو بات پیدا ہو۔ اُس کو خاموشی ہی سے نکلنا یعنی نشوونما حاصل کرنا چاہیے۔ (اصل مثل بیج کے اور فروع مانند درخت کے تصور کرنا چاہیے۔)

غزل

(۸۲۳) بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

(۸۲۴) رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

(۸۲۵) خیال مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے ایک صیدِ زبوں وہ بھی

۸۲۶ نہ کرتا کاش نالہ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزایش دردِ دروں وہ بھی

۸۲۷ نہ اتنا برشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے ایک موجِ خوں وہ بھی

۸۲۸ مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجیے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

۸۲۹ مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل وشکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

---

(۸۲۳) میری عاجزانہ بساط (حیثیت یا وسعت) میں صرف ایک دل تھا۔ وہ بھی ایک خون کا قطرہ تھا۔ پس اب وہ بھی باندازِ چکیدن (ٹپکنے کی صورت میں) اپنے سر کو (بوجہ غم) جھکائے ہوئے رکھتا ہے۔ گویا اس قدر عاجز ہوں۔

(۸۲۴) تکلف برطرف۔ مختصر حال یہ۔ یا اصل حال یہ۔
ہم اس شوخ سے کچھ عرصہ کے لئے محض بہ تکلف (اوپرے دل سے) آزردہ رہے۔ (حالانکہ ہمارا دل یہ نہیں چاہتا تھا) اب تکلف برطرف یا اصلی حقیقت یہ کہ ہمارا اس دوست سے ناراض ہونا بھی گویا ایک طرح کا جنون تھا کیونکہ ایک عاشق معشوق سے ناراض ہی کیسے ہو سکتا ہے: تاوقتیکہ فاترالعقل نہ ہو۔

(۸۲۵) میرے دام تمنا میں یعنی اور بہت سی تمناؤں میں جو میرے دل میں مقید ہیں۔ ایک موت کی خواہش بھی ہے۔ جو ایک خراب حال شکار کی طرح ہے۔ (یعنی اس سے زیادہ اچھی تمنائیں اور بھی رکھتا ہوں کہ جن کے سامنے یہ خوار وخستہ حالت میں ہے۔) پس ظاہر ہے کہ میرے آزردہ دل کو ایک ایسی (خستہ حال) خواہش مرگ کیا تسلی دے سکتی ہے۔ گویا موت سے بھی زیادہ خرابیوں کی آرزو رکھتا ہوں۔

(۸۲۶) کاش! میں نالہ و فریاد نہ کرتا۔ اے ہمدم۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ وہ نالہ بھی میرے دل کے اندر کے درد کی زیادتی کا باعث ہوگا۔

(۸۲۷) اپنے ظلم کی تلوار کی کاٹ پر اس قدر فخر نہ کرو۔ کیونکہ میری بیزاری و بیتابی کے دریا میں وہ بھی ایک خون کی لہر ہے۔ یعنی عشق میں مجھے ایسے ایسے رنج بیسیوں پہنچ چکے ہیں۔ ایک آپ کی تلوار کی کاٹ کیا۔ یہ تلوار ایسی ہے جیسے ایک دریا کی لاکھوں لہروں میں سے ایک لہر۔

(۸۲۸) آسمان کی نسبت شعر کہا کرتے ہیں۔ کہ وہی انسان کی بدقسمتی کا ذمہ وار ہے۔ کیونکہ جفا شعار ہے۔ لہذا کہتا ہے۔ کہ عیش و عشرت کی شراب کی اس آسمان کے ساقی سے کیا آرزو کیجے۔ چند ایک جام واژگوں (الٹائے ہوئے پیالے شراب کے) وہ لئے بیٹھا ہے۔ (اور چونکہ جام واژگوں ہیں۔ مثل آسمان کے اُلٹے ہوئے وہ بھی خالی ہیں) مراد یہ کہ ہماری قسمت میں عیش کی شراب ہی نہیں تو عیش کی آرزو کیا کریں۔

(۸۲۹) اے غالب میرے دل میں وصال کی آرزو بھی ہے۔ اور فرقت کا گلہ بھی۔ خدا وہ دن کرے کہ دوست سے تقرب حاصل ہو۔ تو میں اس سے وصال کی آرزو بیان کروں۔ اور فراق کا گلہ شکوہ بھی پیش کروں۔

غزل

۸۳۰ ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

۸۳۱ ہے دور قدح وجہ پریشانی صہبا
یکبار لگا دو خم مے میرے لبوں سے

۸۳۲ رندان در میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

۸۳۳ بیداد وفا دیکھ کے جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

(۸۳۰) بتوں کی محفل میں ہماری بات چیت ہمارے ہونٹوں سے گویا ناراض ہو رہی ہے۔ (یعنی ہم بولنا چاہتے ہیں تو ہونٹ کام نہیں دیتے۔) لہذا ایسے خوشامد طلبوں سے (جیسے کہ ہمارے ہونٹ ہیں۔ کہ رعب حسن کی وجہ سے بیکار ہو گئے ہیں۔) ہم اب تنگ آ گئے ہیں۔

دوسرے معنی۔ خوشامد طلب معشوق جو ناز کیا کرتے ہیں۔ اُن کی خوشامد کرتے کرتے ہم عاجز ہو گئے۔ یہ بزم حسیناں میں ہم سے آزردہ لبوں یعنی خفگی سے بات کرتے ہیں۔

تیسرے معنی یہ کہ معشوقوں کی محفل میں وہ کیسے اپنے آزردہ لبوں سے (یعنی بہ لہجہ خفگی و بیزاری) یہ بات کہتے ہیں۔ کہ "تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے" مراد یہ کہ ان کے سوا دوسرے معشوق ان سے بھی کچھ زیادہ طالب ناز نظر آئے۔ تو وہ رشک سے خفا ہو کے ان سے یوں کہنے لگے۔ کہ ایسے خوشامد طلب ہمیں بڑے برے معلوم ہوتے ہیں۔

(۸۳۱) دور قدح۔ شراب کے پیالے کا محفل میں باری باری سب کے آگے پھرایا جانا۔ صہبا۔ شراب۔ شراب کا دور شراب کی پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ تم شراب کا بھرا مٹکا ہی یکبارگی میرے منہ سے لگا دو۔ تو شراب کو پریشان یعنی تقسیم ہو کے سب کے آگے جانا نہ پڑے۔

(۸۳۲) طرف ہونا۔ یہاں مراد منہ لگنا۔ اے زاہد شراب خانے

سے دروازے کے رند بہت گستاخ ہوتے ہیں۔ خبردار ان بے ادبوں کے منہ نہ لگنا۔ ورنہ خراب ہوگا۔ یا طرف ہوکے یعنی ان کی مخالفت کرکے تکلیف میں نہ پڑنا۔

(۸۳۳) جان کو لبوں سے ربط ہونا۔ مراد جان ہمیشہ لبوں پر رہنے سے ان کے ساتھ الفت رکھنے لگی۔ ہر چند میری جان لبوں پہ رہتے رہتے اُن سے محبت رکھنے لگی تھی۔ لیکن تیرے بیدادِ وفا (یعنی ہم وفا کرتے تھے اور تم ظلم اس) کو دیکھکر ہماری جان جاتی رہی۔ مراد یہ کہ جان اگرچہ لبوں پر رہتی تھی۔ یعنی بہ حالت نزع اور اس کی تکلیف کو وہ برداشت کئے ہوئے تھی مگر تیرا بیدادِ وفا اس قدر زبردست تھا۔ کہ بس جان کا خاتمہ ہی کر دیا۔

۸۳۴ تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

۸۳۵ غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

(۸۳۴) وہ ہماری نسبت کچھ ذکر جب کہیں ہوتا ہے۔ تو سُن تو لیتے ہیں تاکہ ہمیں اُن سے یہ شکایت نہ ہو۔ کہ وہ بات بھی نہیں سنتے۔ لیکن پھر خود کچھ ہمارا ذکر نہیں کرتے۔ گویا اُن کا سننا نہ سننا برابر ہے۔

(۸۳۵) غالب تیرا حال ہم اُن کو سُنا دیں گے۔ وہ (ایسا قابلِ رحم حال سنکر) تجھ سے اپنے پاس بلائے۔ یہ اجارہ (ٹھیکہ) نہیں کرتے۔

اس کا ذمہ نہیں لیتے۔

۸۳۹ گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

(۸۳۹) ہمارے گھر میں پہلے ہی تباہی ہو چکی تھی۔ پھر تیرا غم یعنی غمِ عشق اور خانہ بربادی کیا کرتا؟ ہم اپنے گھر کو سرِ نو تعمیر یعنی ساز و سامان سے آراستہ کرنے کی جو حسرت دل میں رکھتے تھے۔ وہی اب بھی دل میں موجود ہے۔

غزل

۸۴۰ غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

۸۴۱ کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

۸۴۲ لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

۸۴۳ اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

۸۴۴ ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

۸۴۵ لگد کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی

۸۴۶ کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

(۸۴۰) سر اُٹھانے کی فرصت پانا۔ ایسی ہی ایک عبارت ہے۔ جیسے کہ سر کھجلانے فرصت پانا۔ مراد، بہت کم فرصت آرام کرنے کو حاصل ہونا۔ فلک مراد ظالم۔ جفا شعار۔ دیکھنا۔ کسی غرض سے کسی کی طرف توجہ کرنا۔ فلک کا دیکھنا اُس کا ظلم و ستم کرنے کی نیت سے متوجہ ہونا۔ تقریب۔ موقع۔ یاد آنا۔ دھیان پڑنا دنیا کے کاروبار کے غم سے اگر کسی وقت تھوڑی سی فرصت ملی بھی (یعنی اول تو ملتی ہی نہیں) تو تیرا دھیان پڑنا۔ گویا جفا شعار آسمان کے بغرض جور و ستم میری طرف متوجہ ہونے کا ایک موقع تھا۔ حاصل شعر یہ کہ دنیا کے کاموں سے فراغت ہوئی۔ تو تیری طرف جو متوجہ ہوا (یعنی حسن و عشق کے معاملات میں پڑا۔) تو آسمان کو مجھ پر ظلم کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور اُس نے بے انتہا ظلم کئے۔

(۸۴۱) اُس کافر نے اب قسم کھائی ہے۔ کہ جو کاغذ اس کی نظر پڑ یگا۔ وہ فوراً جلا دیگا۔ تو پھر میرا خط وہ کب پڑھیگا۔ وہ تو اُسے بھی فوراً جلا دیگا۔ لہذا اس کا مضمون اسکو کیونکر معلوم ہوگا۔ کہ اس میں کیا لکھا ہے۔

(۸۴۲) پرنیاں۔ دیبا۔ ایک ریشمی کپڑا۔ آگ کے شمع کا دیبا میں لپٹا جانا آسان ہے۔ لیکن دل میں غم عشق کی جلن چھپانے کی حکمت بہت مشکل چیز ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

(۸۴۳) انھیں اپنے زخمی عاشقوں کو دیکھنا منظور رہتا۔ اسی لئے وہ گلاب کے لال لال پھولوں کی سیر کرنے کو گھر سے نکلے تھے۔ اس بہانے میں جو چالاکی اِلتفات نے برتی ہے فدا اُس کو دیکھنا تو۔

(۸۴۴) اِلتفات۔ مہربانی۔ ناز بمعنی ادا۔ یہاں اِلتفاتِ ناز در اصل ناز التفات ہے۔ یعنی مہربانی کی ادا۔ وہ کیا معشوق کا اپنے عاشق کے پاس آنا۔
حل۔ ہماری یہ سادگی تھی کہ ہم تیری (تشریف آوری کی) ادا پر مرگئے۔ ورنہ تیرا آنا۔ کچھ آنا نہ تھا۔ بلکہ فوراً ہی چلا جانا (تمہید جانے کی مراد جانے کا آغاز کرنا یعنی آتے ہی چل دینا۔)

(۸۴۵) لگد۔ لات۔ لگد کوب۔ لات کی ٹھوکر۔ مراد ٹھوکر۔
حل۔ میری طاقت جو (ظالم) معشوقوں کے ناز اُٹھانے کی ضامن (ہوئی) تھی۔ اب حوادثات زمانہ کی ٹھوکر کی برداشت نہیں کر سکتی۔ یعنی ہم عشق کا غم اُٹھائے ہوئے تھے۔ اب معمولی حادثات کے متحمل نہیں ہوسکتے

(۸۴۶) اوضاع۔ جمع وضع۔ دستور۔ طریقے۔ ابنائے زماں۔ زمانے کے لوگ۔ خوبی سے یہاں مراد بدی ہے۔ اور طنزاً خوبی لکھا ہے۔
حل اے غالب ہم زمانے کے لوگوں کے طریقوں کی خوبی (یہاں مراد برائی) کیا بیان کریں۔ جس کسی سے ہم نے نیکی کی۔ اور بارہا نیکی کی اسی نے ہمارے ساتھ بدی کی۔

غزل

۸۴۷ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

۸۴۸ اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

(۸۴۸) آرزو خرامی۔ کسی آرزو کو دل میں لے کے کوشش کرنا۔ حاصل پیداوار۔ ڈوبی ہوئی اسامی۔ وہ کاشتکار جس سے لگان تک وصول ہونے کی بھی امید نہ رہے۔

حل۔ اے آرزو خرامی (یا کسی نفع کی خاطر کوشش کرنا) تو حاصل یعنی اصل پیداوار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھ۔ کیونکہ میرا دل بوجہ افراط گریہ کے ایک ڈوبی ہوئی اسامی ہے۔ کہ جس کے سبب پیداوار تو کیا لگان تک کی وصول ہونا ناممکن ہے۔ یعنی جوش گریہ دل ہی کو بہا دیگا۔ تو پھر دل کی آرزو کیا بار آور ہوگی۔

(۸۴۸) لغت۔ داغ ناتمامی۔ شمع جب خود بخود جل کے بجھ جائے تو گویا وہ تمام ہو گئی۔ اور اگر کوئی اُس کو بجھا دے تو "ناتمام" رہی۔ لہذا "داغِ ناتمامی" سے مراد ناقص یا کسی امر میں ناتمام و غیر مکمل رہنے کا داغ۔

حل۔ میں بھی اُس شمع کی طرح کہ جسے کوئی بجھا دے اُن دل جلے لوگوں میں سے ہوں۔ کہ جن میں ناتمامی کا داغ ہو۔ یعنی وہ حد تکمیل تک نہ پہنچے ہوں۔

غزل

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتوسے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

۸۵۱ حال آنکہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے

کی اُس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

۸۵۳ کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشور ہندوستان ہے

۸۵۴ ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے بارِ اعتماد وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

(۸۴۹) لغت۔ بیضۂ مور۔ چیونٹی کا انڈا۔ جو بہت ہی چھوٹا ہوا کرتا ہے۔ ہم مظلوموں کی دنیا کس قدر تنگ ہے۔ کہ جس کا آسمان ایک چیونٹی کا انڈا ہے۔ یعنی ہمیں کسی طرح کی کوئی وسعت یہاں حاصل نہیں ہے۔ کہ فراغت پا سکیں۔ یا چیونٹی کا انڈا بھی ہمیں آسمان بن کے ستاتا ہے۔

(۸۵۰) لغت۔ ایک مشہور آیت ہے۔ لا تحرّک ذرۃ

الا باذن اللہ یعنی خدا کے حکم کے سوا ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ **حل شعر۔** کل کائنات (دنیا و مافیہا) تیرے ہی ذوق و شوق میں حرکت کر رہی ہے۔ جس طرح کہ آفتاب ہی کے عکس سے ایک ذرے میں جان یعنی حرکت اور زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔

(۸۵۱) لغت۔ سیلی۔ ضرب۔ خارا۔ سنگ خارا۔ سخت پتھر یعنی سخت پتھر کی چوٹ یا حوادثات۔ شیشے یا شراب کے پیالے کو اپنا دل یا جاندار چیز فرض کر کے کہتا ہے۔ کہ میرا شیشہ خالی ہے۔ مگر غافل دو[ست] کو یہ وہم اٹھا ہے۔ کہ میں اس میں لالہ رنگ (سرخ رنگت کی) شراب بھر کے پی رہا ہوں۔ حالانکہ شیشہ مذکور سخت پتھر کی چوٹ یا حوادثات سے لالہ فام یعنی زخمی ہو رہا ہے۔ اور جب شیشہ ہی چکنا چور ہو [گیا] تو اس میں شراب کہاں۔

(۸۵۲) لغت "کی گرم جا" یعنی جگہ گھیر کے اس میں مقیم ہوا۔ کیونکہ بیٹھنے ہی سے کوئی جگہ گرم ہوتی ہے "

حل۔ اس نے اہل ہوس کے سینہ میں جگہ لی۔ مگر اہل ہوس کے دل میں عشق کی حقیقی آگ نہیں ہوتی۔ لہذا اس (دوست) کو ایک ایسا ٹھنڈا مکان کیوں پسند نہ آئے۔ مراد یہ ہمارا محبوب آتش عشق کے حقیقی جذبہ کی کچھ قدر نہیں کرتا۔ وہ رقیب سے مانوس ہے۔

(۸۵۳) لغت۔ منہ میں زبان ہونا۔ مراد خوب چلتی ہوئی زبان یا کسی کی خوب قلعی کھولنا۔
مولانا حالی نے اس شعر کے تعلق سے منہ میں زبان ہونے کے دو

[مع]نی لئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اس قدر لسان ہیں۔ کہ تم کو قائل کر سکتے ہیں۔ دوسرے [یہ] کہ ہم اپنی زبان سے بوسے کو بھی چکھ سکتے ہیں۔ بیشک زبان ہر ایک میٹھی کڑوی [وغیرہ] چیز کو چکھ سکتی ہے۔ لیکن کسی محبوب کی گالوں پر بوسہ دیا جائے۔ تو [ا]س پر جب کوئی لذت وار شے چپک کر نہیں جاتی تو پھر اس بوسے کا چکھنا [کی]ا معنی رکھتا ہے۔ ممکن ہے مولانا موصوف کے یہ دوسرے معنی جو یادگار [غ]الب میں درج ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہ آئے ہوں۔

حل۔ یہ کیا صریح جھوٹ ہے۔ یعنی کیا خوب تم نے رقیب کو بوسہ [ن]ہیں دیا۔ بس چپ رہو (یعنی کچھ زیادہ عذرداری نہ کرو) ہمارے منہ میں [بھ]ی زبان ہے۔ کہ اس سے وہ تمام راز عیاں کر دیں۔ کہ غیر کا بوسہ لینا پایہ [ث]بوت تک پہنچ جائے۔

(۸۵۴) لغت۔ دیوار یار۔ یہاں بادشاہ دہلی کو اپنا دوست اور [تم]ام ہندوستان کا تاجدار ظاہر کرنے کے لئے۔ اس کے گھر کی دیوار کو [ا]نا دیوار یار کہتا ہے۔ اور اس کی مدح سرائی کرتا ہے۔

حل۔ وہ جو دوست کی دیوار کے سایہ تلے بیٹھا ہوا ہے۔ (اور وہ [د]وست جو بادشاہ ہی ہے۔ اور وہ دیوار اس کے قلعہ ہی کے اندر کی [ا]ئی دیوار ہے۔) وہ تمام ملک ہند کا حکمران ہے۔

(۲) دوسرے معنی۔ جو شخص دوست کی دیوار کے سایہ تلے بیٹھ [گی]ا وہ بھی گویا سایہ یزداں ہو کے فرمانروائے ہند بن گیا۔ گویا دوست [کی]ا یہ دیوار بھی ہما کے ایسے اوصاف رکھتا ہے۔

(۸۵۵) لغت۔ ہستی کا اعتبار مٹنا۔ یقین نہ کرنا کہ یہ بات [ف]ی الحقیقت اسی طرح ہے۔ یعنی موجود کو غیر موجود بتانا۔

حل۔ تم نے خونِ جگر ہمیں اس قدر کھلوایا کہ جگر بھی کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہو کے صرف ہوگیا۔ اگر ذرہ سا رہا۔ تو شکل داغ کے جو اس جگر کا پتہ دیتا ہے۔ مگر چونکہ غم بہت تباہ کار ہوا کرتا ہے۔ اس سے موجود کو بھی تباہ ماننا پڑتا ہے۔ اب کون یقین کرے کہ وہ جو ایک ٹکڑا جگر کا رہ گیا ہے اور داغ تھا ہے۔ وہ داغ نہیں ہے بلکہ جگر ہی ہے۔

(۸۵۶) حل۔ غالب ہم اس بات سے خوش ہیں۔ کہ دوست ہم پر نامہربان ہے۔ (یعنی ظلم کرتا ہے) اور جبکہ وہ ظلم کرتا ہے۔ تو ہم کو اس کے ظلم سہنے کا موقع ملتا ہے۔ تو یہ وفاداری ہے۔ لہٰذا جب یقین ہوا کہ وہ ہم پر ضرور ظلم کرے گا۔ اور ہم اس کے بالمقابل وفا۔ تو گویا ہمیں اعتماد وفاداری خود اس قدر ہوگیا۔ یعنی پختہ یقین ہوگیا ہے۔ کہ ہمیں اس کے ساتھ بکثرت وفاداری کرنے کے موقعے ملتے رہیں گے۔ یا دوست کو بوجہ اپنے یقینی ظلم کے ہماری اس سے وفاداری کا پورا اعتبار دل میں قائم ہوگیا ہے۔

غزل

۸۵۷ دردِ سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

۸۵۸ تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

۸۵۹ کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

۸۶۰ عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

۸۶۱ زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

۸۶۲ گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہوگیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

۸۶۳ شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

۸۶۴ خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

۸۵۵ ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

۸۶۶ کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

۸۶۷ گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ نا اُمیدواری ہائے ہائے

۸۶۸ عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

---

(۸۵۷) سنا ہے کہ یہ غزل مصنف نے اپنی کسی معشوقہ کی وفات پر لکھی تھی۔

لغت ۔ تمہید ابتدائے عشق کی حالت بیان کرنے کو پہلے چند اشعار میں اپنی محبوبہ سے اسی مضمون پر تخاطب کیا ہے۔

حل ۔ اے ظالم تیری پہلی سی غفلت شعاری کیا ہوئی۔ (جب میں تجھ پر عاشق ہوا تھا۔ تو تو لاپروا ہی کیا کرتا تھا۔) اب میرے درد یا درد عشق سے تجھ کو اس قدر بیقراری ہو رہی ہے۔ کہ افسوس افسوس۔ (درد سے مراد مصنف کا اپنی معشوقہ کی حالت نزع پر رنج کرنا۔)

(۸۵۸) لغت ۔ آشوب غم ۔ غم میں ڈوب جانا۔ غم گساری۔ کسی کا غم بٹا لینا ۔ حل ۔ جب تیرے دل میں میرے درد عشق کو دیکھ کے آشوب غم یعنی بار بار غم اٹھانے کی طاقت نہ تھی۔ تو پھر تو نے میرا غم بٹانے کا ارادہ ہی کیوں کیا تھا ۔ (جو یہ حالت ہوئی) افسوس۔

(۸۵۹) تجکو میری غم خواری کا خیال ہی کیوں بندھا تھا۔ افسوس تیرا میرے ساتھ دوستداری کرنا گویا اپنی دشمنی تھی۔

(۸۶۰) تو نے (ابتدائے عشق میں) تمام عمر میرے ساتھ وفا کرنے کا اقرار کیا تھا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا۔ جبکہ افسوس (اب ثابت ہوا کہ) عمر ہی کو پائیداری نہیں ہے۔ تو پیمان وفا کب تک نبھ سکتا تھا۔

(۸۶۱) زندگی نے تجھ سے ناسازگاری کی۔ یعنی وفا نہ کی۔ افسوس افسوس۔ اب مجھ کو بھی اپنی زندگی کی آب و ہوا یا اس کا سب ساز و سامان زہر لگتا ہے۔

(۸۶۲) گل فشانی ہائے ناز جلوہ۔ تیرے ناز و انداز کے جلوے یعنی ظہور سے دیکھنے والوں پر گویا پھول جھڑتے تھے۔

حل ۔ وہ تیرے ناز و انداز کے پھول جھڑنے کیا ہوئے ۔ اب تو

تیری خاک پر لالہ کاری ہوتی ہے۔ یعنی گل لالہ (پوست کا خوشنما پھول) تیری قبر پر پیدا کیا جاتا ہے ۔ افسوس۔ افسوس۔

(۸۶۳) ہمارا اور تمہارا عشق جب زمانے پر ظاہر ہو گیا۔ تو تمہارا اس رسوائی سے شرم کھا کے مر جانا اور خاک میں چھپ جانا سخت افسوسناک ہے۔ تاہم عشق و محبت کی اس طرح پردہ پوشی کرنا۔ گویا تجھ ہی پر ختم ہے۔

(۸۶۴) لغت ۔ ناموس ۔ پیمان محبت ۔ محبت کے اقرار کی عزت یا اس کا بھرم ۔ حل ۔ اب یہ دیکھ کر کہ پیمان محبت کبھی پورا نہیں ہوا کرتا۔ محبت کے اقرار کا سارا بھرم کھل گیا۔ یعنی اس کی وقعت خاک میں مل گئی۔ ہائے ہائے۔ دوستی کی راہ و رسم دنیا سے مٹ گئی۔

(۸۶۵) لغت ۔ تیغ آزما۔ تلوار کو آزما کر دیکھنے والا۔ کہ کتنی کاٹ کرتی ہے مراد ظالم ۔ حل ۔ افسوس اس تیغ آزما (ظالم محبوبہ) کا ہاتھ ہی کام سے جاتا رہا۔ یعنی وہ گذر گیا۔ ابھی اس کے ہاتھ سے ہمارے دل پر ایک کاری زخم نہیں لگنے پایا تھا۔ یعنی اس کی حسرت ہی دل میں باقی رہ گئی۔

(۸۶۶) اختر شماری۔ کسی کے انتظار میں تارے گننا۔ شبہائے تار برشگال کا ٹنا۔ قاعدہ ہے۔ کہ برسات کی اندھیری راتوں میں تنہائی سخت ستاتی ہے۔ اور اس وقت اپنے عزیز معمول سے زیادہ یاد آیا کرتے ہیں۔

حل ۔ میری نظر تو تیرے انتظار میں رات کو تارے گننے کی خوگر ہے ۔ اب تیرے فراق میں برسات کی تاریک راتیں کاٹنی پڑیں۔ (جس میں تو زیادہ یاد آتا ہے۔ اور تنہائی بھی سخت تر محسوس ہوتی ہے۔ افسوس یہ کس طرح کٹیں گی۔

(۸۶۷) حل - افسوس میرے کان اب تیری چٹھی کے حال احوال سے محروم ہو گئے - اور میری آنکھ بھی تیرے جمال کو دیکھنے سے محروم رہ گئی - میرا ایک دل اس پر یہ دو دو نومیدی و مایوسی کے صدمے - افسوس افسوس -

(۸۶۸) غالب ابھی ہمارے عشق نے وحشت کا رنگ نہیں پکڑا تھا - لیعنی ہم کسی طرح کے دیوانہ عشق نہیں بنے تھے - (کہ زمانے میں رسوا ہوتے) آہ وہ ذوق خواری (رسوائی) اب دل ہی میں رہ گیا - (یعنی محبوبہ کے مرنے کے بعد اب کس کے عشق میں رسوا ہوں گے)

غزل

۸۶۹ سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

۸۷۰ لیتا نہیں مرے دل آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

۸۷۱ کیجے بیاں سرور تپ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبان سپاس ہے

۸۷۲ ہے وہ غرور حسن سے بیگانہ وفا
ہر چند اس کے پاس دل حق شناس ہے

۸۷۳ پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

۸۷۴ ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

(۸۶۹) لغت - سرگشتگی - سر پھرنا - جنون - حل - جنون میں عالم ہستی (دنیا و مافیہا) سے مایوسی ہو چکی ہے - (اب مر کر ہی چین آئیگا - لہذا) تسلی کو نوید (مبارکباد) دے کہ مجھے مرنے کی توقع ہے -

(۸۷۰) وہ میرے آوارہ لیعنی مجھ سے برگشتہ دل کی کچھ خبر نہیں لیتا - کیونکہ ابھی تک وہ یہی جانتا ہے - کہ میرا دل میرے ہی پاس ہے - (آوارہ دل کی خبر نہ لینا - مراد میری پریشان حالی جو بوجہ محبت ہے - اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) -

(۸۷۱) لغت - سرور تپ غم - عشق کی تپش کا مزا یا سرور -
حل - عشق کی تپش کا مزا میں کہاں تک بیان کرتا رہوں - میرے بدن کا ہر ایک رونگٹا گویا زبان شکر بن گئی ہے - مراد یہ کہ اس قدر شکریہ ادا کرتا ہے - کہ جسم کے بے حد و حساب بال اس کے ادا کرنے کے لئے مصروف کار ہونے چاہئیں -

(۸۷۲) لغت - وہ بیگانۂ وفا ہے - کسی کی وفاداری کی پرواہ نہیں کرتا - اگرچہ اس کے پاس حق شناس (منصف) یا ہر کسی کا حق پہچاننے والا دل موجود ہے -

(۸۷۳) لغت - شب مہتاب - چاندنی رات جو ٹھنڈی ہوتی ہے - اور بلغمی مزاج بھی سرد ہوتا ہے - حل - چاندنی رات میں جسقدر شراب ملے پی جا - کیونکہ اس بلغمی مزاج کو (لیعنی شب ماہ کو بوجہ سرد مزاج کے

الیسا کہا ہے) گرمی (یعنی شراب کی گرمی) ہی موافق پڑتی ہے۔ (حکما بلغمی مزاج کا علاج گرم دواؤں سے کیا کرتے ہیں)

(۸۷۴) لغت - شرف - عزت - رونق - حل - اے اسدہر ایک مکان کی مکین یعنی مکان میں رہنے والے ہی سے رونق ہوا کرتی ہے۔ مجنوں جو مرگیا ہے تو جنگل اُداس پڑا ہے۔ یعنی سُونا ہے۔

غزل

۸۷۵ گر خاموشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

۸۷۶ کس کو سُناؤں حسرت اظہار کا گلہ
دل فرد جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

۸۷۷ کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

۸۷۸ ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

۸۷۹ مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

۸۸۰ وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے
دریا زمین کو عرق انفعال ہے

۸۸۱ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

(۸۷۵) لغت - اخفائے حال - حال کا چھپانا - حل - اگر چپ کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اپنا حال چھپا رہتا ہے - یعنی کسی پر ظاہر نہیں ہوسکتا - تو میں خوش ہوں کہ مجھے یہ فائدہ بغیر خاموشی ہی کے حاصل ہے کیونکہ میری بات کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

(۸۷۶) لغت - زبان لال - گُنگی زبان - حسرت اظہار - اپنے دل کا حال نہ بیان کر سکنے کا رنج - جمع و خرچ - یعنی آمدنی اور خرچ - یہاں مراد یہ کہ بہرا پن اور گونگا پن ایک ساتھ ہوا کرتے ہیں - لہذا بہرہ پن میں کچھ سنائی نہیں دیا کرتا - تو دوسروں کے خیالات مجتمع نہیں کئے جا سکتے اور پھر گونگا پن میں زبان کا صرف نہیں ہوسکتا - تو سننا اور بولنا جب غیر ممکن ہوا - تو اس طرح نہ آمد ہوئی نہ خرچ - تو گویا یہ گنگی زبانوں کی فرد جمع و خرچ ہے - کہ جس سے مراد گُنگے کی بول چال ہے - اور میرا یہ حال ہے اس لئے کچھ اظہار مطالب نہیں ہوسکتا - تو سخت حسرت آتی ہے - اب اسکے متعلق کس سے شکایت کی جائے۔

(۸۷۷) آئینہ پرداز - آئینے میں منہ دیکھنے اور بناؤ سنگار کرنے میں مصروف - حل - اے خدا تیری وہ رحمت اب کس پردہ میں آئینہ کررہی ہے - (یعنی کہاں اپنے بناؤ سنگار میں مصروف ہے) جو کہ ایک لب بے سوال یعنی اُس شخص کو جو اپنی بخشش طلب نہیں کرتا معذور رکھا کرتی ہے - تاکہ وہ بے سوال ہی بخشا جائے - (عذر خواہ سے یہاں مراد کسی کو معذور رکھنا - دیکھو غیاث اللغات عذر خواہ بمعنے کسے را معذور داشتن)

(۸۷۸) لغت اے شوق منفعل - یہاں لفظ "ہو" محذوف ہے

مراد یہ ہے۔ شوق دوست سے تجھے شرم کرنی چاہئے۔

حل۔ اے شوق تجھے یہ کیا خیال آیا۔ کہ وہ دوست میرا دشمن ہوگیا ہے۔ سب ہے۔ خدا ایسا نہ کرے۔ تو ایسے غلط خیال پر منفعل ہو اور شرم کر یہ وہم صحیح نہیں ہے۔

(۸۷۹) مشکیں۔ خوشبودار۔ یا سیاہ۔ جیسے کہ مشک نافہ سیاہ رنگ کا ہوا کرتا ہے۔ نافِ زمیں۔ اہل حدیث۔ خانہ کعبہ کو دنیا کا وسط بتایا کرتے ہیں۔ نافِ غزال۔ ہرن کی ناف۔ یعنی مشک بو جو کالی ہوا کرتی ہے۔

حل۔ خانہ کعبہ کا لباس یعنی غلاف جو مشکیں یا سیاہ رنگ کا ہوا کرتا تو جان کہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قدم کی برکت سے ہے۔ یعنی وہ دنیا میں آئے تو سیاہ لباس پہنا گئے۔ اور خانہ کعبہ بھی اُنکی تقلید میں سیاہ پوش ہوگیا۔ ورنہ کعبہ یعنی مکہ تو زمین کا وسط ہے۔ وہ کوئی ہرن کی ناف یعنی مشک بو نہیں ہے۔ جو سیاہ ہوا کرتا ہے۔ اور اس سے کعبہ سیاہ پوش ہوگیا۔

دوسرے معنی۔ کعبہ مشکیں لباس ہے۔ یعنی مشک نافے کی طرح خوشبو دیتا ہے۔ اور یہ خوشبو گویا نشان برکت ہے۔ تو یہ حضرت علی کے قدم یا تشریف آوری کی وجہ سے جان۔ ورنہ کعبہ وسط دنیا ہے۔ یہ کوئی مشک نافہ نہیں ہے۔ کہ اپنی خوشبو کی برکت پھیلائے گا۔

(۸۸۰) میری وحشت یعنی جنگلوں میں مارا مارا پھرنے کے لئے دنیا کی وسعت تنگ تھی۔ اس لئے شرم سے زمین پسینہ پسینہ ہوگئی۔ اور جو جو دریا اس پر چلتے ہیں۔ وہ زمین ہی کا گویا پسینہ ہیں۔

(۸۸۱) خیال۔ وہم۔ بے بنیاد چیز۔ حل۔ اے اسدؔ اس دنیا کے فریب میں نہ آنا۔ کیونکہ ساری دنیا ایک حلقہ دام خیال ہے یعنی کسی بے بنیاد چیز کے جال کی زنجیر ہے۔ مراد یہ کہ یہ ایک خیال ہی خیال ہے۔ جس میں تمام اہل دنیا پھنسے ہوئے ہیں۔

غزل

۸۸۲ تم اپنے شکوے کی باتیں مت کھود کھود کے پوچھو
عذر کرو میرے دل سے کہ اس میں آگ بھری ہے

۸۸۳ دلا یہ درد والم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

(۸۸۲) تم اپنے متعلق ان شکووں کو جو میرے دل میں بھرے ہوئے ہیں۔ کھود کھود کر نہ پوچھو۔ میرے دل سے عذر کرو۔ یعنی پرہیز کرو اس میں آگ دبی ہوئی ہے۔ کہیں جل نہ جاؤ۔

(۸۸۳) لغت۔ مغتنم۔ غنیمت ہے۔ گریۂ سحری۔ صبح کے وقت رونا۔ حل۔ اے دل یہ رنج و غم بھی غنیمت سمجھ۔ کہ آخر کار (یعنی بعد گذر مدت حیات کے) نہ صبح کا رونا رہیگا۔ نہ آدھی رات کا آہ کھینچنا۔ (گویا زندگی رنج و غم کے ساتھ بھی مغتنم ہے۔ ورنہ مرکے تو غم و خوشی کچھ بھی نہیں ہوتی۔

غزل

۸۸۴ ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

۸۸۵ جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

۸۸۶ آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

۸۸۷ ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

۸۸۸ مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

۸۸۹ آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

(۸۸۴) لغت - غلط بردار - اس کاغذ کو کہتے ہیں - کہ جس پر لکھے حرف بہ آسانی گزلک وغیرہ سے اڑ سکے - اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے - حل - تو نے جس کاغذ پر ہمیں خط لکھا تھا - صاف معلوم ہوتا ہے - کہ وہ کاغذ غلط بردار تھا - کیونکہ ایک جگہ تو نے وفا کا لفظ لکھا تھا - وہی اس کاغذ پر مٹ گیا - (تو صاف ظاہر ہے کہ کاغذ غلط بردار تھا - کیونکہ لفظ وفا تو نے قصداً نہیں لکھا تھا - بلکہ غلطی کے ساتھ

[لکھا] گیا تھا - اس لئے وہ غلطی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی -

(۸۸۵) لغت ناتمامی - ناقص حالت - جیسے کوئی چیز پوری طرح نہ جل سکے [ا]ور رہ جائے - بلکہ بقدر نصف جل کے رہ جائے - حل - ہمارا فنا و برباد [ہو]نے کا شوق تو چاہتا ہے - کہ ہم جل کے بھسم ہو جائیں - مگر ابھی یہ ذوقِ فنا [ناتمام] ہے - لہذا اس کی ناتمامی (ناقص حالت) پر ہمارا دل کیوں نہ جلے - کہ باوجود [اس] کے کہ ہمارا نفس یا آہ آگ برسانے والی ہے - مگر ہم جل نہیں [سک]تے -

(۸۸۶) لغت - درماندگی - درماندہ یا عاجزانہ حالت میں ہونا - نالاں [ر]ہونا - مجبوراً آہ و فریاد کرنا - حل - دہکتے کوئلوں پر پانی ڈالو - تو آگ [بجھ] جائیگی - لیکن ساتھ ہی ساتھ نالہ یعنی آہ و فریاد بھی کرتی جائیگی - یعنی آگ [کی] آواز اور آہ کا سا دھواں بھی اٹھتا جائیگا - لہذا وہ اپنی اس عاجزانہ [حال]ت میں نالہ کرنے پر فطرتاً مجبور ہوتی ہے - اسی طرح انسان بھی اپنی خستہ [حال]ت میں ضرور آہ و فریاد کیا کرتا ہے -

(۸۸۷) عذر خواہ - عذر کے معنی معذور داشتن بھی ہے - جیسے کہ [ح]والہ غیاث اللغات لکھا گیا ہے - لہذا عذر خواہ بمعنی معذور رکھنے والا [سرش]ار - بدمست - حل - خدا جس کے جلوے سے زمین سے لیکر آسمان [تک ہ]ر چیز بدمست ہو رہی ہے - یعنی ہمہ اوست کے مسئلے کے مطابق ذرہ [ذرہ ہ]و رہا ہے - تو وہی ہر ایک ذرے کی مستی کو معذور رکھنے والا ہے [یعنی] یہ کہ انسان جو یہاں خدا سے غافل ہے - تو خدا ہی اس کا موجب ہے [اور و]ہی اس غفلت کا بخشنے والا بھی ہے -)

(۸۸۸) حل - یہ بات مجھ سے تم نہ کہو - کہ "تو ہمیں اپنی زندگی (کی

بابت) کچھ کہتا تھا۔ یعنی زندگی کا تذکرہ کر لیا کرتا تھا۔ اب کچھ اور ہی عالم ہے یعنی میرا جی خود زندگی ہی سے بیزار ہو گیا ہے۔ تو اب اس کا ذکر اذکار کیا ہو۔

(۸۸۹) لغت۔ سرنامہ۔ خط کی پیشانی۔ عنوانِ خط۔

حل۔ ہم نے اپنی آنکھ کی تصویر عنوانِ خط پر کھینچ دی ہے تا کہ تجھ کو صاف معلوم ہو جائے۔ کہ اس خط کے لکھنے والے کو (مراد ہم کو) تیرے دیدار کی بڑی حسرت ہے۔

۸۹۰ پینس پہ گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

(۸۹۰) حل۔ وہ میرے کوچے سے پینس میں گذرتے ہیں۔ تو کہاروں کو وہاں کندھا بھی بدلنے نہیں دیتے۔ کہ کہیں ان کو میرے کوچے میں ذرا ٹھہرنا پڑ جائے۔ تو مجھ سے ملنے کا اتفاق نہ ہو۔

غزل

۸۹۱ مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

۸۹۲ خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

۸۹۳ وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

۸۹۴ نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

(۸۹۱) لغت۔ فضا کے لغوی معنے فراخ زمین اور مکان کی کشادگی ہونا کسی چیز کا گرد و نواح یا اس کے آس پاس کی حالت۔ حیرت۔ وہ حیرانی جس میں کسی چیز کی ہوش نہیں رہتی۔ گویا گم شم ہو جانا۔ حیرت آباد تمنا۔ امید کے گم شم ہو جانے کا مقام۔ نالہ۔ سالک کسی امید سے رونا۔ فریاد کرنا رہا ہے۔ عنقا ایک جانور ہے۔ کہ بس نام ہی نام سُنا دکھائی کہیں نہیں دیتا۔

حل۔ میری زندگی کا گرد و نواح حیرت آباد تمنا ہے۔ یعنی ایک ایسا مقام یا عالم کہ جس میں امید گویا گم شم ہو چکی ہے۔ اس لئے میرا نالہ (کسی امید پر رونا دھونا) وہ گویا اس حیرت آباد تمنا کا ایک جانور ہے جسے عنقا کہا جاتا ہے۔ کہ صرف نام ہی نام ہے۔ وجود ندارد۔ مراد یہ کہ میں خود ہی حیرانی کے عالم میں ہوں۔ میری تمنا کا وجود کیا۔

(۸۹۲) خزاں آئی تو کیا۔ فصل گل (بہار) آئی تو کیا۔ کوئی موسم ہو ہمارا ہم ہیں۔ اور ہمارا پنجرا۔ اور وہی اپنے بال و پر کا رنج ہے۔ کہ صیاد نے ان کو نوچ کر ہمیں پنجرے میں بند کر دیا۔ کہ جہاں نہ بہار نہ خزاں۔

(۸۹۳) دلبروں کا عشاق سے وفا کرنا۔ محض ایک اتفاقی بات ہے۔ (یہ کسی تدبیر سے حاصل نہیں ہوتی) ورنہ اے ہمدم ان معشوقوں کے غم میں غمگین دلوں نے آہ و فریاد کرنے کا اثر بھی کیا کسی نے دیکھا ہے؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر وفائے دلبر قسمت ہی پر منحصر ہے۔

(۸۹۴) لغت۔ شوخیٔ اندیشہ۔ حرارت فکر۔ یا غم دوبارہ ابھرنا

سی فکر سے مضطرب نہ ہونا۔ تاب رنج ناامیدی لانا۔ مایوسی کو صبر سے برداشت کرنا۔ عہد تجدید تمنا۔ امید کے اقرار کا سرنو تازہ کرنا۔

حل۔ جب دوست نے ہماری امید کو ٹھکرا دیا۔ تو ہماری جرأت صبر سے اس مایوسی کو برداشت نہ کر سکی۔ بلکہ ہم افسوس سے اپنے ہاتھ ملنے لگے۔ (اور چونکہ کسی اقرار کے وقت بھی ہاتھ میں ہاتھ دیکر ملتے ہیں) ان کو افسوس سے ہاتھ ملنا نہیں کہنا چاہئے۔ بلکہ ہم نے اپنے امید کرنے کے اقرار کو سرنو تازہ کرنے کے لئے یہ ہاتھ سے ہاتھ ملے ہیں۔ (مراد یہ کہ ہم مایوس نہیں ہوئے۔ دوست سے بدستور امید رکھتے ہیں (جرأت۔ فکر، غم برداشت کرنیکا حوصلہ)

۸۹۵ رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے
نبض بیمار وفا دود چراغ کشتہ ہے

۸۹۶ دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سود چراغ کشتہ ہے

(۸۹۵) بود۔ زندگی۔ وجود۔ دود چراغ کشتہ۔ چراغ بجھتا ہے تو اس سے کچھ دھواں سا اٹھتا ہے۔ وہی دود چراغ کشتہ ہوتا ہے جس کو ایک لمحے سے زیادہ قیام نہیں ہوتا۔ جیسے کہ نزع میں بیمار کی نبض جلدی اکھڑ جاتی ہے۔

حل۔ اے ظالم (عاشق پر) رحم کر وہ ایک بجھا ہوا چراغ ہے (یعنی تجھ سے از حد مایوس ہو چکا ہے۔) اب اس کی زندگی ہی کیا۔ اس وفا کے بیمار کی نبض بھی تو اب بجھنے والے چراغ کے دھوئیں کی طرح جلدی

اکھڑ جانیوالی ہے۔ (رحم کر)

(۸۹۶) لغت۔ دل لگی۔ یہاں مراد رونق محفل۔ سود چراغ۔ دیئے کا فائدہ۔ وہ یہی کہ چراغ نہ جلایا جائے۔ اور اس کی بتی اور تیل خرچ نہ ہونے پائیں۔ حل۔ دل لگی یعنی محفل کی رونق کی آرزو ہمیں بیقرار رکھتی ہے۔ (اور ہم یار و احباب کی خاطر تواضع پر کچھ خرچ کر دیتے ہیں۔) ورنہ ایک بجھے ہوئے چراغ کا فائدہ تو اس میں ہے۔ کہ محفل میں بے رونقی ہی رہے۔ یعنی اندھیرا۔ کہ جس حالت میں وہ چراغ جلایا نہ جائیگا۔ تو سود چراغ ہے۔ یعنی تیل بتی کا خرچ بچ جائیگا۔ افلاس میں فضول خرچ نہیں ہونا چاہئے

۸۹۷ چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

۸۹۸ پیکر عشاق ساز طالع ناساز ہے
نالہ گویا گردش سیارہ کی آواز ہے

۸۹۹ دستگاہ دیدۂ خونبار مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرش پا انداز ہے

(۸۹۷) لغت۔ نوا پرداز۔ آواز نکالنے میں مشغول یعنی بات کرنا۔ تو کہوے۔ فارسی جملہ تو گوئی یا گویا کا ترجمہ ہے۔ دود شعلہ آواز۔ آواز کو شعلہ فرض کر کے اس کا دود یا دھواں۔

حل۔ حسینوں کی آنکھیں (جو قدرتاً ایسی شوخ ہوا کرتی ہیں۔ کہ گویا کچھ اشارے کنائے کر رہی ہاں وہ خاموشی میں بھی نوا پرداز ہیں۔ یعنی

،چیت کرنے میں مصروف ہیں۔ تو کیوں کہو ان کی آنکھوں کا سرمہ بہتر
ں ہے۔ بلکہ آواز کے شعلہ کا دھواں ہے۔ (شعلہ یا دیے کی لو کے سرے
جو کچھ دھواں سا ہوا کرتا ہے۔ وہ گویا حسینوں کی اشارہ و کنایہ کرنیوالی
نھو کا سرمہ ہے)

(۸۹۸) لغت۔ پیکر۔ وجود۔ ساز۔ باجا۔ طالع ناساز۔ بدقسمتی۔ کہا
تا ہے۔ کہ انسانوں کی قسمت ستاروں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ ستارہ
ردش کھائے۔ تو کہتے ہیں کہ قسمت بھی بدل گئی۔

حل۔ عشاق کا وجود گویا ایک طالع ناساز (یعنی بدقسمتی) کا باجا ہے
ذا عشاق کچھ نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ تو جو آواز پیدا ہوتی ہے
ہ ستارۂ قسمت کی گویا گردش کی آواز ہوا کرتی ہے۔ (یہاں گویا کا لفظ
س لئے لکھا ہے۔ کہ ستارہ گو گردش کرتے وقت صدا نہیں دیتا۔ مگر اس
صورت میں ایسا فرض کر لو)

(۸۹۹) دستگاہ۔ توفیق۔ قدرت۔ مرتبہ۔ یک بیاباں جلوہ گل۔
بکثرت گلاب کے سرخ پھولوں کیسا جلوہ یا رنگت۔ فرش پا انداز۔ کمرے
ہیں داخل ہونے وقت ایک چٹائی یا کوئی اور چیز بچھا دی جاتی ہے۔ کہ جس
پر جوتے پونچھے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ کمرے میں نہ آنے پائیں۔ یہی فرش پا انداز
کہلاتا ہے۔ حل۔ مجنوں کی خون بہانے والی آنکھ کی یہ توفیق دیکھنا۔
(کہ اس نے اس قدر لہو رویا۔ کہ ایک بیابان لہر یعنی بکثرت جلوہ گل یعنی
پھولوں کی سی سرخی اس کے لئے جنگل میں گویا فرش پا انداز بن گئی ہے۔
(مراد یہ کہ مجنوں نے رو رو کے دشت نجد کی زمین کو خوناخون کر دیا۔ اور
وہ لالوں لال نظر آتی ہے۔

غزل

۹۰۰ عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

۹۰۱ قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

۹۰۲ میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

۹۰۳ ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

۹۰۴ اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

۹۰۵ عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

۹۰۶ ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

۹۰۷ کچھ تو دے اے فلک ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

۹۰۸ ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

۹۰۹ یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۹۰۰) لغت ۔ وحشت ۔ دیوانگی ۔ جنون پن ۔ حل ۔ دوست سے کہتا ہے کہ تو جو مجھے یہ الزام دیتا ہے ۔ کہ میں تیرا سچا عاشق نہیں ہوں ۔ یعنی "عشق مجھ کو نہیں" ۔ تو اچھا یہ وحشت یا محض جنون پن ہی سہی ۔ کیا میرا یہ جنون پن یا دیوانگی تیری شہرت کا باعث نہیں ہے ۔ (کہ جو جو سنتا ہے کہ میں دیوانہ ہوگیا ۔ تو تیرا نام اس میں نکلتا ہے ۔ کہ تو اس قدر حسین ہے کہ لوگ تیرے عشق میں دیوانے ہو جاتے ہیں ۔ گویا ؎

میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

(۹۰۱) ہم سے اپنا تعلق ہٹا نہ لیجیے ۔ اگر کوئی اور تعلق نہیں رکھتے تو ہم سے عداوت یعنی دشمنی ہی رکھیے ۔ کہ یہ بھی تو ایک بُرا یا بھلا کسی طرح کا تعلق ہی ہے ۔

(۹۰۲) لغت "ہونے" سے یہاں مراد دوست کے ساتھ عاشق کا خواہ محفل میں ہونا ۔ یا تنہائی میں ہونا ۔

حل ۔ میرے آپ کے ساتھ "ہونے" میں آپ کی "بدنامی" یا رسوائی کیا ہے ۔ (کیا ایک انسان انسان کے ساتھ نہیں ہوا کرتا ۔) تو پھر اسے وہ ۔ یعنی افسوس اگر مجلس میں تیرے ساتھ میں نہ ہوں ۔ تو خلوت یعنی تنہائی ہی میں سہی ۔ (گویا مجلس میں ہونا تو میرے لئے باعث عزت ہوتا ۔ کہ ایک ایسے شخص کا دوست کہلاتا ہے ۔

(۹۰۳) اس شعر کے عام شرحوں میں یہ معنی لکھے ہیں کہ غیر کو اگر تجھ سے محبت ہے تو ہوا کرے ۔ ہم کوئی اپنے دشمن نہیں ہیں کہ تجھ سے محبت کر کے غیر کو اپنا دشمن یا رقیب بنا لیں ۔ اور پھر مبتلائے غم ہوں ۔

دوسرے معنی ۔ اگر غیر کو تجھ سے محبت ہو گئی ہے ۔ تو بالفاظ دیگر یہ مرثیہ

معنی رکھتا ہے ۔ کہ غیر یعنی بوالہوس تیرا اپنا بن گیا ہے ۔ تو اچھا وہ تیرا اپنا ہی سہی ۔ (حالانکہ اس کی محبت کبھی اپنایت کے درجے تک ترقی نہیں کر سکتی) تو اس سے ہماری محبت پر کچھ اثر نہیں پڑا ۔ یعنی ہم بھی جو غیر کے اپنے بننے سے بہت قبل تیرے اپنے تھے ۔ تو اب بھی ویسے ہی تیرے اپنے ہیں ۔ یعنی یہ مصرعہ ؎

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے

اس کو نثر میں یوں پڑھنا چاہیئے ۔ ہم بھی (جو تیرے) اپنے ہیں ۔ تو (اب) کچھ (تیرے) دشمن نہیں (ہو گئے)

(۹۰۴) اپنی ہستی ہی سے ہو ۔ یعنی اپنی ہی ذات کے ساتھ ہو ۔ نہ کہ غیروں کے ساتھ ۔ حل ۔ دنیا میں جو کچھ انسان کرے خواہ "آگہی" حاصل کرنی ہو ۔ تو اپنی ہی ذات سے آگہی حاصل کرے ۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر اپنی ہستی یعنی اپنی ذات یا وجود سے غفلت ہی سہی ۔ مراد یہ کہ اگر تو خود شناس نہیں ہے ۔ تو اچھا اپنائیت ہی کو ترک کر دے ۔ کیونکہ یہ دونوں اوصاف اہل تصوف کے نکتہ نظر ہیں ۔

(۹۰۵) لغت ۔ برق خرام ۔ بجلی کی طرح جلدی جلدی جانے والی ۔ دل کا خون کرنا ۔ ایک تیز چھری سے کسی جانور کا خون محض ایک لمحہ میں کیا جا سکتا ہے ۔ یہ عمر کے برق خرام ہونے کی مناسبت سے کہا ہے ۔ اور دل کا خون کرنا ۔ گویا دل کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دینا ۔

حل ۔ مانا کہ عمر بجلی کی طرح بہت جلد چل جانے والی ہے ۔ تو اس تھوڑی سی مدت میں دل کے ارمانوں کو گویا ذبح کر دینے کی فرصت ہی سہی ۔ (مراد یہ کہ کمی عمر کی وجہ سے کوئی ہوس دل کی پوری نہیں ہو سکتی)

(۹۰۶) لغت - وفا - وفا جب ہی کی جاتی ہے کہ عشق صادق ہو یہاں معشوق اپنے عاشق پر طعن کرتا ہے - کہ تیرا عشق صادق نہیں ہے - لہذا تو وفا کرنا چھوڑ دے - اس کے جواب میں یہ شعر پیش کیا گیا ہے -

حل - ہم تجھ سے کبھی ترک وفا کر سکتے ہیں - کیونکہ عشق صادق ہیں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا - لیکن اگر تیرا خیال ہے - کہ ہمیں یہ عشق نہیں ہے محض ایک مصیبت گلے پڑ گئی ہے - تو خیر اب ایک مصیبت ہی سمجھ کے ہم تیرے ساتھ وفا کر رہے ہیں - یعنی نباہ رہے ہیں -

(۹۰۷) فلک یعنی آسمان میں چونکہ ستارے ہوا کرتے ہیں - اور انہی ستاروں سے انسان کی بری یا اچھی قسمت وابستہ ہے - لہذا کچھ دینا دلانا آسمان ہی کے اختیار میں ہے -

حل - اے نامنصف آسمان ہمیں کچھ تو دے - (بالکل محروم ہی نہ کر دے) آہ و فغاں کرنے کی رخصت یعنی اجازت ہی دیدے - (یہ ہے مارے اور رونے نہ دے - اسی کو کہتے ہیں)

(۹۰۸) لغت - تسلیم - رضامندی - بے نیازی - لاپرواہی -

حل - تیری عادت میں لاپرواہی سہی - ہم بھی تیری ہر بات پر رضامند ہونے کی عادت ڈال لیں گے - (جس سے ہمیں تیرے ساتھ نباہ کرنے میں کچھ دقت محسوس نہ ہوگی)

(۹۰۹) اے اسد - ہاں یار سے کچھ چھیڑ چھاڑ برابر لگی رہنی چاہئے (مثلاً بوسے کا کبھی سوال کر دیا - کبھی وصال کا - اس میں اپنا ہرج کیا ہے) اگر وصل میسر نہ ہوگا - تو خیر وصل کی حسرت تو کہیں گئی نہیں - (اسی چھیڑ چھاڑ میں وہ حسرت بھی پوری ہونے کا کوئی موقع ہاتھ آجائیگا - کوشش کا

سلسلہ ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے)

غزل

۹۱۰ ہے آرامیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

۹۱۱ ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

۹۱۲ مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

۹۱۳ کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے

۹۱۴ کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

---

(۹۱۰) آرامیدگی - آرام کرنا - جیسے کہ انسان بستر میں پڑا رہے - تو یہ آرام کی بہترین مثال ہے - نکوہش - لعنت ملامت کرنا - خندۂ دنداں نما - منہ کھول کے ایسا ہنسنا کہ دانت سب دکھائی دیں -

حل - اگر میں غافل ہو کے (یعنی دین و دنیا کے کاموں سے) بالکل آرام میں پڑا رہا ہوں - (جیسے کوئی بستر میں لیٹا ہو) تو ایسی سرزنش یا لعنت ملامت مجھے کرنا لازم ہے - جیسے کسی سوئے ہوئے پر صبح دانت نکال کے ہنستی ہے - کہ دن تو نکل آیا - اور یہ ابھی تک بستر میں غافل

پڑا سورہا ہے۔ اور وطن کا آرام چھوڑ کے کہیں باہر کمانے نہیں جاتا۔

(۱۱ ۹) لغت۔ مغنی۔ گانے والا۔ آتش نفس۔ جس کے سانس میں آگ بھری ہو۔ یعنی اس قدر موثر کہ اس کی سانس سے آس پاس کی چیزیں آگ لگا جل جائیں۔ جلوۂ برقِ فنا۔ فنا کی بجلی کا جلوہ یا عکس۔

حل۔ میرا دل اس آگ کے نفس والے یا موثر گویئے کو تلاش کرتا ہے۔ کہ جس کی آواز میرے لئے برق فنا کا ایک جلوہ ثابت ہو (مراد یہ کہ میں ایک ایسے زبردست مغنی کا گانا سننا چاہتا ہوں۔ کہ جس کا گانا سن کے بس تن بدن پھنک جائے۔ اور میرا دل پھڑک اُٹھے۔)

(۱۲ ۹) لغت۔ خیال کی وادی سے مراد خیال کا ایک وسیع میدان کہ جس کی حدود دور دور تک پھیلی ہوں۔ بازگشت۔ لوٹ کر آنا۔

حل۔ میں خیال کے میدان کو ایک عالم ہستی میں یعنی اُس خیال میں کلیم مست ہو کے طے کر رہا ہوں۔ تاکہ میں اس قدر (اس خیالی میدان میں) دور نکل جاؤں کہ پھر وہاں کی دلچسپ فضا چھوڑ کے مجھے لوٹنے کا مدعا یعنی اس کی خواہش باقی ہی نہ رہے۔ (گویا اپنے خیال ہی خیال میں ہمیشہ مست رہ کر اپنا عرصۂ عمر طے کر جاؤں۔)

(۱۳ ۹) بے حجابی۔ لغوی معنی حجاب یا برقع اتار دینا۔ معنی بے شرمی کے کام کرنا۔ نگہت گل۔ پھول کے منہ کی خوشبو۔ مراد پھولوں کی خوشبو۔ حیا۔ شرم۔ حیا آنا۔ کسی سے شرم آنا۔ یا اس سے پرہیز کرنا۔ جیسے عورتیں حیا کرتی ہیں۔ تو سامنے نہیں آتیں پرے ہی رہتی ہیں۔

حل۔ چونکہ تو باغ میں بے حجابیاں کرتا ہے۔ یعنی وہاں جاکر

اکثر برقع اتار دیتا ہے۔ اور اس سے باغ میں تیری خوشبو پھیل جاتی ہے۔ تو مجھے پھولوں کی خوشبو سے گویا شرم آتی ہے۔ کہ یہ تیرے سامنے اس قابل ہی نہیں کہ ان کو سونگھا جائے۔ اس لئے اس بات سے میں پرہیز کرتا ہوں۔

(۲) چونکہ تو باغ میں بے حجابیاں کرتا ہے۔ یعنی خوب کھل کھیلتا ہے۔ تو اب میں باغ کو دیکھتا ہوں۔ کہ وہاں ہر ایک چیز تیری تقلید میں گویا بالکل حیا اٹھ گئی ہے۔ حتیٰ کہ نگہت گل بھی۔ لہٰذا مجھے اس سے شرم آتی ہے۔ اور اسے منہ نہیں لگاتا۔

(۳) میں نگہت گل یا پھولوں کی خوشبو کو بے حیا کہا کرتا تھا۔ کہ ہر کسی سے باغ میں منہ لگتی ہے۔ مگر اب تو نے وہاں جا کر اس قدر کھل کھیلے۔ کہ مجھے نگہت گل سے بھی شرمساری اُٹھانی پڑی۔ کہ وہ بزبان حال طعن کرتی ہے۔ کہ تیرا محبوب اتنا بے حجاب ہے۔

(۱۴ ۹) لغت۔ شعروں کا انتخاب۔ یوں تو شعرا بکثرت شعر لکھا کرتے ہیں۔ مگر اپنے دیوان میں صرف چوٹی کے شعر انتخاب کرکے درج کیا کرتے ہیں۔ اور یہ اشعار عموماً اس قسم کے ہوتے ہیں۔ کہ جن میں حسن وعشق کے متعلق بڑے رسوا کن خیالات بندھے ہوتے ہیں۔ یا شعروں کے انتخاب سے مراد ایسے اشعار کہ لوگ اپنی عشق کو بھڑکانے کے لئے کسی شاعر کے کلام سے چن چن کے یاد کر لیتے ہیں۔ اور خاص خاص موقعوں پر پڑھ دیا کرتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں شاعر کی رسوائی ہے۔

حل۔ میں نے صرف وہ انتخابی اشعار جو اپنے حسن وعشق کے متعلق تھے اپنے کلام میں لکھے تھے۔ اس سے میرے دل کا معاملہ یعنی حسن وعشق کی باتیں لوگوں میں کھل گئیں۔ تو یہ میری رسوائی کا باعث بن گئی۔ اگر عوام میرے کلام سے محض ایسے اشعار جن میں میں نے اپنے عشقیہ معاملات ہی لکھے تھے۔ انتخاب کر کے جا بجا نہ پڑھا کرتے تو میں رسوا ہی کیوں ہوتا۔ اور میرے عشق کا حال

دوسروں پر کیوں کھلتا۔

۹۱۵ زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(۹۱۵) اے غالبؔ اگر ہماری زندگی اس طرح (بے کسی و بے اتفاقی) میں گزرا کرے گی۔ تو ہم کیا یاد کریں گے۔ کہ ہمارا بھی کوئی خدا تھا۔

غزل

۹۱۶ اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

۹۱۷ دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

۹۱۸ رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

۹۱۹ بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو ہر چند عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

۹۲۰ مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

۹۲۱ کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

۹۲۲ صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

۹۲۳ ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے

۹۲۴ غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

(۹۱۶) لغت ۔ حیا کئے نہیں بنتی۔ مراد شرم سے چپکا بیٹھے ہوئے۔ کام خراب ہوتا ہے۔ حل ۔ اس بزم میں یعنی دوست کی مجلس میں اگرچہ میں چپکا بیٹھا رہا۔ اور یہ اس لئے کہ اس طرح رقیب میرے ساتھ کوئی شرارت نہیں کریگا۔ مگر پھر بھی وہ میری نسبت دوست کے ساتھ اشاروں سے باتیں کرکے شرارت کرتا رہا۔ تو وہاں چپکے شرم سے بیٹھنے میں میرا کام بگڑتا ہے۔ ایسا آئندہ نہ کرنا چاہئے۔ یعنی " بنتی نہیں حیا کئے " گویا معاملہ خراب ہوتا ہے۔ حیا و شرم یا صبر نہیں کرنا چاہیے۔

(۹۱۷) لغت بے صدا کئے۔ بغیر ایک فقیرانہ نعرا لگائے ہوئے۔ شاعر اپنے آپ کو یہاں مثل ایک آزاد مستانہ فقیر کے تصور کرتا ہے۔

حل ۔ دل ہی تو ہے۔ یعنی انسان کا دل کبھی خوف بھی تو کھا جاتا ہے لہذا میں تیرے دربان کی پکڑ دھکڑ سے ڈر گیا۔ ورنہ میں تیرے دروازے پر جاؤں۔ اور بغیر ایک مستانہ نعرا لگائے وہاں سے گزر جاؤں۔ کیا یہ کبھی ممکن ہو سکتا ہے۔

(۹۱۸) لغت ۔ خرقہ ۔ گدڑی۔ سجادہ ۔ نماز کا مصلےٰ ۔ حل ۔ مدت

ہوئی کہ ہم نے آب و ہوا کی دعوت نہیں کی۔ یعنی موسم کو خوشگوار دیکھ کر اُس سے لطف نہیں اُٹھایا۔ لہذا اب شراب کے لئے اپنی گدڑی اور مصلے کو گرو کرتا پھرتا ہوں۔ کہ ایسا خوشگوار موسم خالی نہ جائے۔

(۹۱۹) بے صرفہ۔ بیکار۔ حل۔ عمر اکثر بیکاری میں گذر جاتی ہے۔ اگرچہ خضر کی ایسی لمبی عمر ہی کیوں نہ ہو۔ (یعنی ایسی عمر پا کے بھی زندگی کا اکثر حصہ بیکار رہ جاتا ہے۔ تو) پھر حضرت یعنی خضر بھی اتنی عمر پا کے اکثر بیکار ہی یہاں پھرا کرتے ہیں۔ تو کل یعنی روز قیامت آپ کیا حساب دیں گے۔ کہ ہم نے دنیا میں یہ کیا اور وہ کیا۔ یا یہ کہ وہ ڈینگے ماریں گے۔ کہ ہم نے بہت سا کام کیا۔ چنانچہ یہ کیا اور وہ کیا۔ مگر در حقیقت کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ جو خواجہ خضر سے منسوب ہو۔ اور وہ عمر بھر کا کام ہو۔

(۹۲۰) لغت۔ مقدور۔ بس کی بات جیسے کہتے ہیں۔ میرا کیا مقدور ہے۔

حل۔ اگر یہ بات مجھ سے ہو سکے۔ تو خاک سے ضرور پوچھوں کہ اے لئیم یعنی خسیس ہستی تو نے وہ قیمتی قیمتی خزانے کیا کئے۔ (جو لوگوں نے تجھ میں دفن کئے تھے۔) یہاں گنجہائے گرانمایہ سے مراد یا تو خزانے ہیں۔ یا لاکھوں انسانوں کے مال و دولت بہ شکل مکانات وغیرہ۔ مٹی میں ملے اور خاک تک باقی نہ رہی۔ یا وہ بزرگ ہستیاں ہیں۔ کہ مر کے مٹی میں دفن ہوئیں۔ اور نشان تک باقی نہ رہا۔ ؎

بس نامور بزیر زمیں دفن کردہ اند
خاکش چناں بخورد کزو استخواں نماند

(۹۲۱) وہ کونسا دن تھا کہ دشمنوں نے ہم پر خود ستمتیں گڑھے فرمائیں۔ اور کونسے دن ہم پہ یہ ظلم نہ ہوا۔ کہ گویا سر پہ آ رہے

چلا گئے۔

(۹۲۲) وہ اب بغیر التجا کئے ہی بوسے دینے لگا ہے۔ یعنی اس قدر بے حجاب و بے شرم ہو گیا ہے۔ کہیں یہ بے حجابی کی خُو اس میں رقیب کی صحبت سے تو نہیں پڑ گئی۔ (اگر ایسا ہے تو یہ بات قابل رشک ہے۔ کہ وہ رقیب سے اتنا کھل کھیلا ہے اور کسی معشوق کو ایسا نہیں کرنا چاہیے)

(۹۲۳) ضد کی ہے اور بات۔ مراد۔ ضد تو خیر خلاف معمول ہے۔ جیسے کہا کرتے ہیں۔ زید نیک آدمی ہے۔ مگر عمر سے اس نے نیکی نہیں کی۔ تو یہ اور بات ہے۔ یعنی ایک استثنے ہے۔ ورنہ اس کا معمول نیکی ہے۔ بھولے۔ بھول چوک میں۔

حل۔ اس نے بھول چوک میں سینکڑوں اقرار پورے کر دئے۔ اور یہ عادت اُس کی کچھ بُری نہیں ہے۔ اور اگر کسی وقت کوئی وعدہ پورا نہیں کیا اور ضد کی تو یہ اور بات ہے۔ یعنی اس وقت وہ بھول چوک نہیں کر رہا تھا۔ (مراد یہ کہ وہ قصداً تو وعدہ وفا نہیں کیا کرتا۔ ہاں بھول چوک سے ایسا بارہا کر چکا ہے)

(۹۲۴) غالب یہ مانا کہ تم دوست سے اپنا مدعا کہہ گئے۔ اور وہ سن بھی گئے۔ (اور یونہی ہوتا رہا) تو تمہیں بتاؤ کہ آخر ان سوالوں کا تم کو جواب ہی کیا ملے گا۔ کچھ نہیں (تو اپنا اور دوست کا سر کھپانا عبث ہے)

غزل

۹۲۵ رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

۹۲۶ مینائے مے ہے سرو نشاط بہار سے
بال تدرو جلوۂ موج شراب ہے

۹ زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

۹۲۸ جاداد بادہ نوشی رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

۹ نظارہ کیا حریف ہو اُس برق حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کی نقاب ہے

۹۳۰ میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

۹۳ گذرا اسد مسرت پیغام یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

---

(۹۲۵) لغت ۔ رفتارِ عمر ۔ عمر کی گذران ۔ قطع رہ اضطراب ۔ ایک بیقراری و بے چینی کا رستہ طے کرنا ۔ اس سال کے حساب ۔ یعنی ایک اپنے سال کے حساب کے لئے ۔ جیسے کہ ہجری سال ۔ عیسوی سال وغیرہ ہوتے ہیں ۔ آفتاب ۔ سورج سے ۔ یعنی اُس کی گردش سے ۔

حل ۔ عمر کی گذران گویا ایک بے قراری اور بے چینی کا رستہ طے کرنا ہے ۔ ایک اپنے سال کے حساب کو (جسے عمر اپنی گذران سے طے کر رہی ہے) سورج کے عوض برق (بجلی) سے کام لیا جاتا ہے ۔ یعنی سورج تو چوبیس گھنٹوں میں ایک دن پورا کرکے اُس سے ہجری یا عیسوی وغیرہ

سال محسوب ہوتے ہیں ۔ یہ عمر کی رفتار کا سال اس سے جلدی گذر جاتا ہے مثل برق کے ۔

(۹۲۶) لغت ۔ مینائے مے ۔ شراب کی صراحی ۔ نشاط بہار ۔ موسم بہار کی عیش و نشاط ۔ یا خوشی ۔ بال تدرو ۔ چکور کا پر لال اور خوشنما ۔

حل ۔ بہار کی خوشی کے عالم میں شراب کی صراحی گویا سرو بن گئی ہے اور شراب کی لہر کا جلوہ یعنی اُس کی رنگت چکور کا لال لال پر بن گئی ہے ۔ جو خوبصورت ہوتا ہے ۔ (مراد یہ کہ بہار میں سبزہ اور جانور باعث رونق ہوا کرتے ہیں یہ کرشمہ ہماری شراب خواری نے دکھا دیا)

(۹۲۷) لغت ۔ پاشنہ ۔ ایڑی ۔ حل ۔ پائے ثبات یا استقلال کے پاؤں کی ایڑی زخمی ہوکر یہ حالت ہوگئی ہے ۔ نہ بھاگنے کے قابل رہا ۔ نہ ٹھہرنے کی طاقت ہے ۔ (کسی کام میں استقلال نہ رہے تو پھر انسان کی حالت دو دلی سی ہو جایا کرتی ہے ۔)

(۹۲۸) جاداد ۔ جائیداد ۔ جاگیر ۔ بادہ نوشی رنداں ۔ رندوں کی شراب خوری و عیاشی ۔ شش جہت ۔ ہر طرف ۔ جابجا ۔ غافل ۔ وہ لوگ جو حقیقت سے ناواقف ہیں ۔ مراد سادہ لوح ۔ گیتی ۔ دنیا ۔ خراب ہے ۔ یعنی کسی کام کی نہیں ہے ۔ اس سے فائدہ کیا ۔

حل ۔ سادہ لوح آدمی خیال کیا کرتے ہیں ۔ کہ دنیا خراب ہے ۔ یعنی اس سے فائدہ کیا ۔ حالانکہ رندوں یعنی سیانے آدمیوں کے لئے یہ جابجا شراب خوری یا عیش اُڑانے کی ایک اچھی خاصی جاگیر ہے ۔ مطلب یہ کہ دنیا جائے سرور ہے کوئی خراب جگہ نہیں ہے ۔

(۹۲۹) حریف ہونا ۔ تاب لانا ۔ مقابلہ کرنا ۔ جوشِ بہار ۔ فصل گل

میں طرح طرح کے پھولوں کا کھلنا۔ اور خوب رونق ہونا۔

حل۔ اس برق حسن (یعنی بجلی کی طرح چمکنے والے حسین) کے نظارے کی کون تاب لاسکتا ہے۔ جس کے جلوے کو موسم بہار کی رونق گویا ایک نقاب کا کام دیتی ہے۔ یعنی صرف نقاب کے لئے اتنی آب و تاب چاہئے تو اس خاص نظارہ وہ نقاب اٹھاکے کیا جائے کس قدر زبردست ہوگا۔ جبکہ صرف ظاہر آرائی کو اس قدر تکلف مطلوب ہے۔ مراد۔ خدا نقاب میں ہے۔ اور ظہور قدرت اس کا نقاب ہے۔ لہذا اُس شاہد حقیقی کے نظارے کی تاب کون لاسکتا ہے۔

(۹۳۰) لغت۔ نگہ کا میدب ہے۔ یعنی نظر پیٹ بھر کے دیکھ چکی ہے۔

حل۔ میں نامراد (بے امید) اپنے دل کی تسلی کس طرح کروں۔ یہ مانا کہ میری نظر تجھکو اچھی طرح دیکھ چکی ہے۔ (مطلب یہ کہ وصال کا طالب صرف نظارے ہی کا بھوکا نہیں ہوتا۔)

(۹۳۱) اسد میں نے دوست کے خط کی خوشی کا خیال تو چھوڑا۔ اب مجکو یہی رشک کھائے جارہا ہے۔ کہ ہائے قاصد نے میرے دوست سے رُو در رُو سوال وجواب کئے۔ اور اس سے لطف نظارہ حاصل کیا۔

غزل

۹۳۲ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۹۳۳ ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلا جائے ہے

۹۳۴ غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

۹۳۵ شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

۹۳۶ دور چشم بد تری بزم طرب سے واہ وا!
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

۹۳۷ گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

۹۳۸ اُس کی بزم آرئیاں سنکر دل رنجور یاں
مثل نقش مُدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

۹۳۹ ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

۹۴۰ نقش کو اُس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

۹۴۱ سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

(۹۳۲) لغت۔ کب دیکھا جائے ہے۔ یعنی بوجہ رشک کے یہ بات مجھے تکلیف دے رہی ہے۔ اور اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔

حل۔ میری قسمت دیکھنا (کس قدر رذیل) کہ اب اپنے ہی پہ رشک آرہا ہے۔ کہ میں بھی اسے دیکھوں تو گویا اپنے آپ کو ایک غیر سمجھ لیتا ہوں۔

اور اس صورت میں بوجہ رشک) بھلا یہ بات کب میں گوارا کر سکتا ہوں۔

(۹۳۳) لغت۔ آبگینہ۔ شیشہ۔ یہاں مراد شراب کا شیشہ۔ تندیٔ صہبا۔ شراب کی تیزی۔ حل۔ اگر یہی اندیشہ یا فکر و غم کی گرمی (تپش یا جلن) ہے تو دل سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ یعنی دل فکر و غم سے جل جائیگا۔ گویا یوں سمجھ کہ شراب کی تیزی سے شراب کا شیشہ پگھلا جا رہا ہے۔ یعنی دل کو آبگینہ اور فکر کو شراب سے منسوب کیا ہے۔

(۹۳۴) اس شعر کے مولانا حالی نے یہ معنی لئے ہیں۔ جو عام شرحوں میں درج ہیں۔ کہ گر حیا بھی اس کو آتی ہے۔ یعنی محبوب کو غیر کی گستاخیوں سے اگر کچھ حیا بھی آتی ہے۔ تو وہ شرما جاتا ہے۔ یعنی غیر کا ہاتھ نہیں پکڑتا۔ یا اس سے کچھ تکرار نہیں کرتا۔ تو غیر اگر کچھ گستاخی یا زیادتی کرے تو وہ اسکو کیونکر منع کر سکتا ہے۔

(۲) میرے نزدیک یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ حالی مرحوم کا یہ لکھنا کہ دوست کو اگر حیا بھی آتی ہے۔ یہاں بھی کا لفظ معمولی طور سے درج شعر نہیں کیا گیا۔ اور یہ کہنا کہ اگر محبوب کو اس غیر یا رقیب کی بیجا ہوس سے کچھ شرم بھی آتی ہے۔ تو گویا یہ ایک خلاف قیاس امر ہے کیونکہ کسی کی ایسی گستاخی سے تو ایک قحبہ بھی شرما جایا کرتی ہے۔ چہ جائیکہ شعرا کا محبوب ویسا ہو۔ غالبًا اگر حیا بھی اس کو آتی ہے۔ یہاں "اس کو" غیر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور شعر کا یہ مطلب ہے۔ کہ غیر کو یعنی رقیب کو دوران اختلاط میں کسی وقت گستاخی کرتے ہوئے کچھ حیا بھی آتی ہے۔ یعنی وہ رک جاتا ہے تو یہی وجہ دوست کے شرمانے یعنی کچھ مردہ دل سے ہو جانے کی ہوتی ہے۔

تو یارب یعنی فریاد ہے۔ ایسے محبوب سے کہ وہ خود ہی غیروں کی چھیڑ چھاڑ کا جب اس قدر بھوکا ہے۔ تو پھر وہ رقیب کو کیونکر منع کر سکتا ہے۔ کہ وہ اس کے ساتھ گستاخیاں نہ کیا کرے۔ یعنی چھیڑ چھاڑ بخلوت و جلوت میں زیادتیاں کرنے سے وہ باز آ جائے۔ جبکہ وہ محبوب (اپنی بدمستی و عالم جوانی میں) خود ہی ایسی باتیں فطرتًا مد نظر رکھتا ہے) (یہاں حیا سے مراد رقیب کا گستاخیاں کرنے سے رک جانا۔ اور شرما جانا۔ تو یا غیر کی گرمی اختلاط کے نہ ہونے کے سبب محبوب کا کچھ مردہ دل سا ہو جانا۔)

تیسرے معنی کھلا طور تو یہی ایک طبعی مادہ ہوا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی ان کے سامنے ان کے شوہر کا نام لے تو وہ حیا کرتی ہیں۔ مگر شرما کے کچھ نہیں کہتی۔ اسیطرح ان کو سب سے حسین کہا جائے۔ تو حیا آئیگی۔ مگر شرما کے رہ جائیں گی۔ اسی طرح کہتا ہے۔ کہ یارب وہ محبوب اس قدر شرم آلود ہے کہ اگر غیر اسے چھیڑے تو وہ غیرت بھی محسوس کرتا ہے۔ مگر پھر بھی شرما جاتا ہے یعنی شرم مخمورہ ہونے کی عادت اسے کچھ نہیں کہنے دیتی۔ اور وہ بخوشی غیر کی گستاخیاں سہ لیتا ہے۔ (یہاں حیا کے معنی غیرت لئے گئے ہیں)

(۹۳۵) لغت۔ یہ لت۔ یہ عادت پڑی ہے۔ حل۔ میرے شوق عشق کو یہ عادت پڑ گئی ہے۔ کہ وہ چاہتا ہے۔ کہ میں ہر وقت آہ و فریاد ہی کرتا رہوں۔ مگر دل (کی طاقت) یہ کہ ایک سانس لینے سے بھی گھبرا جاتا ہے۔

(۹۳۶) لغت۔ دور۔ چشم بد دور۔ اور دور چشم بد تری۔ یعنے ابتری یا بربادی کو خدا دور رکھے۔

حل۔ اس کی عیش و نشاط یا طرب کی محفل کا کیا کہنا۔ واہ واہ۔

خدا اس کو بہار دی سے دور رکھے۔ وہاں (بوجہ گانا بجانا ہونے کے اسقدر شور ہوتا ہے۔کہ) اگر میرا نالہ بھی پہنچ جائے تو اور نغمے کی آواز دل میں ملکے ایک صدائے نغمہ بن جاتا ہے۔

(۹۲۷) لغت ۔ طرز تغافل ۔ یہاں مراد محفل میں اپنا راز عشق چھپانے کو دوست سے قصداً غفلت کرنا ۔ یا اس کی طرف نہ دیکھنا ۔ کھویا جانا بیہوش و مخبوط الحواس سا ہو جانا ۔ یا حواس باختہ ہونا ۔ پا جانا ۔ بھید معلوم کر جانا ۔ حل ۔ اگرچہ محفل میں دوست سے قصداً آنکھیں چرا لینا ۔ (یعنی) طرز تغافل ہمارے عشق کے بھید کی پردہ پوشی کر سکتا ہے ۔ مگر ہمارا طرزِ تغافل کی نیت سے کھویا جانا یعنی حواس باختہ ہو جانا ۔ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ فوراً پا جاتا ہے ۔ یعنی معلوم کر لیتا ہے ۔ کہ ہم اس کے عاشق ہیں ۔

(۹۲۸) لغت ۔ نقش مدعا بیٹھنا ۔ یعنی مطلب کا یقینی حاصل ہونا ۔ دل کا بیٹھ جانا ۔ دل کا بالکل مایوس ہو جانا ۔

حل ۔ غیر اس کے وصال سے کامیاب ہو گیا ہے ۔ اور اس کی محفل کی رونق کا حال سنکر میرا دل غم کر کے اس طرح بیٹھا جا رہا ہے ۔ یعنے مایوس ہو کر رنج کر رہا ہے ۔ کہ جیسے غیر اپنے مدعا میں میرے بالکل برعکس پوری طرح کامیاب ہو گیا ہے ۔ یعنی اُس کے نقش مدعا کا سکہ بیٹھ گیا ہے ۔

(۹۲۹) رنگ کھلنا ۔ اور زیادہ خوبصورت نظر آنا ۔

حل ۔ وہ پری چہرہ محبوب غیر پر عاشق ہو کے (جب کچھ غم کرنے لگا ۔ تو وہ بلا ہو گے ۔ اور زیادہ نازک بن گیا ہے ۔ لہٰذا اب جتنا کہ رنگ (بوجہ غم محبت) اس کا اُڑتا جاتا ہے ۔ وہ اور زیادہ گورا بنتا جاتا ہے ۔

اور نازک و سبک ۔

(۹۴۰) لغت ۔ کھینچتا ہے ۔ یہاں مراد مصور نقش کھینچتا ہے ۔ اور کھینچتا ہے یعنی دور ہوتا یا غرور کرتا ہے ۔ حل ۔ نقش یعنی دوست کی تصویر کا نقش بھی مصور پر کس قدر ناز و انداز کرتا ہے ۔ کہ اس کو مصور جس قدر کھینچتا ہے ۔ یعنی صفحہ کاغذ پر بناتا ہے ۔ وہ اسی قدر اس سے کھینچتا جاتا ہے ۔ یعنی اکڑتا جاتا ہے ۔ (مراد ۔ بخوبی کھینچ نہیں سکتا ۔ کیونکہ دوست میں اتنی باتیں بھری ہیں ۔ کہ سب ایک تصویر ہی کے ذریعہ جمع نہیں کی جا سکتی)

(۹۴۱) اے اسد میرا سایہ بھی مجھ سے دھوئیں کی طرح دُور دور رہتا ہے کیونکہ مجھ میں اس قدر آگ بھری ہے ۔ یعنی آتش بجان ہوں ۔ کہ کوئی چیز میرے پاس ٹھہر ہی نہیں سکتی ۔ (سایہ کا انسان سے دور بھاگنا یہ معنی کہ گویا سایہ تک بھی مصیبت میں رفیق نہیں رہا ۔ بقول شاعر ؎

سیاہ بختی میں سایہ بھی پرے رہتا ہے انساں سے

غزل

(۹۴۲) گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

(۹۴۳) نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

(۹۴۴) کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

(۹۴۵) ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

(۹۴۲) لغت۔ نقشِ نہالی۔ قالین کا نقش۔ برد۔ سردی۔ لیالی جمع لیل
ی رات۔ برد لیالی۔ سردی کے موسم کی راتیں۔

حل۔ میرے نیچے جو قالین بچھا تھا۔ (بوجہ موسم سرما کے) اس کے نقش کو
دیکھ (کہ دوست اس پر بیٹھا کرتا تھا۔) میں گرم فریاد یا سرگرم فریاد رہا۔ اور
اس طرح گرم ہونے سے موسم سرما کی ٹھنڈی راتوں سے جو اس کے فراق میں گذیں
مجھے پناہ ملی۔ ورنہ مر جاتا۔

(۹۴۳) نسیہ۔ بھول چوک۔ یہاں مراد نسیہ عالم عقبٰے۔ یعنی اپنی عاقبت
و فراموش رکھنا۔ اور نقد عالم دنیا۔ دنیا کے موجودہ عالم یا اس کی موجودگی سے
لطف اُٹھانا۔ حل۔ میری ہمت عالی یعنی استغنا یا اعلٰی توفیق و علو مرتبہ نے
مجھے مجھ کو لے لیا۔ (گویا یہ گوارا نہ کیا کہ مجھے کوئی اور لے جائے۔ جیسے یہاں
نسیہ و نقد دو عالم مجھے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ مگر عالی ہمتی یا استغنا نے مجھ کو اُنکی
طرف جانے نہ دیا۔) کیونکہ نسیہ یعنی نسیہٗ عالم عقبٰے کی حقیقت یہ ہے کہ عشاق
اس کی پرواہ ہی نہیں رکھتے۔ کہ وہاں کیا ہوگا۔ گویا یہ ان کے لئے ایک عالم معلوم
مراد عالم معدوم ہے۔ اسی طرح نسیہ عالم دنیا بھی معلوم ہے۔ کہ یہ آخر نیست
و نابود ہونے والی ہے۔ تو انسان کی عالی ہمتی اسی میں ہے۔ کہ ان دونوں عالموں سے
بالاتر و مستغنی رہے۔ اور ایسا رتبہ مجھے حاصل ہے۔

(۹۴۴) لغت۔ کثرت۔ یہاں کثرت اشیا مراد ہے۔ وحدت۔ توحید۔
کثرت آرائی۔ وحدت۔ توحید کو کثرت اشیا سے آراستہ و پیراستہ کرنا۔ یعنی

یہ خیال کرنا کہ ہمہ اوست۔ سب چیزیں ہی خدا ہیں۔ اور اس طرح کثرت سے
وحدت کا مسئلہ مصنوع کرنا۔ پرستاری وہم۔ خیالی اشیا کی پرستش۔ صنام
خیالی۔ خیالی اور فرضی بت۔ یا فرضی خدا۔

حل۔ کثرت آرائی وحدت یعنی ہمہ اوست کے خیال سے سب اشیاء
کی نسبت خیال کرنا۔ کہ یہی خدا ہیں۔ یہ محض وہم کی پرستش ہے۔ (کیونکہ ہر چیز
خدا نہیں ہے) انہی خیالی بتوں یعنی فرضی خداؤں نے مجھ کو کافر بنا دیا ہے۔
(جیسے کہ منصور کثرت وحدت کے سبب اپنے آپ ہی کو خدا بتانے لگا۔ تو وہ کافر
قرار دے کے قتل کیا گیا۔ یا ہندو بت پرستی کو نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ وہ خیال
کرتے ہیں کہ یہ بت بھی خدا ہی کا مظہر ہیں)

(۹۴۵) بے پر و بالی۔ نہ پر ہونا نہ اُڑ سکنے کی طاقت ہونا۔

حل۔ مجھ کو اس بے پر و بالی نے عجب طرح کا آرام پہنچایا ہے۔ کہ
پھول کی خواہش میرے تصور تک میں بھی باقی نہ رہی۔ یعنی اب خیال ہی نہیں
آتا۔ کہ باغ کہاں ہے اور پھول کیا چیز ہے۔ بس ایک ہی جگہ پر لوٹے ہوئے
آرام سے پڑا رہتا ہوں۔

غزل

(۹۴۶) کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

(۹۴۷) غنچہ شگفتنہائے برق عافیت معلوم
باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے

(۹۴۸) ہم سے رنج بے تابی کس طرح اُٹھایا جائے
داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

(۹۴۶) کارگاہ ہستی ۔ کارخانۂ دنیا ۔ لالہ ۔ پوست کا پھول ۔ جس کے پتوں کے بیچ میں ہمیشہ ایک سیاہ داغ ہوا کرتا ہے ۔ داغ ساماں ۔ یعنی اس کا سازوساماں یا ساری جائیداد گویا ایک سیاہ داغ ہے ۔ برق خرمن ۔ وہ بجلی جو کھلیان پر گرے ۔ خون گرم ۔ یہاں مراد کھیتی باڑی کرنے سے جو کسان کا خون گرم ہو جاتا ہے ۔ یعنی اس کی محنت اور رنج ۔

نوٹ ۔ جو تین اشعار اس غزل کے ہیں ۔ ان کی شرح میں مصنف نے خود عود ہندی میں درج کی ہیں ۔ مگر مبتدی ان کو سمجھ نہیں سکتا ۔ لہٰذا ہم صاف الفاظ میں خالصتاً اس کا مفہوم یہاں درج کرتے ہیں ۔

حل ۔ داغ ساماں ۔ وہ شخص جس کا سارا سازوسامان صرف ایک داغ دل ہو ۔ جیسے گل لالہ (پوست کے پھول) میں ایک بڑا سا سیاہ داغ ہوا کرتا ہے جو کہ لالہ کا سازوسامان ہے ۔ اسی طرح دہقان کھیتی باڑی کرتا ہے ۔ تو اس کا خون گویا گرم ہو جاتا ہے ۔ تو ایسی محنت سے وہ ایک کھیت کی فصل تیار کرتا ہے ۔ جو اس کا سارا سازوسامان ہوتا ہے ۔ لیکن یہاں اس کھیت سے مراد پوست کے پودے کی کھیتی ہے ۔ اب پوست جو کسان کا سارا سامان راحت ہے ۔ اس میں گل لالہ اُگتا ہے ۔ اور اس گل لالہ میں ایک سیاہ داغ اس کا سارا سامان ہستی ہوتا ہے ۔ تو یہ گویا اس کسان ہی کے خرمن راحت پر ایک بجلی سی گری ہے ۔ جو گل لالہ میں ایک سیاہ داغ نمودار ہوا ہے ۔ حاصل شعر یہ کہ انسان کی محنت ہی اس کے رنج و غم کا باعث بنتی ہے ۔ گویا سے

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

(۹۴۷) معلوم ۔ کئی اشعار میں بمعنی معدوم مستعمل ہوا کرتا ہے ۔ جیسے سے
قسمت میں لکھی ہے خاک سو نا معلوم

یعنی جب قسمت میں مٹی لکھی ہے ۔ تو سونا کہاں یعنی وہ نہیں مل سکتا ۔ ناشگفتنہا ۔ کھلنے کے وقت تک ۔ برگ عافیت ۔ اطمینان کا سازوسامان بخواب گل ۔ یعنی جب تک پھول غنچہ رہے ۔ اور کھل کر پھول نہیں بن جاتا ۔

حل ۔ پھول کی کلی جب تک کھل کر پھول نہ بنے ۔ اس کا دل گویا مرجھایا رہتا ہے ۔ اور اس کے لئے اطمینان کا سازوسامان معدوم ہوتا ہے ۔ (لیکن اس کے برعکس پھول کی یہ کیفیت کہ پھول باوجود یکہ ۔ یعنی جب تک پھول بصورت غنچہ ہوتا ہے ۔ گویا اس کا دل بحالت جمع ہے ۔ یعنی اس کی پنکھڑیاں مجتمع ہیں ۔ اور وہ پریشان خاطر نہیں ہے ۔ مگر یہ حالت تا کجا ۔ آخر وہ غنچہ کی صورت قائم نہیں رہتی ۔ اور اس کی پنکھڑیاں ادھر ادھر گر کے پھول کا خواب (جو بحالت غنچہ ہونے کے شاخ گل پر اسے بوجہ ایک جگہ قیام و سکون کے حاصل تھا ۔) اب پریشان ہو جاتا ہے ۔ مراد یہ کہ انسان کو دنیا میں اگر سامان راحت بھی حاصل ہو ۔ تو بعد چندے یہی راحت زحمت بن جاتی ہے ۔

(۹۴۸) رنج بیتابی ۔ دل کی بیقراری کا دکھ ۔ داغ ۔ دل کا داغ ۔ جو بوجہ غم عشق کرنے کے دل کی سوزش سے نمودار ہوا ۔ پشت دست عجز ۔ فارسی محاورہ ہے ۔ بمعنی عاجز آ جانا ۔ شعلہ ۔ یہاں مراد سوزش داغ سے جو شعلہ برآمد ہوا تھا ۔ خس بدنداں ۔ ایک اور فارسی محاورہ ہے ۔ جس کا مفہوم عاجز آنا ہے ۔ حل ۔ ہم سے اپنی بیقراری کا دکھ کیونکر اٹھایا جائے ۔ جبکہ اس

بیقراری عشق سے جو داغ دل پہ پڑا ہے۔ وہ عاجز آگیا ہے۔ (رونق بیتابی سے) اور اس داغ کا شعلہ بھی خس بدنداں ہے۔ یعنی مثل داغ عاجز ہے۔ اور بیتابی کی برداشت نہیں کر سکتا۔

(۹۴۹) اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

(۹۴۹) اے غالب ہم اپنا گھر اجاڑ کے اور دیوانہ بن کے جنگل میں موجود ہیں۔ اُدھر سبزہ ہمارے اُجڑے گھر کی در و دیوار سے اُگ رہا ہے۔ آہ ہم تو بیابان میں پھر رہے ہیں۔ اور ہمارے گھر میں گویا اب بہار آئی ہے۔ مراد یہ کہ گھر بھی اب جنگل کا نمونہ ہے۔ وہیں چلے جانا بہتر ہوگا۔

غزل

ساد گی پر اُس کے مر جانے کی حسرت دل میں ہے (۹۵۰)
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
(۹۵۱) دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ (۹۵۲)
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
(۹۵۳) بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

(۹۵۴) رنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتش دوزخ ہمارا دل سہی (۹۵۵)
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے
(۹۵۶) ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسم پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

(۹۵۰) میں اس کو زیورات وغیرہ ساز و سامان سے خالی سادہ لباس میں دیکھنے کی حسرت میں مرا جاتا ہوں۔ اور میرا بس نہیں چلتا۔ کہ اس کے ایسے سامان اتار ڈالوں۔ کیونکہ اس قاتل کے ہاتھ میں پھر خنجر موجود ہے۔

(۹۵۱) اس کی تقریر کی لذت دیکھنا۔ کہ اس نے جو بات کی۔ میں نے سنکر یہی جانا۔ کہ اُس نے تو گویا میرے دل ہی کی بات کہدی ہے (بات چیت یا لیکچر یا گفتگو کرنے کا کمال یہی ہے۔ کہ جو کچھ کہیں وہ ایسا ہو کہ گویا سب کے دل اسی بات کے سننے کے متوقع تھے۔)

(۹۵۲) اگرچہ وہ میرا ذکر اپنی محفل میں بہت برائیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن غنیمت ہے۔ کہ گو میں ان کی محفل میں نہیں ہوں۔ مگر ذکر تو وہاں کیا جاتا ہے۔ لہذا میرا ذکر۔ میری ذات سے بہتر ہے۔ کہ وہ وہاں ہے۔ اور میں نہیں ہوں۔

(۹۵۳) اے نا امیدی تو ہم پر اتنا ہجوم نہ کر۔ کیونکہ ہم بے فائدہ کوشش کے عادی ہوگئے ہیں۔ اور ہم کو اسی سے لذت آتی ہے۔ ایسا نہ ہو یہ خاک میں مل جائے۔

(۹۵۴) لغت - واماندگی - تھکاوٹ - منزل - نازل ہونے یعنی ٹھہر جانے کی جگہ - حل - ہم راستہ طے کرنے کی تکلیف کیوں اُٹھائیں - جبکہ تھکاوٹ کو ہم سے گویا عشق ہے - کہ جہاں کہیں ہمارا قدم چلتے چلتے ٹھہر جائے یعنی اس مقام کو اپنی منزل بناتے ہیں - تو ہم بھی وہیں قیام کر لیتے ہیں - قدم آگے نہیں اُٹھاتے -

(۹۵۵) لغت - آب و گل - پانی اور مٹی یعنی انسان کی نسبت مشہور ہے کہ یہ مٹی اور پانی سے بنایا گیا ہے - تو آب و گل گویا انسان کی سرشت ہے -
حل - دوست کو کہتا ہے - آپ کے کہنے کے مطابق - اچھا ہمارا دل دوزخ کی آگ کی جلوہ زار (نمائش گاہ) سہی - تو یہ فتنہ قیامت کس کی سرشت یا خمیر میں داخل ہے - یعنی میں عاشق ہوں تو خیر آتش بجاں سہی - مگر تم تو محبوب ہو - پھر کیوں سراپا فتنہ ہو گئے -

(۹۵۶) لغت - شوریدہ - جنونی - طلسم - جادو - یہاں مراد گورکھ دھندے ایسا - حل - غالب کا جنونی دل غم و فکر کا ایک گورکھ دھندا ایسا بن گیا ہے - اے دوست تو اپنی تمنا پر رحم کر - کہ یہ غالب کے جنونی دل میں پھنس کر کس مشکل میں پڑ گئی ہے - (مراد یہ کہ غالب کی تمنائے دل کو پورا کر -)

غزل

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی (۹۵۷)
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

(۹۵۸) شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق
تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں (۹۵۹)
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

(۹۶۰) اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا (۹۶۱)
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

(۹۶۲) ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوہ اہل نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا (۹۶۳)
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

(۹۶۴) فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

مارا زمانہ نے اسداللہ خاں تمہیں (۹۶۵)
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

---

(۹۵۷) تیری نگاہ (تیر کی طرح) دل سے جگر تک پہنچ گئی - اور دل و جگر دونوں کو ایسی ایک ادائے تازہ سے خوش کر گئی - (نگاہ کی تعریف نگاہ دلدوز ہوا کرتی ہے - اب وہ نگاہ جگر دوز بھی ہو گئی)
(۹۵۸) درد فراق کی لذت کیسی اچھی ہے - کہ جب جب اس کو عشق کا آغاز ہوا تھا چھپایا کرتا تھا - یعنی میرا زخم جگر پردے میں تھا - (کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو -) مگر اب میرا عشق سب پر کھل گیا - تو میرا سینہ بھی گویا شق

ہوگیا ہے۔ اور وہ اخفائے راز عشق یا زخم جگر چھپانے کی خلش ہی مٹ گئی۔

(۹۵۹) لغت۔ بادہ شبانہ۔ رات کو شراب پی کر تمام رات بدمست رہنا۔ لذتِ خواب سحر۔ یعنی رات بھر شراب سے جاگتے رہنا۔ اور صبح کو بےخبر سونے کی لذت۔

حل۔ غالب پورے خوار تھا۔ پہلے ہاتھ کھلا تھا۔ خوب پیتا رہا۔ پھر ہاتھ تنگ ہوا تو اسے کچھ عرصہ ترک سے کرنا پڑا۔ یہی مضمون نظم کر دیا ہے۔ کہتا ہے۔ وہ رات بھر شراب پی کے جاگنا اور بدمستیاں کرنا جاتا رہا۔ اب اُٹھئے یعنی ہوشیار ہو جائیے۔ مراد شراب کو ترک کرو۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ رات تو شراب پی کے جاگتے۔ اور پھر تھک کر صبح ہوتے ایسے لیٹے کہ سب خمار اتر کے مزہ آگیا۔ اب روپیہ پیسہ کہاں۔ وہ شراب خواری ہو نہیں سکتی۔

(۹۶۰) مجھے زندگی میں خواہش رہتی تھی۔ کہ کسی طرح اُڑ کے کوچہ یار میں پہنچوں۔ مگر وہ شوق پورا نہ ہو سکا۔ اب مر کے مٹی میری اڑنے لگی۔ تو بارے اسے ہوا۔ تیری بدولت میری خاک کوئے یار میں پہنچی۔ تو وہ بال و پر کی ہوس کہ اڑ کے دوست کے کوچے میں پہنچوں۔ اس طرح مٹ گئی۔

(۹۶۱) لغت۔ گل کترنا۔ کوئی عجیب کام کرنا۔ یا فساد کھڑا کرنا۔

حل۔ دوست کے نقش پا کے انداز (ظاہری وضع) کی دلفریبی پر غور کرو۔ کہ یہ اب ہم کو اتنا فریفتہ کئے ہوئے ہے۔ کہ ہم اسی پر جھکے جھکے بس دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ دوست کی مستانہ چال (موج خرام بھی) کیا فساد انگیزی کا کام کر گئی۔

(۹۷۲) لغت۔ بوالہوس شعرا ایسے عشاق مراد لیا کرتے ہیں کہ جو محض لذت نفسانی کی خاطر کسی کے عاشق ہوں۔ وہ خود دل عشق ان کو نہیں ہوا کرتا۔

حل۔ اب ہر بوالہوس نے حسن پرستی (عشق) اپنا شعار (شیوہ یا دستور) بنا لیا ہے۔ تو اب اہل نظر (سچے حسن پرستوں یا عشاق صادق) کے اس شیوہ یعنی دستور عشق کی قدر جاتی رہی۔ (کوئی تمیز باقی نہیں رہی کہ کون سچا عاشق ہے کون جھوٹا)

(۹۷۳) اس شعر کا اصلی مدعا تو یہ ہے کہ دوست کو دیکھکر ہم اتنے موثر ہوئے کہ گویا ہوش بکھر گئے۔ اور اس کے حسن صورت کو دیکھ کے ہکا بکا رہ گئے۔

حل۔ ہماری نظر رخ یار تک جب پہنچی۔ تو یہ اتنی بدمست ہو گئی کہ اسے اپنا ہوش نہ رہا۔ اور اس کے رُخ پر بکھر گئی۔ گویا وہاں ایک نقاب اپنی نظروں کے تاروں سے بن گیا۔ اور ہم دوست کو زیادہ دیکھ نہ سکے۔

(۹۷۴) لغت۔ فردا و دی کا تفرقہ مٹ گیا۔ یعنی بوجہ بے خودی و بے خبری یہ ہوش ہی نہیں۔ کہ آج اور کل میں تمیز کیا ہوتی ہے۔ جیسے روز قیامت میں آج اور کل یا ماضی و مستقبل کا کوئی جھگڑا نہیں ہوگا۔

حل۔ کل تم ہم سے جدا ہو کے گیا گئے۔ ہمارے لئے سچ مچ قیامت آگئی۔ اور جیسے قیامت کا دستور ہے۔ آج اور کل کا جھگڑا ہی مٹ گیا۔ یعنی عالم بےہوشی میں آج اور کل تک کی بھی خبر نہ رہی۔

(۹۷۵) اے اسد۔ زمانہ نے اب تمھیں مار ڈالا۔ یعنی جوانی کا زمانہ گزر گیا۔ تو تمھاری حالت کچھ اور ہی ہو گئی۔ آہ وہ جوانی کے ولولے۔ اور خود وہ جوانی کہاں گئی۔

غزل

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے (۹۷۶)
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

(۹۷۷) اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں ترا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم (۹۷۸)
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

(۹۷۹) تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا (۹۸۰)
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

(۹۸۱) لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا (۹۸۲)
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

---

(۹۷۶) تسکین - تسلی یا پورا پورا اطمینان - ذوقِ نظر - وہ شخص کہ جس کو دیکھکر دل کو خوشی حاصل ہو -

حل - اگر بہشت کی حوروں میں تیری صورت کی کوئی حور مل جائے تو غنیمت سمجھیں گے - کہ ذوقِ نظر یعنی نظارہ کی خوشی تو حاصل ہوگی - لیکن

ویسے تو وہاں خالی دیکھنے کو ملیں گی - اس سے دل کی تسکین تو نہ ہوگی - خیر اس کا ہم کچھ غم نہ کریں گے - مگر کم از کم تیری شکل و صورت کی کوئی حور تو وہاں ہمیں ضرور ملنی چاہیئے -

(۹۷۷) غالب یہ چاہتا ہے کہ مر جاؤں تو میرے بعد بھی میرے محبوب کی طرف کوئی نظر اٹھا کر نہ دیکھے - اس لئے کہتا ہے کہ مجھ کو قتل کرکے اپنی ہی گلی میں دفن نہ کر - تاکہ میری قبر جو تیری گلی میں ہوگی تو اس کا پتہ پوچھتے پوچھتے لوگ وہاں آجائیں گے - اور پھر تیرا گھر بھی اُن کو معلوم ہو جائیگا - تو تجھے دیکھ پائیں گے - لیکن میرا رشک اس بات کو قبول نہیں کرتا -

(۹۷۸) لغت - ساقی گری - شراب پلانے پر مقرر کرنا - شرم کرو یہاں مراد ہمارا لحاظ کرو - آج تم شراب پلانے کو ساقی مقرر کئے گئے ہو - کچھ تو ہمارا لحاظ کرو - اور شراب سے خوب چھکا دو - ورنہ جتنی شراب ہمیں گھر میں میسر آتی ہے وہ تو ہر رات پیا ہی کرتے ہیں - پھر تمہارا احسان کیا -

(۹۷۹) حل - اے ندیم (یہاں مراد ہمدم) تجھ سے تو کچھ کلام نہیں - یعنی تیری کوئی شکایت نہیں ہے - لیکن یہ شکایت اپنے نامہ بر کی ہے - کہ وہ جہاں کہیں تجھے ملے تو اسے میرا سلام کہدینا - جس کا مطلب یہ کہ اُسے یاد دلا دینا - کہ واہ ہمارے خط کا اچھا جواب لائے - کہ خط تو خط خود بھی واپس نہیں آئے -

(۹۸۰) لغت - کشاکش - کبھی ادھر کھینچنا کبھی اُدھر - غمِ پنہاں یہاں مراد - ابھی ہمارا غمِ عشق چھپا چھپایا ہے - مجنوں کے عشق کی طرح ظاہر و رسوا نہیں ہوا -

حل - اگر ہمیں اپنے پوشیدہ عشق کی کھینچا تانی سے (جو ہمیں رسوا

ہونے سے ابھی مانع آتا ہے۔) ذرا فرصت ملے۔ تو دکھا دیں۔ کہ ہم جو کچھ کرینگے وہی مجنوں نے کیا تھا۔

(۹۷۱) اگر خواجہ خضر بطور بزرگ ہمیں ایک ساتھ سفر کرنے کو مل جائیں، تو یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ ہم سکندر کی طرح اس کی پیروی کریں۔ کیونکہ ہماری راہ (راہِ عشق) اور ہے۔ خضر کی اور۔ وہ ہماری راہ نمائی نہیں کر سکتا۔

(۹۷۲) اے لوگو جو اپنے معشوق کے کوچے میں رہتے ہو۔ جو کہ غالب کا دلدار ہے۔ ذرا دیکھتے رہنا۔ کہ اگر غالب پریشان حال ادھر آ نکلے۔ تو اس کو کوئے دلدار میں بٹھانا۔ اور اس کی دلداری یا اُسکے ساتھ کچھ ہمدردی ضرور کرنا۔ (مثلاً اُسے محبوب سے ملوا دینا)

غزل

کوئی دن گر زندگانی اور ہے (۹۷۳)
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
(۹۷۴) آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں (۹۷۵)
پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے
(۹۷۶) دیکھے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم (۹۷۷)
وہ بلائے آسمانی اور ہے
(۹۷۸) ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(۹۷۳) اس کے دو معنی ہیں۔ کہ اگر کچھ دنوں ہم اسی تکلیف سے جیتے رہے۔ تو ہم یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ اب اپنی زندگانی کا خود ہی خاتمہ کر دیں گے۔

دوسرے معنی۔ اگر ہمیں تھوڑے دنوں اور جینے کا موقع مل گیا۔ تو ہم نے یہ جی میں ٹھان رکھی ہے۔ کہ پھر ہم اس طرح رسوائے عشق ہو کے نہیں جئیں گے۔ ضرور اپنے وطیرے کو بدل دیں گے۔ گویا کچھ اور طرح کے حالات سے زندگی بسر کریں گے۔ (مثلاً ترکِ عشق و محبت کرنا وغیرہ وغیرہ)

(۹۷۴) غمِ نہانی سے مراد عشق کا روگ۔ جو چپکے اندر ہی اندر جان کھا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ عشق کے اندرونی غموں کی جلن کچھ اور چیز ہے۔ بھلا دوزخ کی آگ میں ایسی تیزی اور دل پر اثر کرنے والی تپش ہی کہاں ہے۔

(۹۷۵) اُن کی رنجشیں اپنے ساتھ ہم نے صدہا بار دیکھی ہیں، اب پھر کچھ ایسی ہی صورت ہے۔ لیکن اس دفعہ ان کی خفگی معمول سے کچھ زیادہ ہے۔

(۹۷۶) ہمارا نامہ بر دوست کو خط دے کے پھر اُن کا منہ

تا ہے۔ کیونکہ کچھ پیغام وہ اور بھی اُسے زبانی سُننا یا چاہتا ہے۔ (جو
راس قدر پرائیویٹ ہے۔ کہ خط میں لکھنا نازیبا تھا۔ یا خط کے لکھنے
کے بعد یاد آیا تھا)

(۹۷۷) لغت - اعمار۔ جمع عمر۔ عمریں۔ نجوم۔ ستارے۔ جن کے
رات نکلنے اور غروب ہونے سے عمروں کا گذرنا محسوب کیا جاتا ہے۔
وہ قاطع عمار ہیں۔ بلائے آسمانی۔ کوئی ناگہانی مصیبت۔ جیسے کہ دوست
اس کو اتفاقیہ دیکھ لیا۔ تو عاشق ہو کے مصیبت میں پھنس گئے۔

حل۔ ستارے تو اکثر ہماری عمریں ہی کم کرتے ہیں۔ کچھ اور صدمہ
ہیں پہنچاتے۔ مگر وہ "یار" ایک ایسی ناشدنی اور مضرت رساں بلا ہے کہ ان
ستاروں کی آفتوں سے کچھ جداگانہ آفت خیز ہے۔

(۹۷۸) غالب اب زندگی قریب الاختتام ہے۔ اس کی سب مصیبتیں اُٹھا
چکا ہوں۔ صرف ایک مرنا باقی ہے جو ناگہانی ہے۔ یعنی کسی وقت مر بھی جاؤ نگا اور
تکلیف بھی گذر جائیگی۔

غزل

(۹۷۹) کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

(۹۸۰) موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

(۹۸۱) آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

(۹۸۲) جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

(۹۸۳) ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

(۹۸۴) کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

(۹۸۵) داغ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

(۹۸۶) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

(۹۸۷) مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

(۹۸۸) کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

---

(۹۷۹) کوئی امید پوری نہیں ہوتی۔ اور کار برآری کی کوئی
صورت ہی نظر نہیں آتی۔

(۹۸۰) موت کا تو ایک خاص دن مقرر ہے۔ کہ جب ایک مرتبہ
آجائے۔ تو پھر نہیں آیا کرتی۔ لہذا نیند کا بھی یہی حساب ہو گیا ہے۔
کہ پہلے آتی تھی۔ اور اب رات رات بھر کے لئے مطلق آتی ہی نہیں۔ گویا
نیند تو موت کی صورت نہیں ہونی چاہئے۔

(۹۸۱) پہلے تو مجھے دل کے حال پر ہنسی آیا کرتی تھی۔ کہ یہ احمق مجھے چھوڑ کر کس بیوفا محبوب سے جا ملا ہے۔ جو اس کو منہ بھی نہیں لگاتا۔ تاہم اب غم کی بات ہو یا خوشی کی۔ مطلق ہنسی ہی نہیں آتی۔ یعنی اب میں اسقدر افسردہ خاطر ہو گیا ہوں۔ کہ کچھ لذت زندگی باقی نہیں رہی۔ تو ہنسنا کس کا۔ ہر وقت مایوسی۔ اور مایوسی سے چپ اور بیکسی طاری رہتی ہے۔

(۹۸۲) واعظ سے کہتا ہے۔ کہ میں پرہیزگاری اور عبادت کا ثواب تو جانتا ہوں۔ کہ کس قدر ہے۔ پر کیا کروں۔ ایسی باتوں کی طرف میری طبیعت ہی راغب نہیں ہوتی۔

(۹۸۳) کچھ ایسی ہی بات ہے۔ یعنی امر مجبوری ہے۔ کہ میں چپ چاپ بیٹھا رہتا ہوں۔ ورنہ کونسی بات ہے جو میں کر نہیں سکتا۔ (غالباً رقیب کی موجودگی میں خاموش رہنا ہی مصلحت ہے۔)

(۹۸۴) لغت۔ چیخوں کے معنی شکوہ کرنا بھی ہے۔ اور چیخنا چلانا بھی۔ یہاں دونوں معنی لئے جا سکتے ہیں۔

حل۔ میں کیوں نہ چیخوں۔ کہ میری (آہ و فریاد کی) آواز اُن کو کسی وقت نہیں پہنچتی۔ تو وہ یاد کرتے ہیں۔ کہ میری آواز کیوں نہیں آتی۔ (گویا مجھ کو ناحق ستانا منظور ہے۔)

(۹۸۵) اے چارہ گر (یہاں مراد جراح) اگر تجھ کو میرے دل کا داغ (جو بوجہ تپش دل مثل کباب جل رہا ہے۔) دکھائی نہیں دیتا۔ تو اس کے جلنے کی بھی بو نہیں آتی۔ مراد یہ کہ اے جراح اگر تو کچھ غور کرے۔ تو میرے زخم دل سے سخت بدبو آنے لگی ہے۔ اور یہ علاج کی حد سے باہر ہو گیا ہے۔ یا اے جراح زخم دل اس قدر بڑھ گیا۔ اور تو پہچان ہی نہیں سکتا۔ قصداً یا سہواً۔

(۹۸۶) ہم وہاں ہیں۔ جہاں سے ہم کو بھی اپنی کچھ خبر نہیں آتی۔ یعنی ایک خود فراموشی و بے خودی کے عالم میں بالکل بے خبر پڑے ہوئے ہیں۔

(۹۸۷) ہم تو اسی امید میں مر رہے ہیں۔ یعنی بہت آرزو کرتے ہیں۔ کہ کسی طرح مر جائیں۔ مگر موت آ کے پھر جاتی ہے۔ یعنی مرتے نہیں۔ اور ہماری تمنا پوری نہیں ہوتی۔ (مراد غایت درجہ کی مایوس حالت ہے۔)

(۹۸۸) اے غالب اب تم کعبہ یعنی خانہ خدا میں کس منہ کے ساتھ جاؤ گے کیا تم کو شرم نہیں آتی۔ (یعنی تمام عمر تو رندی و میخواری کرتے رہے۔ اور اب حج کو جانے لگے ہو)

غزل

(۹۸۹) دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(۹۹۰) ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

(۹۹۱) میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

(۹۹۲) جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

(۹۹۳) یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

(۹۹۴) شکنِ زلفِ عنبری کیوں ہے
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں (۹۹۵)
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

(۹۹۶) ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا (۹۹۷)
اور درویش کی صدا کیا ہے

(۹۹۸) جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ (۹۹۹)
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

---

(۹۸۹) اے نادان (احمق) دل تجھے کیا ہو گیا ہے۔ آخر اس درد بارو گ کی کچھ دوا بھی ہے۔ یا کہ نہیں۔ تاکہ کوئی چارہ کرے۔

(۹۹۰) ہم دوست کے خواہشمند ہیں۔ اور وہ ہم سے بیزار ہو رہا ہے۔ یا الٰہی یہ بات کیا ہے۔ کیا کسی نے اس کو کچھ بہکا تو نہیں دیا ہے جب ہم اس کے خواہاں ہیں۔ تو وہ بھی خواہاں ہوں۔ اُلٹا بیزار کیوں ہو رہا ہے۔

(۹۹۱) میں بھی طاقت گویائی رکھتا ہوں۔ یعنی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ اے کاش تم مجھ سے پوچھو کہ میری تمنا آپ سے کیا ہے۔

کیا میں گونگا ہوں کہ میرے ساتھ گفتگو نہیں کرتے۔ اور میری بات نہیں پوچھتے۔

قطعہ بند

(۹۹۲) جبکہ تیرے بغیر یہاں کوئی موجود ہی نہیں۔ (یعنی یہ سب خدا ہی کا ظہور ہو رہا ہے۔ تو پھر اے خدائے برتر یہ ہنگامہ یعنی دنیا کی (ہجوم) دھام کیا چیز ہے۔)

(۹۹۳) مثلاً پریوں کے چہرہ والے لوگ کیسے ہیں۔ (یعنی کہاں سے آگئے) اور ان کا اشارہ و کنایہ اور ناز و انداز کیا چیز ہے۔

(۹۹۴) یہ ان پری چہرہ لوگوں کی خوشبودار زلفوں میں شکن کیوں ہے یعنی کانوں کے قریب ان کے سر کے بال مڑے ہوئے کیوں ہیں۔) اور اُن کی وہ سرمہ آلودہ نگہ (جو گویا تیر نظر چلاتی ہے۔) کیا چیز ہے۔

(۹۹۵) یہ سبزہ اور پھول کہاں سے آئے ہیں۔ بادل کیا اور ہوا کیا چیز ہے۔ (ان سب اشعار میں اشارہ یہ ہے۔ کہ یہاں سب خدا ہی کی قدرت کا ظہور ہے۔ اور قدرت وہی خدا ہے) تو پھر ماسوائے خدا کوئی چیز یہاں موجود نہیں ہے۔

(۹۹۶) ہم کو ایسے دوست سے وفا کی امید لگ رہی ہے۔ جو کہ خود ہی نہیں جانتا کہ وفا کیا چیز ہے۔ یعنی وہ اسقدر بیگانہ وفا ہے۔

(۹۹۷) ہاں بھلا کر خدا تیرا بھی بھلا کریگا۔ اس کے سوا فقیر کی صدا یا دعا اور کیا ہوگی (یہ الفاظ معشوق کو مخاطب کر کے منجانب عاشق گویا فقیرانہ لہجہ میں کہے گئے ہیں) تاکہ معشوق نظر توجہ کرے۔

(۹۹۸) دوست کی طرف تخاطب کر کے (اظہار خلوص کی نیت

سے کہتا ہے۔ کہ میں اپنی جان تک تم پر قربان کرتا ہوں۔ دعا کیا چیز ہے۔ جو کہ تمہارے حق میں کی جائے۔ یہ میں نہیں جانتا۔ میں تو جان دینا جانتا ہوں۔

(۹۹۹) میں نے مانا کہ غالب کی کچھ قدر و قیمت نہیں ہے۔ لیکن آخر انسان ہے۔ وہ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے (اپنا غلام بنالو)

(۱۰۰۰) کمال حسن اگر موقوف انداز تغافل ہو
تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

(۱۰۰۰) اگر حسن کی خوبی کمال اس بات پر منحصر رکھی جائے کہ محبوب کے انداز تغافل (بے پرواہی اور بے نیازی کے رنگ ڈھنگ) سے حد درجہ استغنا اور بے تعلقی پائی جاتی ہو۔ (جیسا کہ معشوقوں کا خاصہ ہے) تو پھر بلا تامل کہہ سکتے ہیں۔ کہ تجھ سے تیری تصویر بدرجہا بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں بے نیازی اور بے تعلقی کا وصف تا بہ کمال پایا جاتا ہے۔ (ظاہر ہے کہ تصویر کو کسی سے کوئی واسطہ یا تعلق ہو ہی کیا سکتا ہے۔

عقدہائے معانی (شرح اردو دیوان غالب)
جلد اول ختم ہوئی

(مطبوعہ انقلاب سٹیم پریس بیرون موری دروازہ لاہور)